اردو شرح

انوار الباری

صحیح البخاری

مجموعۂ افادات

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

و دیگر اکابر محدثین رحمہم اللہ تعالیٰ

مؤلفہ تلمیذ علامہ کشمیری

حضرۃ مولانا سید احمد رضا صاحب بجنوری رحمہ اللہ

ادارہ تالیفات اشرفیہ چوک فوارہ ملتان پاکستان
(061-4540513-4519240

بسم الله الرحمن الرحيم

اللهم

صل على محمد وعلى آل محمد

كما صليت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

اللهم

بارك على محمد وعلى آل محمد

كما باركت على ابراهيم وعلى آل ابراهيم

انك حميد مجيد

كتبه الفقير نفيس الحسيني اللاهوري غفر الله ذنوبه وستر عيوبه في رمضان المبارك سنة ١٤١٢ھ

بسم الله الرحمن الرحيم

انوار الباری

⑯

اردو شرح

صحیح البخاری

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وبعد الحمد والصلوٰۃ گذارش ہے کہ انوارالباری کی مسلسل ۱۳ قسطیں شائع ہونے کے بعد ایک طویل فترت پیش آئی تھی، پھر خدا کا شکر ہے اس کی نشأۃِ ثانیہ کی صورت پیدا ہوئی اور اب یہ سولھویں قسط پیش کی جارہی ہے، قسط نمبر ۱۷ کی بھی کتابت شروع ہو چکی ہے اور توفیقِ خداوندی سے یہ امر بھی مستبعد نہیں کہ یہ سلسلہ اتمام تک پہنچے۔ وبیدہ تتم الصالحات قسط نمبر ۱۳ میں زیارتِ نبویہ اور توسلِ نبوی کی اہم ابحاث پیش ہوئی تھیں۔ قسط نمبر ۱۴ میں متفرق اہم علمی وحدیثی مباحث گذرے، قسط نمبر ۱۵ میں علاوہ دوسرے مسائل کے "رفع یدین" کی بحث مفصل دلائل کے ساتھ آئی ہے، اس قسط نمبر ۱۶ میں "فاتحہ خلف الامام" کی بحث کو بھی حتی الوسع مکمل کر دیا گیا ہے۔

عاجز کی دھیمی رفتار کے جہاں دوسرے اسباب وعوارض تھے، ایک یہ بھی تھا کہ عاجز نے ہی اپنے ادارتِ "مجلس علمی" ڈابھیل کے زمانہ میں رفیقِ محترم مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کو ڈابھیل بلا کر "معارف السنن" کا کام سپرد کیا تھا، اور پوری توقع تھی کہ وہ اس خدمت کو باحسنِ وجوہ آخر تک مکمل فرمادیں گے، اور ان کو اس کے لئے کافی مدت بھی میسر ہوئی، مگر افسوس کہ پاکستان منتقل ہونے کے بعد وہ دوسرے اہم علمی ودینی مشاغل میں ایسے منہمک ہوئے کہ یہ کام بہت تھوڑا کر سکے، کیونکہ چھٹی جلد کا بھی کافی حصہ وہ ڈابھیل میں لکھ چکے تھے، پھر اس کی تکمیل پاکستان میں کی ہے اور یہی جلد آخری ہوگئی۔ یہ بھی اندازہ ہوا کہ وہ بہت سے اہم مباحث پر نظر ثانی بھی نہیں کر سکے۔

مولانا بنوریؒ نے خود فرمایا کہ میں نے حضرت علامہ کشمیریؒ سے دورۂ حدیث کے سال ترمذی باب **مس الذکر** تک اور بخاری باب **حسب الانصار من الایمان** تک پڑھی تھی، پھر حضرت شاہ صاحب علیل ہو کر دیوبند تشریف لے گئے، اور ترمذی و بخاری کا درس حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ و مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے پورا کرایا تھا اور اسی لئے وہ اپنے کو حضرت شاہ صاحبؒ سے اقل استفادۃ بھی فرمایا کرتے تھے، مگر یہ اقلیت باعتبار درس کے تھی، یوں ان کو حضرت شاہ صاحبؒ کے علومِ حدیث سے بہت ہی بڑی مناسبت تھی اور انہوں نے اپنے وسیع وعمیق مطالعہ کی کثرت سے بہ نسبت دوسرے تلامذہ کے الگ امتیازی مقام حاصل کر لیا تھا، اسی لئے خدا کی شان کہ جو اقل استفادۃً تھا وہی اکثر افادۃً ہوا۔ جس کا بین ثبوت ان کی "معارف السنن" ہے مگر صد افسوس کہ وہ پوری نہ ہو سکی۔ اور میں اب تنہا اس بڑے بار کو محسوس کر رہا ہوں کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے علوم وتحقیقات حدیثیہ کو منظرِ عام پر لاؤں، پھر مجھے اس کا بھی نہایت افسوس ہے کہ پاکستان کے ناظرینِ انوارالباری تک میری کتاب نہیں پہنچ رہی ہے۔ **ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا.**

انوارالباری کے مباحث کو عام طور سے ارادہ مختصر ہی کر کے لانے کا کر لیا گیا ہے، مگر اہم فروعی واصولی مسائل پر ابحاث مفصل اور مکمل ومدلل ہی آئیں گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ بھی ناظرین نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ ہمارے پیشِ نظر زیادہ اہمیت حنفی شافعی وغیرہ ائمہ اربعہ کے باہمی اختلاف کی نہیں ہے، کیونکہ ان حضرات کا اختلاف مہماتِ مسائل میں بہت کم ہے، اور اصول وعقائد کے باب میں تو چاروں ائمۂ عظام کے درمیان کوئی اختلاف سرے سے ہے ہی نہیں۔

اس لئے سب سے بڑی اہمیت فتنۂ ظاہریت کی ہے، جس کو داؤدِ ظاہری کے بعد علامہ ابن حزم پھر علامہ ابن القیم اور علامہ شوکانی اور بعد

کے سلفی حضرات نے فروغ دیا، جو نہ صرف حنفی مسلک پر ضربِ کاری ہے بلکہ سب ہی ائمۂ اربعہ مجتہدین کے خلاف ایک مہم ہے۔ موجودہ دور میں اس کی بڑی اٹھان علامہ رشید رضا مصری اور ان کے تلامذہ و متبعین کے ذریعہ ہوئی، جن کے مقابلہ میں مفتی دیار مصریہ شیخ یوسف دجوی اور علامہ کوثری وغیرہ نے احقاقِ حق کیا، اور خاص طور سے طلاقِ ثلاث کے ایک طلاق ہونے کا مسئلہ مصر میں اٹھایا گیا تو علامہ کوثری نے "الاشفاق علی احکام الطلاق" لکھ کر ائمہ اربعہ کے متفقہ مسلک کی پرزور اور مکمل و مدلل تائید کی، اور مصری مجلات میں مقالات لکھے جن میں ثابت کیا کہ چاروں مذاہب سے الگ راہ اختیار کرنا یا تقلیدِ ائمہ کو شرک بتلا کر عوام کو عدمِ تقلید کی تلقین کرنا بالآخر لادینی کی دعوت دینا ہے، ہندوستان میں بھی اس قسم کے فتنہ کی ابتدا ہوئی تو حضرت شیخ الہندؒ نے ایضاح الادلہ وغیرہ تالیف فرما کر شائع کیں اور دار العلوم دیوبند و مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ کے اساتذۂ حدیث بھی درسِ حدیث و حدیثی تالیفات میں تشغیباتِ اہلِ حدیث وغیرہ مقلدین کا ردِّ وافر کرتے رہے ہیں اسی طرح جب مصر میں سلفی حضرات نے کتاب النقض للدارمی السجزی، کتاب السنہ المنسوب لعبداللہ بن احمد اور کتاب التوحید لابن خزیمہ وغیرہ شائع کیں تو علامہ کوثری نے ان کی شطحیات و شواذ پر مفصل و مدلل تعقب کیا اور ان میں جو عقائد جمہور سلف و خلف اور ائمہ اربعہ کے متفقہ فیصلوں کے خلاف تھے، ان کا ابطال کیا۔ (ملاحظہ ہوں مقالات الکوثری، السیف الصقیل فتح الباری جلد نمبر ۱۳ وغیرہ (حافظ ابن حجرؒ) مع دفع شبہ من تشبہ وتمرد ونسب ذلک الی الامام احمد للامام الحصنی ودفع شبہۃ التشبیہ للامام ابن الجوزی الحنبلیؒ مع تعلیقات الکوثریؒ بوادر النوادر حضرت تھانویؒ ص ۶۳، ص ۱۶۵، ص ۴۴۱، ص ۶۲۴، ص ۶۵۸، ص ۶۸۷، ص ۷۴۱، ص ۷۵۹، ص ۷۶۴ وغیرہ۔ فیض الباری جلد رابع کتاب التوحید، وسید بنوری نمبر ص ۷۱ خدام الدین لاہور) اس وقت ہندوستان میں بھی کچھ چیزیں آچکی تھیں تو ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اور حضرت مدنیؒ نے بھی اپنے درسِ حدیث میں متاخرین حنابلہ اور علامہ ابن تیمیہ و ابن القیم کے تفردات پر مفصل کلام اور نکیر شروع فرما دی تھی۔ وہ ہم انوارالباری میں اپنے مواقع پر پیش کرتے ہیں۔

اس وقت اہم ترین بات اس سلسلہ میں یہ عرض کرنی ہے کہ امام بخاریؒ اپنی صحیح کے آخر میں کتاب التوحید لائیں گے، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اسی کے تحت مکمل ابحاث علم کلام و عقائد کے مسائل پر کیا کرتے تھے، اگرچہ ضمناً کچھ ابحاث درمیان میں بھی آجاتی تھیں۔ حضرتؒ کی کچھ تحقیقاتِ انوار المحمود کے آخر میں بھی ذکر ہوئی ہیں اور فیض الباری کی چوتھی جلد میں بھی موجود ہیں۔ اگر یہ عاجز آخر تک نہ پہنچ سکے تو حضرتؒ کے ان دونوں امالی پر اکتفا کیا جائے۔

راقم الحروف نے حضرت شاہ صاحبؒ کے آخری دونوں سال کے درس بخاری شریف میں مکمل شرکت کر کے ملفوظاتِ مبارکہ انور یہ قلم بند کئے تھے، اور بزمانہ قیامِ مصر علامہ کوثریؒ سے بھی استفادات کئے تھے۔

اب تو یہ بات خواب و خیال کی سی ہوتی جارہی ہے کہ اپنی ان آنکھوں نے ایسے ایسے علوم و کمالات کے بحورِ بیکراں بھی دیکھے تھے
نازم بچشم خود کہ جمالِ تو دیدہ است

بہرحال! یہ بات سب جانتے ہیں کہ چند متاخرین حنابلہ نے جمہور سلف و خلف، ائمہ اربعہ و متقدمین حنابلہ اور اکابر علماء متکلمین متقدمین و متاخرین کے عقائد سے الگ دوسرے عقائد و نظریات اختیار کر لئے تھے (جن کا رد علامہ ابن الجوزی حنبلیؒ م ۵۹۷ھ نے بھی کیا تھا) اور دورِ حاضر کے متبعینِ حافظ ابن تیمیہ وغیرہ بھی اسی الگ ڈگر پر قائم ہیں۔ یهدیهم الله الی الصواب.

عاجز کا ارادہ ہے کہ ان اصولی مباحث سے متعلق تمام ذخیرۂ کتب علم کلام و عقائد کو سامنے رکھ کر علامہ کوثری اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیقاتِ عالیہ ایضاح و تفصیل کے ساتھ پیش کرے، مولانا بنوریؒ یہ کام کر جاتے تو میرا بڑا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ بظاہر عمر کا کارواں آخری منزل سے بہت قریب ہے، اس لئے بعید نہیں کہ "وکم حسرات فی بطون المقابر" والی بات صادق آجائے۔ والامر بید الله ولله الامر من قبل ومن بعد وصلی الله تعالیٰ علیٰ خیر خلقه سیدنا و مولانا محمد واله وصحبه ومن تبعهم الی یوم الدین.

احقر: سید احمد رضا عفا اللہ عنہ۔ بجنور ۲۱ جمادی الاخری ۱۳۹۹ھ/۳۱، مارچ ۷۹ء

تذکار الحبیب

نقل مکتوب گرامی مولانا السید محمد یوسف البنوریؒ ۱۳۹۷ھ

صاحب المآثر والمفاخر محب قدیم وصدیق حمیم زادکم اللہ فضلا وکمالا

تحیۃ وسلاما واشواقا۔ نامۂ گرامہ نے ممنون ومسرور ومطمئن فرمایا، انوار الباری کی تالیف وطباعت کی رفتار سے بہت مسرت ہوئی کل شام کو تیسری جلد بھی پہنچ گئی آنکھوں کو روشن کیا جزاکم اللہ خیرا، تیس ۳۰ چالیس صفحات بہت عجلت میں دیکھے دل سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ امت کو جلد اس گوہر گراں مایہ سے مستفید فرمائے اور امام العصر حضرت شیخ کے علوم وجواہر سے امت کو اس اردو شرح کے ذریعہ فیضیاب بنائے کاش میں بجنور ہوتا یا آپ کراچی ہوتے تو حضرت شیخ کے انفاس قدسیہ کی خدمت میں اور تشریح وتبییض میں میرا بھی حصہ ہوتا آپ کی جواں ہمتی تو میرے لئے قابل رشک ہے۔ افسوس طبیعت جس وقت ذوق جستجو سے سرشار تھی اس وقت دماغی پختگی اتنی نہیں تھی اور جس وقت پختگی حاصل ہوئی بحث وتفتیش کی نہ فرصت اور نہ ہمت نتیجہ دونوں زمانوں میں بجز قصور کیا ہوتا مدرسہ کے غیر علمی مشاغل نے بہت پریشان کر رکھا ہے اور اب تو مخلصین کی آمد ورفت بھی پریشانی کا باعث ہو رہی ہے غیر علمی امور میں سارا وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ آپ کی جرأت مندانہ اظہار حق سے دل بہت خوش ہوتا ہے آپ سے جتنی پوری ملاقات کی آرزو ہے اتنی نصف الملاقات کی تمنا بھی رہتی ہے ان شاء اللہ تعالیٰ کسی قریبی فرصت میں ہم کلامی کا موقع ملے گا۔ دعوات صالحہ سے فراموش نہ کریں۔ اہل بیت وذریۂ طیبہ کو سلام ودعوات اخلاص۔ شیخ کوثری کے نفائس منتشرہ جمع کرنا بھی بہت مفید رہے گا الحمد للہ کہ آپ خوب توجہ دے رہے ہیں۔ والسلام مسک الختام۔ مخلصکم القدیم ورفیقکم محمد یوسف البنوری عفا اللہ عنہ۔

مدرسہ عربیہ اسلامیہ کراچی ۲۹، صفر الخیر ۱۳۸۹ھ

باب وضع الیمنیٰ علی الیسریٰ فی الصلوٰۃ

(نماز میں داہنے ہاتھ کا بائیں ہاتھ پر رکھنے کا بیان)

۷۰۱: حدثنا عبداللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابی حازم عن سہل بن سعد قال کان ناس یؤمرون ان یضع الرجل الید الیمنیٰ علیٰ ذراعہ الیسریٰ فی الصلوٰۃ وقال ابو حازم لآ اعلمہٗ الاینمی ذٰلک الی النبی صلے اللہ علیہ وسلم

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ نماز میں دایاں ہاتھ بائیں کلائی پر رکھیں، اور ابو حازم نے کہا:۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اس حکم کو نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے۔

تشریح:۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سلف سے فوق السرہ اور تحت السرہ دونوں طرح ہاتھ باندھ کر نماز ثابت ہے، لیکن فوق الصدر (سینے کے اوپر) بے اصل ہے، اس کا ثبوت سلف سے نہیں ہے، اور اس کا وجود دو سو سال سے ہوا ہے۔ صحیح ابن خزیمہ میں علی الصدر کا لفظ ہے، جو ضعیف ہے، اسی لئے کسی مذہب میں بھی اس پر عمل نہیں ہوا۔ نکتہ یہ ہے کہ نماز میں احکم الحاکمین کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا ایسا ہی ہے جیسے نوکر وغلام بطور تعظیم، آقاؤں اور بادشاہوں کے سامنے کمر پر پٹی باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ سینے پر ہاتھ باندھنا تعظیم کی کوئی صورت نہیں ہے، یہ بھی فرمایا کہ صحیح ابن خزیمہ میں وائل کی روایت ہے، جس کو اور بھی دوسرے راویوں نے روایت کیا ہے مگر کسی میں بھی "علی الصدر" کا اضافہ نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ یہ زیادتی ایک زمانہ کے بعد ہوئی ہو، لہٰذا اس پر جمود کرنا صحیح نہیں خصوصاً جبکہ سلف

میں کسی نے اس پر عمل نہیں کیا ہے۔ اسی لئے امام ترمذی نے جو اختلاف مذاہب نقل کیا کرتے ہیں، سینے پر ہاتھ باندھنا کسی کا بھی مذہب نہیں نقل کیا۔ انھوں نے لکھا کہ اہل علم صحابہ و تابعین اور بعد کے حضرات بھی نماز میں داہنا ہاتھ بائیں پر رکھتے تھے، اور بعض ناف کے اوپر اور بعض ناف کے نیچے ہاتھ باندھتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک کی گنجائش ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کی روایات ہیں، چونکہ بعض قلمی نسخوں میں تحت السرہ کا لفظ نہیں ہے، اس لئے بعض علماء حنفیہ بھی متردد ہو گئے تھے، مگر وہ صحیح نسخوں میں ضرور موجود تھی، اسی لئے علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی وغیرہ نے اس کا ذکر کیا تھا۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ کے مطبوعہ نسخہ میں تین روایتوں میں یہ لفظ موجود ہے، ملاحظہ ہو ص۳۹۰/۱ و ص۳۹۱/۱ اور صحیح ابن خزیمہ کے مطبوعہ نسخہ ۲۴۳/۱ میں وائل کی حدیث مؤمل سے ''علے صدرہ'' کے اضافہ کے ساتھ موجود ہے۔ لیکن ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح نہیں کی ہے، لہٰذا شوکانی کا نیل الاوطار میں یہ قول غلط ہے کہ ابن خزیمہ نے اس حدیث کی تخریج کی اور تصحیح بھی کی ہے، علامہ بنوریؒ کے سامنے چونکہ مطبوعہ نسخہ نہیں آیا تھا، اس لئے انھوں نے لکھا کہ شوکانی صاحب نیل الاوطار حافظ ابن حجرؒ کی کتابوں سے اخذ کرتے ہیں خصوصاً تلخیص و فتح الباری سے، لیکن ان میں کہیں تصحیح کا حوالہ نہیں ہے، اور نہ اس امر کا یقین ہے کہ شوکانی کو صحیح ابن خزیمہ ملی ہوگی، اور اگر ابن خزیمہ نے تصحیح کر بھی دی ہوگی تو اس بارے میں ان کا طریق و مذہب حافظ ابن حجر و سخاوی کے اقوال سے واضح ہو چکا ہے، پھر ان کی تصحیح پر دوسروں کو اعتماد کر لینا بھی ضروری نہیں کیونکہ اکابر امت نے مؤمل بن اسماعیل کے بارے میں اتنا کلام کیا ہے کہ ان کی روایت قابل تصحیح نہیں رہ سکتی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کا تعصب

علامہ بنوریؒ نے بطور تنبیہ افادہ کیا کہ حافظ نے فتح الباری ص۲۰۶/۹ میں لکھا کہ اسی طرح مؤمل بن اسماعیل اپنی روایت حدیث عن الثوری میں ضعیف ہیں، پھر یہاں بھی وہی مؤمل ثوری سے صحیح ابن خزیمہ میں روایت کر رہے ہیں تو حافظ نے ان پر ضعف کا حکم نہیں لگایا، اور خاموشی سے گذر گئے اور یہ ان کا طریقہ ہے کہ جہاں کسی راوی سے اپنے مفید مطلب روایت ملے سکوت کرتے ہیں، اور جہاں اسی راوی سے ان کے خلاف مسلک روایت آئے تو اس کو ضعیف ثابت کرتے ہیں۔ اسی روایت ابن خزیمہ میں مؤمل کے علاوہ عاصم بن کلیب بھی ہیں، جن کی یہاں ان لوگوں نے توثیق کر دی ہے، مگر حدیث ترک رفع یدین میں ان ہی عاصم کی تضعیف کر دی ہے (ذکر ذلک ابن القیم فی اعلامہ) الخ پوری بحث و تفصیل معارف السنن ص۴۳۵/۲ تا ص۴۴۵/۲ لائق مطالعہ ہے۔

تفصیل مذاہب: اول تو اس مسئلہ میں اختلاف اولویت و افضلیت کا ہے، اسی لئے امام ترمذی نے بھی توسع کی طرف اشارہ کیا، تاہم جو ہے وہ ذکر کیا جاتا ہے، پہلا اختلاف تو وضع و ارسال کا ہے۔ ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہؒ، امام شافعی و احمد) اور اسحٰق و اکثر اہل علم ہاتھ باندھنے کو مستحب فرماتے ہیں، اور یہی قول حضرت علی، حضرت ابوہریرہ اور ابراہیم نخعی و ثوری کا ہے اور ابن عبدالحکم و ابن المنذر نے امام مالک سے بھی یہی قول نقل کیا ہے باقی ابن القاسم نے امام مالک سے ارسال نقل کیا ہے اور امام مالک سے ایک قول میں یہ تفصیل بھی ہے کہ فرائض میں ارسال کرے اور نوافل میں ہاتھ باندھے۔ ابن المنذر نے یہ بھی کہا کہ حضور علیہ السلام سے اس بارے میں کوئی چیز (قوت و صراحت کے ساتھ) ثابت نہیں ہے، لہٰذا اختیار ہے جیسے چاہے کرے اور امام احمدؒ سے بھی ایک قول تخییر کا ہے۔

دوسرا اختلاف محل وضع میں ہے، امام اعظم ابوحنیفہؒ، سفیان ثوریؒ، ابن راہویہؒ، ابواسحٰق مروزی شافعیؒ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو فرماتے ہیں۔ امام شافعی سینے کے نیچے بتلاتے ہیں جیسا کہ کتاب الام[۱] اور الوسیط میں ہے۔ علامہ ابن ہبیرہ نے روایت مشہورہ امام احمدؒ سے مثل مذہب امام ابو

---

[۱] حاشیہ کتاب الام للمزنی الشافعی ص۷۱/۱ میں تحت الصدر ہی ہے۔ اور کتاب الام امام شافعیؒ کی آخری تصنیف ہے (مؤلف)

حنیفہ نقل کی ہے جیسا کہ تعلیقات الشیخ میں ہے اور لکھا کہ ایسا ہی "میزان" میں ہے اور اسی کو خرقی نے اختیار کیا ہے۔ اور علامہ ابوالطیب مدنی نے شرح ترمذی میں لکھا کہ ائمہ اربعہ میں سے کوئی بھی سینے پر ہاتھ باندھنے کا قائل نہیں ہے الخ (معارف السنن ص۴۳۶/۲) (ابن القیم کا نقد امام مالک پر)

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف صرف افضلیت کا ہے اور امام مالکؒ سے بھی ایک قول ہاتھ باندھنے کا موجود ہے، پھر بھی حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں حسب عادت امام مالک اور مالکیہ کے خلاف نہایت نامناسب الفاظ استعمال کئے ہیں۔ آپ نے متعدد احادیث ذکر کیں جن میں ناف کے نیچے اور سینے کے نیچے ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے پھر لکھا کہ "ان سب احادیث کو مقلدین نے اس لئے چھوڑ دیا کہ ان کے ایک امام مالک نے ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کو کہا ہے، لہٰذا سارے مالکی اسی طرح نماز پڑھنے لگے۔ ایسا اندھیرا کہیں نہیں دیکھا گیا اور ایسے لوگ خدا کے یہاں کیا جواب دیں گے وغیرہ۔ (اعلام ص۶/۲)

اسی طرح علامہ موصوف نے اپنی کتاب مذکور میں جگہ جگہ مقلدین ائمہ مجتہدین پر اعتراضات کئے ہیں، اور سخت زبان استعمال کی ہے حالانکہ ان اعتراضات کے مکمل و مدلل جوابات کتب متقدمین میں موجود چلے آتے ہیں، اور خود ان کے استاذ حافظ ابن تیمیہؒ نے ائمہ مجتہدین کے بے شمار مسائل کی تصویب کی ہے اور وہ ان کے مذاہب کی نقل بھی، حافظ ابن القیم کے برخلاف نہایت ادب و احترام کے ساتھ کرتے ہیں، بجز ان چند مسائل کے جن میں انھوں نے جمہور سلف و خلف سے تفرد اختیار کر کے اپنی الگ راہ بنائی ہے۔ و الله یحق الحق وھو خیر الفاصلین.

باب الخشوع فی الصلوٰة

(نماز میں خشوع کا بیان)

۷۰۲: حدثنا اسمٰعیل قال حدثنی مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابی ھریرة رضی الله تعالیٰ عنه ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال ھل ترون قبلتی ھٰھنا والله ما یخفیٰ علی رکوعکم ولاخشوعکم و انی لاراکم ورآء ظھری

۷۰۳: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا غندر قال حدثنا شعبة قال سمعت قتادة عن انس بن مالک عن النبی صلی الله علیه وسلم قال اقیموا الرکوع والسجود فوالله انی لاراکم من بعدی و ربما قال من بعد ظھریٓ اذارکعتم وسجدتم

ترجمہ۷۰۲: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ رسول خدا ﷺ نے (ایک روز ہم لوگوں سے) فرمایا، تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ میرا منہ (قبلے) کی طرف ہے (لیکن) خدا کی قسم! تمہارا رکوع اور تمہارا سجدہ تمہارا خشوع اپنی پس پشت سے بھی، میں دیکھتا ہوں (جیسا سامنے سے)

ترجمہ۷۰۳: حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا رکوع اور سجدوں کو درست طریقہ پر کیا کرو (اس لئے) کہ جب تم رکوع سجدہ کرتے ہو تو میں پشت کی طرف سے بھی دیکھتا ہوں (جیسے سامنے سے دیکھا جاتا ہے)

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: نماز میں خشوع شرعی فقہی لحاظ سے مستحب ہے، حالانکہ وہ لازمی و ضروری ہونا چاہئے کیونکہ روح نماز کی وہی ہے، مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اگر اس کو شریعت فرض و واجب قرار دے دیتی تو اکثر لوگوں کی نمازیں باطل ہوتیں شریعت کا منشا یہ ہے کہ لوگ اچھی بات اور صحیح راستہ کی اہمیت و قیمت پہچانیں، اور اس پر لگنے کی کوشش کریں، پھر بھی جو کوتاہی ہو اس کو شریعت نظر انداز کرتی ہے۔ اس لئے فقہ نے فیصلہ دیا کہ نماز بغیر خشوع کے بھی ہو جائے گی گو ناقص اور روح سے خالی رہے گی امام غزالیؒ وغیرہ کی نظر چونکہ باطن پر تھی. اس لئے انہوں نے کہا کہ نماز میں خشوع فرض ہے اس کے بغیر نماز صحیح نہ ہو گی۔ انھوں نے اپنے منصب کے لحاظ سے بات کہی۔ فقہاء کا

منصب ظاہر پر حکم کرنا ہے، وہ اپنے منصب کے اعتبار سے فیصلے کرتے ہیں۔

دوسری حدیث الباب میں اقیموا الرکوع پر حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ حدیث مسیئ الصلوٰۃ کا ایک ٹکڑا ہے، اور اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص نے رکوع وسجدہ میں بھی کوتاہی کی تھی، چنانچہ حدیث ترمذی میں انتقاص کا لفظ موجود ہے، گویا وہ نماز کے ناقص ہونے کی طرف اشارہ تھا، لہٰذا تعدیل ارکان کے ترک سے نقصان آئے گا، بطلان نہ ہوگا، اور یہی واجب کی شان ہے، جس کو حنفیہ بھی مانتے ہیں۔ مخالفین نے حنفیہ کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ انھوں نے حدیث پر عمل نہیں کیا، جبکہ حنفیہ نے ساری حدیثوں پر نظر کر کے نظر صحیح قائم کی ہے۔ حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ شافعیہ کے یہاں جو چیزیں فرض ہیں مگر وہ شرط صحت صلوٰۃ نہیں ہیں۔ وہی ہمارے یہاں واجب کہلاتی ہیں، لہٰذا صرف نام کا اختلاف برائے نام ہے اور کچھ نہیں فرمایا ارکعوا اور اقیموا الرکوع میں فرق ہے، دوسرے میں زیادتی ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو چیز ہی نہ رہے گی، لہٰذا اقامۃ کے معنی برپا کرنا ہے اور قائم رکھنا ہے کہ اگر ایسا نہ کریں تو وہ نماز یا رکوع باقی نہ رہے گا جیسے کہیں کہ فلاں شخص دیندار ہے اور فلاں نے دین کو تھام رکھا ہے۔ پس نماز پڑھنا یہ کم درجہ کی چیز ہے بہ نسبت اقامۃ صلوٰۃ کے۔

قولہ فواللہ انی لا راکم الخ پر فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا یہ پیٹھ پیچھے سے دیکھنا بطور معجزہ تھا جیسا کہ امام احمدؒ سے بھی نقل ہوا ہے اور اب جدید سائنس کی تحقیق بھی یہ ہے کہ قوت باصرہ ساری جلد انسانی کے اندر موجود ہے۔ پھر فرمایا کہ معجزہ میں یہ ضروری نہیں کہ وہ مستحیل ہو بلکہ یہ ضروری ہے کہ اس وقت مقابلہ میں کسی دوسرے سے نہ ہو سکے، خواہ بعد کو وہ ہوا کرے۔

باب مایقرأ بعد التکبیر

(تکبیر (تحریمہ) کے بعد کیا پڑھے)

۷۰۴: حدثنا حفص بن عمر حدثنا شعبة عن قتادة عن انس ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم وابابکر و عمر کانوا یفتحون الصلوٰة بالحمد للہ رب العلمین

۷۰۵: حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل قال حدثنا عبدالواحد بن زیاد قال حدثنا عمارة بن القعقاع قال حدثنا ابوزرعة قال حدثنا ابوهریرة قال کان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یسکت بین التکبیر و بین القراءة اسکاتةً قال احسبه قال هنیةً فقلت بابی انت و امی یارسول اللہ اسکاتک بین التکبیر و بین القرآءة ماتقول قال اقول اللهم باعدبینی و بین خطایای کما باعدت بین المشرق والمغرب اللهم نقنی من الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس اللهم اغسل خطایای بالمآء والثلج والبرد

ترجمہ۷۰۴:۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اور ابوبکرؓ وعمرؓ نماز کی ابتدا الحمد للہ رب العالمین سے کرتے تھے:۔

ترجمہ۷۰۵:۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ تکبیر اور قراءت کے درمیان میں کچھ سکوت فرماتے تھے (ابو زرعہ کہتے ہیں) مجھے خیال ہوتا ہے کہ ابو ہریرہؓ نے کہا تھوڑی دیر تو میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، تکبیر اور قراءت کے مابین سکوت کرنے میں آپ کیا پڑھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا، میں پڑھتا ہوں اے اللہ! میرے اور میرے گناہوں کے درمیان میں ایسا فصل کر دے جیسا تو نے مشرق اور مغرب کے درمیان میں فصل کر دیا ہے۔ اے اللہ! مجھے گناہوں سے پاک کر دے، جیسے سفید کپڑا میل سے صاف کیا جاتا ہے۔ اے اللہ! میرے گناہوں کو پانی اور برف اور اولہ سے دھو ڈال:

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اور حنابلہ کے یہاں بھی تکبیر اولی کے بعد سبحانک اللّٰھم وبحمدک الخ پڑھنا

مستحب ہے، اور مسلم شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے تعلیم دینے کے لئے نماز کے اندر بھی اسی کو بلند آواز سے پڑھا تھا، امام شافعیؒ نے اس دعا کو اختیار کیا ہے، جو بخاری کی حدیث الباب میں سامنے ہے **اللّٰھم باعد** الخ، اور قوۃ اسناد کے لحاظ سے یہی اولی ہے مگر تعامل پر نظر کرتے ہوئے ہماری دعا اعلی ہے، امام احمدؒ نے بھی ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ جس دعا کو حضرت عمرؓ نے اختیار کیا تھا اسی کو ہم بھی اختیار کرتے ہیں۔

تعامل اور فن اسناد

اس کے بعد حضرتؒ نے فرمایا کہ قوت اسانید پر غرہ کرنے اور تعامل سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے دین کو بڑا ضرر پہنچا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسناد کا فن دین کی حفاظت کے لئے تھا تاکہ اس میں باہر کی غیر چیزیں داخل نہ ہو سکیں، لیکن پھر فن اسناد پر اتنا زیادہ زور صرف کیا گیا کہ تعامل نظروں سے اوجھل ہو گیا، حالانکہ وہی دینی احکام کے لئے میرے نزدیک فیصلہ کن چیز تھی حضرتؒ نے یہاں امام ترمذی کی طرف اشارہ کیا کیونکہ انھوں نے حنفیہ وحنابلہ کی دعاء استفتاح والی حدیث ذکر کر کے اس پر سندی کلام کر دیا ہے۔ پوری بحث معارف السنن ص ۲/۳۵۹ میں دیکھی جائے، خلاصہ یہ ہے کہ اس کے رجال بھی ثقہ ہیں اور کلام سے تو بہت کم راوی بچے ہیں۔ پھر حضرت عمرؓ کے صحیح اثر سے بھی یہ بات ثابت ہو گئی کہ آخری عمل حضور علیہ السلام کا انھوں نے وہی دیکھا ہوگا، جس کو اختیار فرمایا، یہ تعامل صحابہ کے شواہد ہی صحت حدیث کے لئے بڑی دلیل ہیں۔

محدث شہیر علامہ تورپشتی حنفی نے لکھا کہ **سبحانک اللّٰھم** والی حدیث استفتاح حدیث حسن مشہور ہے، جس پر خلفاء اور حضرت عمرؓ نے عمل کیا ہے اور اسی کو حضرت عبداللہ بن مسعود وغیرہ فقہائے صحابہ نے اختیار کیا تھا۔ اور علماء تابعین نے بھی۔ پھر اسی کو امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے جلیل القدر علماء حدیث مثل سفیان ثوری، امام احمد واسحٰق بن راہویہ نے معمول بنایا، اور امام ترمذی نے جس سند میں کلام کیا ہے، اس کے علاوہ دوسری وجوہ روایت بھی ہیں، مثلاً ابوداؤد وغیرہ کی حدیث۔ الخ پھر فرمایا کہ مشہور یہ ہے کہ امام مالکؒ کے یہاں دعاء استفتاح نہیں ہے، مگر ابوبکر بن العربی نے نقل کیا کہ وہ خود پڑھتے تھے، دوسروں کو حکم نہیں کرتے تھے، گویا اس کو امر مستحب خیال کرتے تھے۔

بسم اللہ جزو سورت نہیں

پہلی حدیث الباب میں جو یہ ہے کہ حضور علیہ السلام اور حضرت ابوبکر وعمرؓ نماز کو **الحمد للہ رب العالمین** شروع کرتے تھے، اس سے حنفیہ نے بسم اللہ آہستہ پڑھنے پر استدلال کیا ہے، اور بسم اللہ کے جزو سورۂ فاتحہ نہ ہونے پر بھی خود امام شافعیؒ نے اس کا جواب دیا کہ مراد سورۂ فاتحہ ہے (کتاب الام ص ۱/۹۳) اور یہی جواب دوسرے شافعیہ بھی دیتے ہیں، حافظ زیلعیؒ نے اس جواب دیا کہ پوری آیت الحمد للہ رب العالمین تو سورۂ فاتحہ کا نام نہیں ہے، نام تو صرف الحمد ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کا استدلال درست ہے۔ پھر فرمایا کہ ظاہر روایت کی رو سے بسم اللہ پڑھنا ہمارے یہاں سنت ہے مگر ایک روایت وجوب کی بھی ہے اور شیخ سید محمود آلوسیؒ نے وجوب کو ہی ترجیح دی ہے۔

اس موقع پر الحمد سے قبل جہر **بسم اللہ الرحمٰن الرحیم** کے لئے جو خطیب بغدادی نے سب سے زیادہ زور صرف کیا ہے، اس کے جوابات مفصل ومدلل معارف السنن ص ۲/۳۶۲ تا ص ۲/۳۸۲ میں مطالعہ کئے جائیں۔ نہایت بصیرت حاصل ہوگی۔

امام بیہقی کا غلط استدلال

قولہ یسکت بین التکبیر الخ پر فرمایا:۔ اس سے ائمہ ثلاثہ (امام ابو حنیفہؒ) امام احمد وشافعی) اور جمہور نے دعاء استفتاح پر استدلال کیا ہے لیکن امام بیہقی نے اس سے دوسری عجیب بات نکالی ہے وہ یہ کہ یہاں سکوت تھا اور دعا بھی پڑھی گئی، لہٰذا اسی طرح امام کے پیچھے فاتحہ بھی پڑھی جا سکتی ہے، اور وہ انصات کے خلاف نہ ہوگا اور قراءت سراسر جائز ہوگی۔ حالانکہ یہاں سکوت کا اطلاق قراءت سراً پر نہیں

ہوا ہے، بلکہ سکوت سے مراد سکون ہے، جس کا تعلق ماقبل سے ہے کہ تکبیر سے فارغ ہوئے چنانچہ ایک روایت میں بھی ہے کہ اللہ اکبر سے سکوت کیا، اور آیت **ولما سکت عن موسی الغضب** میں بھی سکون ہی مراد ہے، نہ کہ اخفاء، پھر انصات و سکتہ میں یوں بھی فرق ہے، خصوصاً جبکہ انصات کے ساتھ استماع بھی ہو، جس کی تفصیل بحث قراءۃ خلف الامام میں آئے گی۔

قولہ اللّٰھم اغسل خطایای بالماء والثلج والبرد پر فرمایا کہ محقق ابن دقیق العید نے کہا کہ لوگ عام طور سے یہ سمجھتے ہیں کہ اتنا برف اولہ وغیرہ برستا ہے اور زمین پر بیکار ہو کر بہ جاتا ہے، اس لئے دعا اس طرح کی گئی کہ یا اللہ! اس کو میرے گناہوں کے دھونے میں کار آمد کر دے، بعض نے کہا کہ مجھے برف اولہ کی طرح صاف و سفید اور گناہوں کی آلائش سے پاک کر دے۔ بعض نے کہا ان چیزوں میں ٹھنڈک ہے، ان سے میرے گناہوں کی گرمی و حدت کو مٹا دے۔ وغیرہ

باب ۷۰۶: حدثنا ابن ابی مریم قال اخبرنا نافع بن عمر قال حدثنی ابن ابی ملیکۃ عن اسمآء بنت ابی بکر ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی صلوٰۃ الکسوف فقام فاطال القیام ثم رکع فاطال الرکوع ثم قام فاطال القیام ثم رکع فاطال الرکوع ثم سجد فاطال السجود ثم رفع ثم سجد فاطال السجود ثم قام فاطال القیام ثم رکع فاطال الرکوع ثم رفع فسجدفاطال السجودثم رفع ثم سجدفاطال السجود ثم انصرف فقال قد دنت منی الجنۃ حتیٰ لواجترات علیھا جئتکم بقطاف من قطافھا ودنت منی النار حتیٰ قلت ای رب او انامعھم؟ فاذا امراۃ حسبت انہ' قال تخدشھا ھرۃ قلت ماشان ھذہ قالوا حبستھا حتیٰ ماتت جوعاً لآاطعمتھا ولاارسلھاتاکل قال نفاع حسبت انہ' قال من خشیش الارض او خشاش

ترجمہ: حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم علیہ نماز کسوف پڑھنے کھڑے ہوئے تو آپ نے طویل قیام کیا، پھر طویل رکوع کیا، اس کے بعد قیام کیا، اور قیام کو (بھی) طویل کیا، پھر رکوع کیا، اور رکوع کو (بھی) بڑھایا۔ پھر سر اٹھایا اس کے بعد (دوسرا) سجدہ کیا۔ اور (اس) سجدہ کو (بھی) بڑھایا، پھر (دوسری رکعت کے لئے) آپ کھڑے ہوئے، اور آپ نے قیام کو بڑھایا اس کے بعد رکوع کیا، اور رکوع کو بڑھایا۔ پھر سر اٹھا کر سجدہ کیا، سجدے کو (بھی) بڑھایا۔ اس کے بعد پھر سر اٹھایا، تو (دوسرا) سجدہ کیا اور (اس) سجدے کو (بھی) بڑھایا اس کے بعد آپ نے (نماز سے) فراغت حاصل کی' اور فرمایا کہ (اس وقت) جنت میرے اتنے قریب ہوگئی تھی کہ اگر میں چاہتا، تو اس کے خوشوں میں سے کوئی خوشہ تمہارے پاس لے آتا، اور دوزخ بھی میرے اتنے قریب ہوگئی تھی کہ میں کہنے لگا کہ اے میرے پروردگار! کیا میں ان لوگوں کے ہمراہ (رکھا جاؤں گا) یکا یک ایک عورت (نظر پڑی) مجھے خیال ہے کہ آپ نے فرمایا، کہ اس کو ایک بلی پنجہ مار رہی تھی، میں نے کہا، اس کا کیا حال ہے۔ لوگوں نے کہا کہ اس نے بلی کو پال رکھا تھا، نہ اس کو کھلاتی تھی، اور نہ اس کو چھوڑتی تھی تا کہ وہ (از خود) کچھ کھا لے، نافع کی روایت میں اس طرح ہے کہ (نہ اس کو چھوڑتی تھی) تا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر اپنا پیٹ بھرے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ اس حدیث الباب میں صلوٰۃ کسوف کا ذکر کیا گیا ہے، اور بخاری و موطأ امام مالک سے دو رکوع کا ثبوت ہوا ہے، دوسری روایات پانچ تک کی بھی ہیں جیسے ابوداؤد وغیرہ میں۔ مسلم میں تین کی روایت ہے۔ حافظ ابن حجر نے ایک واقعہ مانا ہے۔ علامہ نووی وغیرہ نے اس کو تعدد وقائع پر محمول کیا، لیکن وہ غلط ہے کیونکہ کسوف کا واقعہ حضور علیہ السلام کی زندگی میں صرف ایک ہی بار پیش آیا ہے جیسا کہ محمود شاہ فرنساوی نے اپنے رسالہ میں تحقیق کی ہے، جس میں قمری حساب کو شمسی پر منطبق کیا ہے، البتہ اس نے نسئ عند العرب سے انکار کر کے غلطی کی ہے۔ کیونکہ ان کے یہاں لوند لگتا تھا اور ایک سال میں دو ماہ ذی الحجہ کے ہو جاتے تھے، جس طرح ہندوستان میں لوند لگتا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی تعدد کے قائل تھے، کیونکہ وہ رواۃ پر بہت وثوق کیا کرتے تھے اور حتی الوسع ان کی تصحیح کرتے تھے، میں نے اس رسالہ کا ذکر کیا تو خاموش ہو گئے۔

پھر فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے اگرچہ نماز کسوف میں ایک ایک رکعت میں دو دو رکوع کئے تھے، لیکن یہ نہیں فرمایا کہ اسی طرح تم بھی پڑھنا کہ یہ قریب کی تشبیہ ہوتی بلکہ دور کی تشبیہ دے کر فرمایا کہ تم نئی نماز (فجر) کی طرح پڑھا کرنا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے یہ توجیہ فرمائی تھی، پھر بدائع چھپ کر آئی تو اس میں بھی ابوعبداللہ بلخی سے یہی توجیہ نقل ہوئی، جو کبار مشائخ حنفیہ میں سے ہیں، میں نے حضرت سے عرض کیا تو سن کر بہت خوش ہوئے اور پوچھا کہ یہ کون ہیں؟

تعدد رکوع خصیصۂ نبوی

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے بھی نکات نکالے ہیں حضور علیہ السلام کے دو رکوع کے لئے مگر بہر حال! وہ آپ کی خصوصیت ہی رہے گی، مثلاً یہ کہ آپ نے نماز کے اندر جنت و دوزخ کو قبلہ کی دیوار میں متمثل دیکھا تھا، اور وہ ایک آیت تھی آیات اللہ میں سے جس کا آپ نے خطبہ میں بھی ذکر فرمایا، دوسرا زائد رکوع آیت اللہ کے سبب سے تھا کہ آپ نے اس کے سامنے تضرع و ابتہال کیا۔

نماز کسوف کا طریقہ

یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ حنفیہ تو حضور علیہ السلام کے فعل مبارک اور واقعہ خاصہ دو رکوع والے کو آپ کی خصوصیت پر محمول کرتے ہیں اور حضور علیہ السلام کے قول کو ترجیح دیتے ہیں کہ ابوداؤد میں حدیث ہے حضور علیہ السلام نے نماز کسوف پڑھا کر فرمایا کہ تم اس کو نئی نماز فرض (فجر) کی طرح پڑھا کرنا۔ اور مالکیہ، شافعیہ و حنابلہ نماز کسوف میں دو دو رکوع کے ہی قائل ہیں۔ جو آپ سے فعلی حدیث میں ثابت ہے۔ پوری بحث العرف الشذی اور معارف السنن جلد پنجم میں ہے **قولہ هرة** پر فرمایا کہ اس میں تا وحدت کی ہے تانیث کی نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے اس عورت کو جہنم میں کیونکر دیکھ لیا؟ جبکہ اس کا دخول جہنم مستقبل ہوگا، حقیقت یہ ہے کہ گہری نظر والے حال ہی میں مستقبل کی چیزوں کو دیکھ لیا کرتے ہیں خاص کر جبکہ اس آئندہ آنے والی چیز کا کسی نہج سے کچھ وجود بھی ہو۔ جیسے بیج کے اندر درخت کا تصور اور خیالی رویت ممکن ہے۔

نماز کسوف کے بارے میں مکمل اختلافی حدیثی ابحاث اپنے موقع پر آئیں گی، فتح الملہم جلد دوم اور معارف السنن جلد پنجم میں بھی دیکھی جائیں۔

باب رفع البصر الی الامام فی الصلوٰۃ وقالت عآئشة قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم فی صلوۃ الکسوف رأیت جھنم یحطم بعضھا بعضاً حین رایتمونی تاخرت

(نماز میں امام کی طرف نظر اٹھانے کا بیان' اور حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کسوف کے بارے میں فرمایا کہ میں نے جہنم کو دیکھا کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو توڑ پھوڑ رہا ہے۔ جب تم نے مجھے دیکھا کہ میں پیچھے ہٹا تھا)

۷۰۷: حدثنا موسیٰ قال حدثنا عبدالواحد قال حدثنا الاعمش عن عمارة ابن عمیر عن ابی معمر قال قلنا لخباب اکان رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الظھر والعصر قال نعم فقلنا بما کنتم تعرفون ذاک قال باضطراب لحیة

۷۰۸: حدثنا حجاج قال حدثنا شعبة قال انبانا ابواسحاق قال سمعت عبداللہ بن یزید یخطب قال حدثنا البرآء وکان غیر کذوب انھم کانوا اذا صلوا مع النبی صلے اللہ علیہ وسلم فرفع راسه' من الرکوع قاموا قیاماً حتیٰ یروہ قد سجد

ترجمہ ۷۰۷:۔ ابومعمرؒ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے حضرت خبابؓ سے کہا کہ کیا رسول خدا ﷺ ظہر اور عصر (کی نماز) میں کچھ پڑھتے تھے، خبابؓ نے کہا۔ ہاں! ہم نے کہا تم نے یہ کس طرح معلوم کر لیا، خبابؓ نے کہا کہ آپ کی داڑھی کے ہلنے سے:۔

ترجمہ۷۰۸: ۔ ابواسحاق روایت کرتے ہیں، کہ میں نے عبداللہ بن یزید کو خطبہ پڑھتے میں یہ کہتے ہوئے سنا کہ ہم سے براء (بن عازب) نے بیان کیا (اور وہ جھوٹے نہ تھے) کہ صحابہ جب نبی کریم ﷺ کے ہمراہ نماز پڑھتے۔ اور جب آپ اپنا سر رکوع سے اٹھا لیتے تو صحابہ کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ جب آپ کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھ لیتے (تب سجدہ کرتے تھے۔

۷۰۹: حدثنا اسماعیل قال حدثنی مالک عن زید بن اسلم عن عطآء بن یسار عن عبدالله بن عباس قال خسفت الشمس علیٰ عهدالنبی صلے الله علیه وسلم فصلی کالوایارسول الله رایناک تناولت شیئاً فی مقامک ثم رایناک تکعکعت فقال انی رایت الجنة فتناولت منها عنقوداً ولواخذته' لاکلتم منه' ما بقیت الدنیا

۷۱۰: حدثنا محمد بن سنان قال حدثنا فلیح قال حدثنا هلال بن علی عن انس بن مالک قال صلیٰ لنا النبی صلی الله علیه وسلم ثم رقی المنبر فاشار بیدیه قبل قبلة المسجد ثم قال لقد رایت الأن منذصلیت لکم الصلوٰة الجنة والنار ممثلتین فی قبلة هٰذا الجدار فلم ارکان لیوم فی اخیر والشر ثلاثاً

ترجمہ۷۰۹: ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں آفتاب میں گہن پڑا، تو آپ نے نماز کسوف پڑھی، صحابہ نے عرض کیا کہ ہم نے آپ کو دیکھا کہ کوئی چیز آپ نے اپنی جگہ پر (کھڑے ہوئے) لی تھی پھر ہم نے آپ کو دیکھا، کہ آپ پیچھے ہٹے، آپ نے فرمایا کہ میں نے جنت کو دیکھا تو اس سے ایک خوشہ میں نے لینا چاہا، اگر میں اس کو لے لیتا، تو تم اس میں سے کھایا کرتے، جب تک کہ دنیا باقی رہتی۔ (یعنی وہ کبھی فنا نہ ہوتا)

ترجمہ۷۱۰: ۔ حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، اس کے بعد منبر پر تشریف لائے، اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مسجد کے قبلے کی طرف اشارہ کیا، پھر فرمایا کہ میں نے اس وقت جیسے کہ تمہیں نماز پڑھانی شروع کی، جنت اور دوزخ کی مثال اس دیوار کے قبلہ میں دیکھی، میں نے آج کے دن کی طرح خیر اور شر کبھی نہیں دیکھی (یہ آپ نے) تین مرتبہ (فرمایا): ۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ۔ امام بخاری کے پیش نظر چونکہ حالت نماز میں نظر الی السماء کی ممانعت تھی، جو اگلے باب میں آنے والی بھی ہے، اس لئے بتلایا کہ بحالت نماز نظر الی الامام کی اجازت ہے، اور اس پر "**حین رایتمونی**" سے استدلال کیا ہے اور اس کی اجازت اس لئے بھی ہے کہ امام کی مکمل اتباع کا حکم ہے، اس کی طرف نظر نہ کرے گا تو اتباع نہ ہو سکے گا، پھر یہ امر بھی زیر بحث آ گیا کہ نماز کی حالت میں نظر کہاں رکھنی بہتر ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ مالکیہ نے قول باری تعالیٰ **فول وجهک شطر المسجد الحرام** سے استدلال کیا کہ نمازی نظر اپنے سامنے رکھے، نہ سجدہ کی جگہ پر جو امام ابوحنیفہؒ شافعیؒ واحمدؒ کا مختار ہے۔ زیادہ تفصیل لامع ص۲۹۲/ا میں ہے۔

قولہ **حتی یروہ قد سجد** پر فرمایا کہ یہ بات حضور علیہ السلام کے آخری زمانہ کی ہے جب جسم مبارک بھاری ہو گیا تھا اور ضعف آ گیا تھا، تناولت شیئا پر فرمایا کہ بعض راویوں نے اخذت بھی روایت کیا ہے اور یہ سب راویوں کے تجوزات ہیں۔ کیوں کہ آپ نے صرف ارادہ فرمایا تھا، اس کو لیا نہیں تھا۔ چنانچہ بعض روایات میں اردت بھی وارد ہوا ہے۔

عالم مثال کا ثبوت: **قولہ لقد رأیت الآن منذ صلیت لکم الصلوٰة الجنة و النار ممثلتین الخ** اس پر فرمایا کہ امام بخاری کی اس حدیث سے عالم مثال کا ثبوت واضح طور سے ہوتا ہے، نیز اس کو سمجھ لو کہ عالم غیب عالم مثال کے لئے بمنزلہ مبدأ کے ہے، اور عالم مثال عالم اجسام کے لئے بمنزلہ مبدأ کے ہے، اور ہر مبدأ کے اندر بعد میں ہونے والے تطورات و تغیرات رونما ہوتے ہیں اور وہ اپنے وجود کا کسی نہ کسی درجہ میں ثبوت ضرور دیتے ہیں۔

پھر فرمایا کہ اس تمثل کا ثبوت علاوہ کسوف کے دوسرے واقعہ میں بھی ملتا ہے۔ اور سقراط و افلاطون نے بھی ثبوت عالم مثال کا اقرار کیا ہے، اور ارسطو نے بھی اثولوجیا میں، اور اس میں یہ بھی تحقیق کی کہ افعال باری تعالیٰ معلل بالاغراض نہیں ہیں۔ اور اس کو کما حقہ واضح و محقق کیا ہے، جس طرح سید جرجانی نے حاشیہ حکمۃ العین میں مسئلہ وحدۃ الوجود کو خوب تر واضح و مبین کیا ہے وہ بھی لائق مطالعہ و مراجعت ہے۔

علامہ قرطبی وشاہ ولی اللہ کا ارشاد

حضرت علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم ص ۲/۴۵۶ میں فتح الباری کے حوالہ سے علامہ قرطبیؒ کا قول نقل کیا کہ بموجب مذہب اہل سنت جنت و دوزخ اس وقت موجود ہیں، اور حق تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لئے ایک خاص ادراکی قوت عطا فرمادی تھی۔ جس سے آپ نے ان دونوں کا ادراک حقیقۃً فرمایا ہے۔ پھر علامہ عثمانی نے لکھا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس قصہ کو رویت مثالیہ پر محمول کیا ہے اور باب ذکر عالم المثال میں لکھا کہ احادیث کثیرہ سے یہ امر ثابت ہے کہ اس عالم وجود میں ایک عالم غیر عنصری بھی ہے جس میں معانی اجسام مناسبہ کے اندر متمثل ہوتے ہیں۔ اور وہاں اشیاء کا وجود قبل وجود ارضی ہو جاتا ہے، الخ

باب رفع البصر الی السمآء فی الصلوٰۃ

نماز میں آسمان کی طرف نظر اٹھانے کا بیان

۷۱۱: حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا یحیی بن سعید قال حدثنا ابن ابی عروبۃ قال حدثنا قتادۃ ان انس بن مالک حدثھم قال قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم مابال اقوام یرفعون ابصارھم الی السمآء فی صلوٰتھم فاشتد قولہ فی ذٰلک حتیٰ قال لینتھین عن ذٰلک او لتخطفن ابصارھم

ترجمہ: حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ لوگ یہ کیا کرتے ہیں کہ اپنی نماز میں اپنی نظر آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں، پس اس کے بارے میں آپ کی گفتگو بہت سخت ہوگئی، یہاں تک کہ آپ نے فرمایا کہ اس سے باز آئیں، ورنہ ان کی بینائیاں لے لی جائیں گی۔

تشریح: حدیث الباب میں نماز کے اندر نگاہ آسمان کی طرف اٹھانے کی سخت ممانعت وارد ہوئی، علامہ ابن بطال نے کہا کہ سارے علماء امت کا اس امر کی کراہت پر اجماع ہو چکا ہے، اور نماز کے باہر بھی شریح وغیرہ نے مکروہ ہی کہا ہے، مگر اکثر علماء نے اس کی اجازت دی ہے، کیونکہ جس طرح کعبہ معظمہ نماز کے لئے قبلہ ہے، اسی طرح آسمان دعا کا قبلہ ہے، قاضی عیاض نے کہا کہ نماز کے اندر آسمان کی طرف دیکھنے میں ایک قسم کا اعراض ہے قبلہ سے اور نماز کے دائرے اور ہیئت سے گویا باہر نکلنا ہے۔ کذا فی الفتح۔ حافظ نے یہ بھی لکھا کہ ابن حزم نے افراط کی کہ اس کو حرام قرار دیا اور اس کی وجہ سے نماز کو باطل کہا ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ خارج صلوٰۃ میں دعا کے وقت نظر الی السماء کی اجازت شیخ عابد سندیؒ نے بھی دی ہے، جنھوں نے اسی موضوع پر مستقل رسالہ بھی لکھا ہے۔ اور ایسا ہی علامہ دوانی نے بھی کہا ہے۔

حافظ نے لکھا کہ ایک وجہ ممانعت کی یہ بھی کہی گئی ہے کہ یہ نگاہوں پر شفقت کے لئے ہے کہ نمازیوں پر بحالت نماز میں فرشتے جو انوار کی بارش کرتے ہیں۔ نظریں آسمان کی طرف کرنے میں شدت انوار کی وجہ سے ان کی روشنی سلب ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث اسید بن حضیر سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو فضائل قرآن میں آئے گی۔

حضرت شیخ الحدیث دام ظلہم نے اس پر لکھا کہ ممکن ہے اسی احتمال کے باعث وعید مذکور کو بجائے حرمت کے کراہت پر اتارا گیا ہو گا (لامع ص ۱/۲۹۳) امام ابن ماجہ نے باب الخشوع فی الصلوٰۃ میں حضرت عمرؓ سے حدیث روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا:

اپنی نظریں آسمان کی طرف مت اٹھاؤ۔ ڈر ہے کہ تمہاری بصارتیں اچانک سلب نہ ہو جائیں، یعنی نماز کے اندر (ص ۷۲) اس سے بھی انوار و تجلیات ربانی کے سبب سے سلب بصارت کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ واللہ اعلم

ابن ماجہ میں باب مذکور میں دوسری اور تیسری حدیث حضرت انس و جابر بن سمرہ والی روایت کی ہیں اور حضرت انس والی یہاں بخاری نے روایت کی ہے۔ ابن ماجہ میں اضافہ و تفصیل ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا۔ حضور علیہ السلام نے ایک روز اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی۔ اور جب نماز پوری کر چکے تو فرمایا:۔ لوگوں کا کیا حال ہے کہ وہ اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں، اور پھر غصہ و شدت کے ساتھ فرمایا کہ یا تو وہ ایسا کرنے سے رک جائیں، ورنہ ان کی بصارتیں سلب ہو جائیں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام نے اپنی نماز کی حالت میں ہی صحابہ کرام کی اس حرکت کو ملاحظہ فرما لیا تھا، جیسا کہ آپ فرماتے تھے کہ میں تم کو اپنے پیچھے سے بھی ایسا ہی دیکھتا ہوں جیسے آگے سے۔

ملا علی قاری اور جہت کا مسئلہ

مسلم شریف میں **باب النهی عن رفع البصر الی السماء** کے تحت ابو ہریرہؓ سے حدیث میں **عند الدعاء فی الصلوٰة** کا بھی اضافہ ہے کہ لوگوں کو نماز میں دعا کے وقت اپنی نظریں آسمان کی طرف اٹھانے سے باز آ جانا چاہیئے، ورنہ ان کی بصارتیں سلب ہو سکتی ہیں۔ اور اس روایت کو صاحب مشکوٰۃ نے ذکر کیا ہے، جس پر علامہ ملا علی قاریؒ نے لکھا:۔ خاص طور سے دعاء صلوٰۃ میں اس کی ممانعت اور شدید وعید کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حق تعالیٰ شانہ کا جہت علیا میں ہونے کا ایہام ہوتا ہے، حالانکہ وہ تمام جہات سے منزہ ہے ورنہ یوں نماز میں بغیر دعا کے بھی مطلقا **رفع بصر الی السماء** مکروہ ہے۔ اس صورت میں وعیدِ شدید اور نہی اکید کی وجہ اور بھی زیادہ روشنی میں آ جاتی ہے۔

حق تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے حضرت شیخ المحدثین ملا علی قاری حنفی (م ۱۰۱۴ھ) کو کہ انھوں نے حدیث مسلم کی زیادۃ مذکورہ کی روشنی میں وہ تحقیق فرمائی، جس کی طرف دوسرے شارحین مسلم نے نظر نہیں کی اور احقر نے اس موقع پر بڑے اشتیاق سے شرح نووی و فتح الملہم کو بھی دیکھا مگر کچھ نہ ملا۔

احقر نے جہت کے مسئلہ پر انوار الباری جلد ۱۱ میں کافی لکھا ہے اور یہ بھی لکھا تھا کہ ائمہ مجتہدین نے متفقہ طور سے ذات باری عز اسمہ کو جہت سے مبرا قرار دیا ہے، مگر آٹھویں صدی میں علامہ ابن تیمیہ نے آ کر اس کی بھی مخالفت کی، اور جہاں ان کے سلف و جمہور امت کے خلاف دوسرے اصول و فروع کے تفردات ہیں، ان میں جہت کا مسئلہ بھی ہے، اور آج کل کے حنابلہ نے جہاں دوسرے بہت سے مسائل امام احمد کو علامہ موصوف کی وجہ سے ترک کر دیا ہے (مثلاً طلاق ثلاث وغیرہ) اسی طرح جہت کے مسئلہ میں بھی وہ بے جہت ہو گئے ہیں۔

ہمیں علامہ ابن تیمیہ و علامہ ابن القیم کے فضل و تبحر اور علمی کمالات و خدمات کا پورا اعتراف ہے، مگر کیا کریں کہ ان کے تفردات اور بہت سے مسائل میں مسلک جمہور سلف و خلف سے ان کا انحراف، نیز اکابر امت کے حق میں ان کی درشت کلامیاں اور تیز لسانیاں وغیرہ ہمارے لئے سخت اذیت و کوفت کا سبب بن گئی ہیں۔ واللہ المستعان۔

یہاں یہ بات بھی اپنے ذہنوں میں تازہ کر لیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ نے حدیث بخاری "**وان ربه بينه و بين القبلة**" کی شرح کے وقت فرمایا تھا کہ شرح عقائد جلالی میں لکھا ہے کہ حاجات کیلئے آسمان "قبلۂ شرعیہ" ہے۔ پھر حیرت و تعجب کے ساتھ لکھا کہ ایک حنبلی عالم نے اس کو جہتِ حقیقیہ قرار دیا ہے، حالانکہ اس کو جہت شرعیہ سمجھنا چاہیئے تھا حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ حنبلی عالم ابن تیمیہ ہیں۔

لمحہ فکریہ: حکومت سعودیہ ان لحاظ سے ہزار تحسین وتشکر کی مستحق ہے کہ اس نے حرمین شریفین کا نظم ونسق نہایت اعلیٰ پیمانہ پر اور عمدہ کیا ہے، حجاج کرام کے لئے جو آسائشیں اور سہولتیں مہیا کی ہیں وہ بھی لائق صد مبارکباد ہیں، مگر یہ بات قابل اعتراض بھی ہے کہ وہ حجاز ونجد کی دولت کا بیشتر، معتد بہ حصہ صرف نجدی، وہابی وتیمی عقائد کی نشرواشاعت پر صرف کررہی ہے، حالانکہ اس کے مصرف کا تعین ساری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کے مشورہ ومرضی کے مطابق ہونا چاہیے، کیونکہ دولت سعودیہ سارے دنیائے اسلام کی ایک مرکزی امانت ہیں، ابتداء میں وہاں کی حکومت سعودیہ نے مؤتمر اسلامی منعقد کرکے یہ کوشش کی بھی تھی کہ وہاں کے طرز وطریق حکومت اور دیگر اہم امور کے لئے عالم اسلامی کے اہل حل وعقد کی رائے حاصل کرے، مگر پھر رفتہ رفتہ وہ بجائے ایک عالمی شوروی خلافت یا سلطنت بننے کے۔۔۔۔۔ محض ایک شخصی حکومت بن کر رہ گئی ہے اور حد ہے کہ اس اسلامی مرکزی خطہ میں نجدی وتیمی عقائد کے خلاف کوئی کتاب بھی داخل نہیں ہوسکتی۔ اور اکابر امت کی ایسی کتابوں کے لئے وہاں داخلہ پر بھی سخت پہرہ وپابندی لگی ہوئی ہے۔ نہ وہاں باہر کے مسلمان ہجرت کرکے قیام کرسکتے ہیں، جبکہ شروع تاریخ اسلام سے نجدی حکومت کے زمانی تک برابر ساری دنیائے اسلام کے مسلمانوں کو ہجرت کرکے حرمین شریفین میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت رہی ہے۔

افسوس ہے کہ اب باہر کے جن اعیان کا رابطہ موجودہ سعودی حکومت کے ارکان سے ہے، وہ ایسے امور کی اصلاح کے لئے کوئی جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھاتے۔ ورنہ ہمیں پوری توقع ہے کہ وہاں کی حکومت شریعت مقدسہ کی روشنی میں جو بھی مطالبات واصلاحات پیش کی جائیں گی نہ صرف یہ کہ ان کو ضرور سنے گی بلکہ ان کو منظور کرکے دنیائے اسلام کی رائے عامہ کو ان شاءاللہ مطمئن کرنے کی کوشش کرے گی۔ **وما ذلک علی اللہ بعزیز.**

باب الالتفات فی الصلوٰۃ

نماز میں اِدھراُدھر دیکھنے کا بیان

۷۱۲: حدثنا مسدد قال حدثنا ابوالاحوص قال حدثنا اشعث بن سلیم عن ابیہ عن مسروق عن عآئشۃ قالت سالت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم عن الالتفات فی الصلوٰۃ ھو اختلاس یختلسہ الشیطان من صلوٰۃ العبد

۷۱۳: حدثنا قتیبۃ قال حدثنا سفین عن الزھری عن عروۃ عن عآئشۃ ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم صلے فی خمیصۃ لھا اعلام فقال شغلتنی اعلام ھذہ اذھبوا بھا الیٰ ابی جھم وائتونی بانبجانیتہ

ترجمہ۷۱۲:۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ سے نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی بابت پوچھا، تو آپ نے فرمایا کہ یہ ایک قسم کی چوری ہے، کہ شیطان بندے کی نماز میں سے کرلیتا ہے۔

ترجمہ۷۱۳:۔ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے (ایک روز) ایسے کپڑے میں نماز پڑھی جس میں نقش بنے ہوئے تھے (نماز سے فارغ ہوکر) آپ نے فرمایا، کہ مجھے اس کپڑے کے نقوش نے (اپنی طرف) متوجہ کرلیا اسے ابوجہم (تاجر) کے پاس لے جاؤ اور مجھے انبجانیہ لادو۔

تشریح:۔ امام بخاریؒ نے باب **رفع البصر الی الامام** میں یہ ثابت کیا تھا کہ نماز بحالت اقتداامام کی حرکات وسکنات پر مطلع ہونے کے لئے امام کی طرف نظر والتفات رکھ سکتا ہے، اس سے نماز میں کوئی خلل نہ آئے گا۔ پھر دوسرے باب میں بحالت نماز آسمان کی طرف نظر اٹھانے سے روکا، اور اس سے یہ بھی بعض احادیث کے تحت معلوم ہوا کہ اگر نمازی کا عقیدہ یہ ہو کہ حق تعالیٰ جہت علیا میں یا آسمان پر ہیں، تب تو اس نظر اٹھانے پر سخت وعید بھی ہے، جو خرابی عقیدہ ہی پر ممکن ہے۔ اس کے بعد یہاں امام بخاری ایک تیسری صورت بتلارہے ہیں کہ نمازی اگر بلاضرورت کے ادھر ادھر نظر کرتا ہے تو اس کا یہ فعل شیطانی حرکت ہے کہ شیطان اس طرح سے اس کی نماز کو ناقص بنا کر اس کے اجر وثواب کو کم کرتا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ میرے نزدیک عالم غیب کی ساری چیزیں حقیقت پر مبنی ہیں ان میں تاویل واستعارہ کی گنجائش نہیں ہے، اس لئے اگر کسی کو اپنی التفات والی نماز متمثل کر کے دکھادی جائے تو وہ ضرور اس کو دیکھے گا کہ وہ مختلسہ مجروحہ ہے یعنی جگہ جگہ سے نچی کھسٹی ہوئی، التفات وغیرہ نقائص کی وجہ سے ہے۔

انواع التفات: (۱) نظر سے ملتفت ہونا۔ یہ تو سب کے نزدیک نماز میں جائز ہے اگرچہ خلاف اولیٰ ہے (۲) تحویل وجہ کے ساتھ بلا ضرورت کے سب کے نزدیک مکروہ ہے (۳) سینہ بھی قبلہ سے پھر جائے تو حنفیہ وشافعیہ کے نزدیک مفسد صلوٰۃ ہے، مالکیہ کے یہاں اگر دائیں بائیں مڑ جائے اور دونوں پاؤں قبلہ کی طرف قائم رہیں تو بلاضرورت مکروہ ہے، حنابلہ کے نزدیک اگر بلاضرورت مرض وخوف وغیرہ التفات ہو تو مکروہ ہے اور بطلان صلوٰۃ کا حکم صرف استدبار قبلہ سے ہوگا۔ (الابواب ص۲۸۳/۲)

باب هل يلتفت لامرينزل بهٖ اويرٰى شيئاً او بصاقاً فى القبلة وقال سهل التفت ابوبكر فراى النبى صلى الله عليه وسلم

(اگر نماز میں کوئی خاص واقعہ پیش آجائے یا سامنے تھوک یا کوئی چیز دیکھے' تو کیا یہ جائز ہے' کہ دزدیدہ نظر سے دیکھے
اور سہل کہتے ہیں کہ ابوبکر ملتفت ہوئے تو انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا)

۷۱۴: حدثنا قتيبة قال حدثنا الليث عن نافع عن ابن عمر انه' قال راى رسول الله صلى الله عليه وسلم نخامة فى قبلة المسجد وهو يصلى بين يدى الناس فحتها ثم قال حين انصرف ان احدكم اذاكان فى الصلوٰة فان الله قبل وجهه فلايتخمن احد قبل وجهه فى الصلوٰة رواه موسى بن عقبة و ابن ابى رواد عن نافع

۷۱۵: حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب قال اخبرنى انس بن مالك قال بينما المسلمون فى صلوٰة الفجر لم يفجاهم الارسول الله صلى الله عليه وسلم كشف ستر حجرة عآئشة فنظر اليهم وهم صفوف فتبسم يضحك و نكص ابوبكر علىٰ عقبيه ليصل له الصف فظن انه' يريد الخروج وهم المسلمون ان يفتتنوا فى صلوٰتهم فاشار اليهم اتموا صلوٰتكم وارخى الستر وتوفى من اٰخر ذٰلك اليوم

ترجمہ ۷۱۴:۔ حضرت ابن عمر روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مسجد کے قبلہ (کی جانب) میں کچھ تھوک دیکھا۔ اس وقت آپ لوگوں کے آگے (کھڑے ہوئے) نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے اس کو چھیل ڈالا۔ اس کے بعد جب (نماز سے) فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب کوئی شخص نماز میں ہو تو (یہ خیال کرے کہ) اللہ اس کے سامنے ہے لہٰذا کوئی شخص اپنے منہ کے سامنے نہ تھوکے۔ اس کو موسیٰ بن عقبہ، اور ابن ابی رواد نے نافع سے روایت کیا:۔

ترجمہ ۷۱۵:۔ حضرت انس مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) مسلمان نماز فجر میں (مشغول) تھے، کہ یکایک رسول خدا ﷺ سامنے آ گئے، آپ نے حضرت عائشہؓ کے حجرے کا پردہ اٹھایا، اور مسلمانوں کی طرف دیکھا، اس وقت وہ صف بستہ تھے، پس آپ مسرت کے سبب سے مسکرانے لگے، ابوبکرؓ اپنے پچھلے پیروں ہٹنے لگے، تاکہ آپ کے لئے (امامت کی جگہ خالی کردیں، اور خود) صف میں شامل ہو جائیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ آپ باہر تشریف لانا چاہتے ہیں، اور مسلمانوں نے (خوشی کے باعث) یہ قصد کیا، کہ اپنی نمازوں کو توڑ دیں، مگر آپ نے انھیں اشارہ فرمایا کہ تم اپنی نمازوں کو پورا کرلو اور آپ نے پردہ ڈال دیا، اور اسی دن کے آخر میں آپ نے وفات پائی۔

تشریح: ۔ اس باب میں امام بخاریؒ نے یہ ثابت کیا کہ نماز کی حالت میں کوئی خاص بات نئی پیش آجائے تو اس کی رعایت بھی نماز کی حالت میں کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ اس میں کوئی عمل منافی صلوٰۃ نہ کرنا پڑے جیسا کہ ترجمۃ الباب میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے امامت صلوٰۃ کی حالت میں خلاف توقع حضور علیہ السلام کو مسجد میں نماز کی شرکت کے لئے آتے ہوئے دیکھا تو اس طرف توجہ کی۔ حدیث ص۱۷۵ میں بھی اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے، لیکن حدیث ص۱۷۴ جو امام بخاری یہاں لائے ہیں وہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ **وهو يصلي** کی وجہ سے یہ سمجھ کر لائے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے نماز کے اندر تھوک کو دیوار قبلہ سے ہٹایا ہے، حالانکہ بظاہر واقعہ ایسا نہیں ہے، اور حافظ و عینی نے بھی لکھا کہ روایت الباب بخاری کی ترکیب و ترتیب جمل سے ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے جو بخاری نے سمجھا ہے، مگر امام بخاری خود ہی ابواب قبلہ میں باب حک البزاق کے اندر ص۵۸ میں حضرت مالک بن انسؓ، حضرت عائشہ حضرت ابوہریرہ وابوسعید خدری اور حضرت انسؓ کی روایات لا چکے ہیں۔ جن میں سے کسی ایک میں بھی نماز کا ذکر نہیں ہے، اس لئے بظاہر حضور علیہ السلام نے نماز میں نہیں بلکہ خارج صلوٰۃ ہی ایسا عمل فرمایا تھا۔ پھر بقول حضرت شاہ صاحبؒ راویوں کے تجوازات و تسامحات کی بات ہے کہ الفاظ کو مقدم و موخر کر دیتے ہیں۔ جس سے مطلب خلاف مقصود دوسرا ہو جاتا ہے اور اس پر ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ خاص طور سے زور دیا کرتے تھے کہ سارے طرق روایت اور متون پر جب تک نظر نہ ہو مسائل کا فیصلہ نہ کرنا چاہئے۔ اور ابھی اوپر گزر چکا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ جو راویوں کے سب متون کو صحیح قرار دینے کی سعی فرمایا کرتے تھے، حضرت شاہ صاحبؒ ان کے اس خیال کو ہٹانے کے لئے دلائل و شواہد پیش کیا کرتے تھے، جن کو حضرتؒ بڑی توجہ سے سنتے اور اثر لیا کرتے تھے۔

درحقیقت ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی محدثانہ شان اور تحقیقی تدقیقی نظر ہمارے اکابر دیوبند میں سب سے ممتاز تھے اور ان کا طرز بحث و تحقیق اکابر متقدمین محدثین سے بہت اشبہ واقرب تھا۔ اس سے زیادہ میں کہوں تو شاید چھوٹا منہ بڑی بات سمجھی جائے گی مگر مجھے یقین ہے کہ انوار الباری کی تحقیقی محدثانہ ابحاث پڑھ کر ناظرین حقیقت کو پالیں گے۔ اور اب بھی مجھے بعض علماء وقت نے انوار الباری کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے اس قسم کے احساس و وجدان سے مطلع کیا ہے۔

لہٰذا حدیث ص۱۷۴ میں ترجمہ کی مطابقت فحجا کے ذریعہ نہ ہو سکے گی، اور نہ نماز کے اندر اتنا عمل کثیر درست ہوگا کہ دیوار قبلہ تک جا کر اس سے تھوک وغیرہ صاف کرے، بلکہ نماز کے بعد اس کو صاف کرے گا، جس طرح حضور علیہ السلام نے بھی خارج صلوٰۃ کیا تھا۔

البتہ اسی حدیث میں آگے یہ بھی ہے کہ اگر نماز کے اندر تھوک بلغم کا غلبہ ہو (جیسا کہ شدت زکام و نزلہ میں ہو جایا کرتا ہے تو حکم یہ ہے کہ سامنے قبلہ کی جانب نہ تھوکے بلکہ نیچے قدموں کی طرف یا کپڑے میں بلا عمل کثیر اس کو لے لے، پھر نماز کے بعد اس جگہ یا کپڑے کو صاف کرے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر یہ بھی فرمایا کہ مناجاۃ، اقبال علی اللہ، اور مواجہہ سب ایک ہی شی یعنی تجلی ربانی کی طرف مشیر ہیں۔ یعنی حضرت حق جل ذکرہ کی خاص تجلی حالت نماز میں متوجہ ہوتی ہے، اور اسی لئے نماز مومن کے لئے ایک قسم کی معراج ہے۔ واعلم عنداللہ۔

باب وجوب القرآءة للامام والماموم فی الصلوات کلها فی الحضر والسفر و ما یجهر فیها ومایخافت

(تمام نمازوں میں خواہ وہ سفر میں ہوں یا حضر میں ہوں' سری ہوں' یا جہری' امام اور مقتدی کے لئے قراءت کے واجب ہونے کا بیان)

۷۱۶: حدثنا موسیٰ قال حدثنا ابوعوانة قال حدثنا عبدالملک بن عمیر عن جابر بن سمرة قال شکیٰ اهل الکوفة سعداً الیٰ عمر فعزله' واستعمل علیهم عماراً نشکوا حتیٰ ذکروآ انه' لایحسن یصلی فارسل الیه فقال یاابا اسحاق ان هٰؤلاء یزعمون انک لاتحسن تصلی قال امااناوالله فانی کنت اصلی بهم صلوٰة رسول الله صلے الله علیه وسلم مااخرم عنها اصلی صلوٰة العشآء فارکدفی الاولیین واخف فی الاخریین قال ذاک الظن بک یااباسحاق فارسل معه' رجلاً اورجالاً الی الکوفة یسال عنه اهل الکوفة ولم یدع مسجداً الاسال عنه ویثنون علیه معروفاً حتیٰ مسجد النبی عبس فقام رجل منهم یقال له' اسامة بن قتادة یکنیٰ اباسعدة فقال اما اذنشدتنا فان سعدً الایسیر بالسریة ولایقسم بالسویة ولایعدل فی القضیة قال سعد اماوالله لادعون بثلاث اللهم ان کان عبدک هٰذا کاذباً قام ریآءً وسمعةً فاطل عمره' واطل فقره و عرضه' بالفتن وکان بعد اذاسئل یقول شیخ کبیرمفتون اصابتنی دعوة سعد قال عبدالملک فانارایته' بعد قد سقط حاجاً علیٰ عینیه من الکبیر وانه' لیتعرض للجواری فی الطرف یغمزهن

۷۱۷: حدثنا علی بن عبدالله قال حدثنا سفیٰن حدثنا الزهری عن محمود بن الربیع عن عبادة بن الصامت ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لاصلوٰة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب

۷۱۸: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا یحییٰ عن عبیدالله قال حدثنی سعید بن ابی سعید عن ابیه عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم دخل المسجد قدخل رجل فصلی فسلم علی النبی صلے الله علیه وسلم فردفقال ارجع نصل فانک لم تصل فرجع فصلی کماصلی ثم جاء فسلم علی النبی صلے الله علیه وسلم فقال ارجع فصل فانک لم تصل ثلاثاً فقال والذی بعثک بالحق مآ احسن غیره' فعلمنی فقال اذاقمت الی الصلوٰة فکبرثم اقرأ ما تیسر معک من القران ثم ارکع حتیٰ تطمئن راکعاً ثم ارفع حتیٰ تعتدل قآئماً ثم اسجد حتیٰ تطمئن ساجداً ثم ارفع حتیٰ تطمئن جالساً وافعل فی صلوٰتک کلها

ترجمہ۷۱۶: حضرت جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اہل کوفہ نے حضرت عمرؓ سے سعدؓ کی شکایت کی، تو حضرت عمرؓ نے سعدؓ کو معزول کر دیا، اور عمار کو ان لوگوں کا حاکم بنایا، ان لوگوں نے (سعد کی بہت سی) شکایتیں کیں، یہاں تک کہ بیان کیا کہ وہ نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، تو حضرت عمرؓ نے ان کو بلا بھیجا، اور کہا کہ، اے ابو اسحاق! یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نماز اچھی طرح نہیں پڑھتے، انھوں نے کہا، سنو! خدا کی قسم ان کے ساتھ میں نے ویسی نماز ادا کی ہے، جیسے حضور ﷺ کی نماز ہوتی تھی، چنانچہ عشا کی پہلی دو رکعتوں میں زیادہ دیر لگاتا تھا اور اخیر کی دو رکعت میں تخفیف کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اے ابو اسحاق تم سے یہی امید تھی، پھر حضرت عمرؓ نے ایک شخص یا چند شخصوں کو سعدؓ کے ہمراہ کوفہ بھیجا تا کہ وہ کوفہ والوں سے سعد کی بات پوچھیں (چنانچہ وہ گئے) اور انھوں نے کوئی مسجد نہیں چھوڑی، کہ جس میں سعد کی کیفیت نہ

پوچھی ہو، اور سب لوگ ان کی عمدہ تعریف کرتے رہے یہاں تک کہ بنی عبس کی مسجد میں گئے تو ان میں سے ایک شخص کھڑا ہو گیا، اس کو اسامہ بن قتادہ کہتے تھے، کنیت اس کی ابو سعدہ تھی، اس نے کہا کہ سنو! جب تم نے ہمیں قسم دلائی، تو مجبور ہو کر میں کہتا ہوں کہ) سعد لشکر کے امراہ (جہاد کو خود) نہ جاتے تھے اور غنیمت کی تقسیم برابر نہ کرتے تھے اور فیصلہ میں انصاف نہ کرتے تھے سعد (یہ سن کر) کہنے لگے کہ دیکھ میں تین بد دعائیں تجھ کو دیتا ہوں اے اللہ! اگر یہ تیرا بندہ جھوٹا ہو، نمود و نمائش کے لئے (اس وقت) کھڑا ہوا ہو، تو اس کی عمر بڑھا دے، اور اس کو فقر میں مبتلا کر، اور اس کو فتنوں میں مبتلا کر دے (چنانچہ ایسا ہی ہوا) اور اس کے بعد جب اس سے (اس کا حال) پوچھا جاتا تھا، تو کہتا کہ ایک بڑی عمر والا بوڑھا ہوں، فتنوں میں مبتلا، مجھے سعد کی بد دعا لگ گئی، عبد الملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے اس کو اب دیکھا ہے، اس کی دونوں ابرو اس کی آنکھوں پر بڑھاپے کے سبب سے جھک پڑی ہیں، وہ راستوں میں لڑکیوں کو چھیڑتا ہے، ان پر دست درازی کرتا ہے۔

ترجمہ ۷۱۷: حضرت عبادہ ابن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا، اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو سورۂ فاتحہ نہ پڑھے۔

ترجمہ ۷۱۸: ۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ (ایک مرتبہ) مسجد میں تشریف لے گئے، اسی وقت ایک شخص آیا، اور اس نے نماز پڑھی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کو سلام کیا، آپ نے (سلام کا) جواب دیا، اور فرمایا، کہ جا نماز پڑھ، کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی، وہ لوٹ گیا اور اس نے نماز پڑھی، جیسے کہ اس نے (پہلے) پڑھی تھی، اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جا نماز پڑھ، کیونکہ تو نے نماز نہیں پڑھی (اسی طرح) تین مرتبہ (ہوا) تب وہ بولا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں اس سے بہتر ادا نہیں کر سکتا، لہٰذا آپ مجھے تعلیم کر دیجئے، آپ نے فرمایا کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو، اس کے بعد جتنا قرآن تم کو یاد ہو، اس کو پڑھو، پھر رکوع کرو، یہاں تک کہ رکوع میں اطمینان سے ہو جاؤ، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ سیدھے کھڑے ہو جاؤ، پھر سجدہ کرو، یہاں تک کہ سجدہ میں اطمینان سے ہو جاؤ، پھر سر اٹھاؤ، یہاں تک کہ اطمینان سے بیٹھ جاؤ، اور اپنی پوری نماز میں اسی طرح کرو:

تشریح: قراءت خلف الامام کا مسئلہ زمانہ قدیم سے ہی زیر بحث اور معرکۃ الآراء رہا ہے، اور سب سے پہلے امام بخاری نے اس موضوع پر مستقل رسالہ "قراءۃ خلف الامام" لکھا جو جزء القراءۃ کے نام سے زیادہ مشہور ہوا، اور وہ رسالہ طبع شدہ ہے، ہمارے سامنے بھی ہے، اس کے بعد علماء شافعیہ نے بھی رسائل لکھے، جن میں امام بیہقیؒ کا رسالہ "کتاب القراءۃ" بہت مشہور ہے، اعلاء السنن وغیرہ میں غلطی سے بہ کثرت مواضع میں جزء القراءۃ للبیہقی درج ہو گیا ہے، جبکہ جزء القراءۃ کا انتساب امام بخاریؒ کی طرف اور کتاب القراءۃ کا بیہقی کی طرف معروف و مشہور ہے۔

واضح ہو کہ امام بخاری اور ابن حزم کے علاوہ کسی نے بھی قراءۃ خلف الامام کے وجوب و فرضیت کے لئے اثبات و تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا ہے اور ان دونوں کے سوا کوئی بھی متقدمین و متاخرین کبار امت میں سے امام کے پیچھے جہری نماز میں وجوب قراءۃ کا قائل نہیں ہوا ہے۔ اور امام شافعیؒ کی طرف جو اس کی نسبت کی گئی ہے، وہ بھی تحقیق سے غلط ثابت ہوئی ہے، جس کو ہم واضح کریں گے۔

محدثین متقدمین اور مسئلہ قراءت خلف الامام

محدثین متقدمین میں سے ائمہ حنفیہ و امام مالک و احمدؒ سے تو اس لئے بھی وجوب کی نقل نہیں ہے، کہ وہ بھی وجوب کے قائل نہ تھے، محدث کبیر امام ابن ابی شیبہؒ نے اپنے مصنف میں پہلے بار "من رخص فی القراء ۃ خلف الامام" قائم کر کے ۲۱۔ آثار ذکر کئے، جن میں دو زیادہ ہیں جن سے قراءۃ فاتحہ خلف الامام کا ثبوت مطلقا ہے، جہری نماز کی صراحت نہیں ہے، اور سری میں جواز سے منکر کوئی بھی نہیں ہے۔ اور وجوب و فرضیت کا ثبوت بھی کسی اثر سے نہیں ہوتا، اس کے بعد دوسرا باب انھوں نے "من کرہ القراء ۃ خلف الامام" قائم کر کے ۲۶۔ آثار ذکر کئے ہیں، جن سے امام کے پیچھے قراءت کرنے کی ناپسندگی ملتی ہے یا کہ امام کی قراءۃ مقتدی کے لئے کافی ہے۔

امام ترمذیؒ نے بھی شافعی المذہب ہونے کے باوجود باب القراءۃ خلف الامام کے بعد دوسرا باب ترک القراءۃ کا بھی ذکر کیا، علامہ ابن کثیر شافعی نے اپنی تفسیر میں لکھا کہ مقتدی کا امام کی فاتحہ پر آمین کہنا ہی اس کے لئے قراءت فاتحہ کے قائم مقام ہے غرض شافعیہ کی طرف سے بھی اس معاملہ میں امام بخاری کی طرح شدت نہ تھی، لیکن تقریبا دو سو سال سے جب سے کہ غیر مقلدین نے تقلید وائمہ مجتہدین کے خلاف جھنڈا اٹھایا تو اس قسم کے مسائل کو عوام میں شائع کر کے ان کو مسلک سلف و جمہور سے متنفر بنانے کا محبوب مشغلہ اختیار کیا ہے۔

غیر مقلدین اور حنفیہ

چونکہ ہندوستان میں ہمیشہ حنفی مسلک ہی کی سیادت رہی ہے، اس لئے خاص طور سے اسی کے خلاف پروپیگنڈہ کیا گیا اور قراءۃ فاتحۃ خلف الامام کے مسئلہ پر بھی مستقل رسائل لکھ کر شائع کرائے، اور عوام کو حنفی مذہب سے بدظن کرنے کی مہم چلائی گئی۔ اسی لئے اکابر حنفیہ کو بھی جواب دہی کرنی پڑی۔

حضرت الشیخ المحقق محمد ہاشم سندی م ۱۱۷۴ھ "تنقیح الکلام" لکھی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ م ۱۲۹۷ھ نے توثیق الکلام لکھی، حضرت مولانا احمد علی سہارنپوری م ۱۲۹۷ھ (محشی بخاری) نے الدلیل القوی لکھی، حضرت مولانا عبدالحق لکھنوی م ۱۳۰۴ھ نے امام الکلام اور غیث الغمام لکھی۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی م ۱۳۲۳ھ نے ہدایۃ المعتدی لکھی۔ اور آخر میں ہمارے حضرت علامہ کشمیریؒ نے خاتمۃ الخطاب اور فصل الخطاب دو رسالے لکھے، اور اس سلسلہ میں حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ مولف اعلاء السنن کا رسالہ فاتحۃ الکلام، اور حضرت مولانا محمد سرفراز خاں صفدر دام ظلہم کا رسالہ احسن الکلام بھی دو حصوں میں اعلیٰ علمی و حدیثی تحقیقات اور مسکت جوابات پر مشتمل ہے۔ جزاهم الله خير الجزاء

تفصیل مذاہب: مجموعی اعتبار سے یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جمہور ائمہ کا عدم وجوب قراءۃ خلف الامام پر اتفاق ہے، جبکہ صرف امام بخاریؒ وابن حزم وجوب پر مصر ہیں۔ دیگر تفصیل ملاحظہ ہو:۔ اوجز ص ۲۳۹/۱ میں ہے کہ تمام ائمہ حنفیہ ابن وہب مالکی، اشہب، اوزاعی (فی روایۃ) ثوری، امام احمد (فی روایۃ) ابن المسیب و دیگر تابعین اور عروہ ابن زبیر، سعید ابن جبیر، زہری، شعبی نخعی، ابن ابی لیلیٰ، حسن بن حیی یہ سب جہری و سری دونوں نمازوں میں امام کے پیچھے عدم قراءت کے قائل ہیں۔ امام مالک جہری میں عدم قراءت اور سری میں استحباب قراءۃ کے قائل ہیں، تاکہ مقتدی کا ذہن غیر اللہ کی طرف نہ جائے جہری میں اگر کوئی قراءۃ کر لے تو نماز باطل نہ ہوگی، امام شافعیؒ سے روایت ہے کہ باطل ہو جائے گی۔ امام احمد سے ایک روایت ہے کہ اگر امام کی آواز سننے میں نہ آ رہی ہو تو پڑھ سکتا ہے، امام شافعی کے نزدیک سری و جہری دونوں میں وجوب قراءۃ کا قول مشہور ہو گیا (لیکن یہ غلط ہے، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی)

شیخ محی الدین بن العربی (شیخ اکبر) کے بارے میں حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ گو وہ ظاہری تھے، مگر قراءۃ خلف الامام کے مسئلہ میں امام اعظم وغیرہ کے ساتھ ہیں کیونکہ وہ فرماتے ہیں امام اللہ ہے اس کا کلام پڑھا جا رہا ہے۔ لہٰذا اس کے پیچھے قراءت کیسی؟

حضرت شاہ صاحبؒ کے بعض امالی میں بھی یہی بات ذکر ہوئی ہے کہ امام شافعی کا قول قدیم مثل امام ابوحنیفہؒ مالک واحمد جہری میں عدم وجوب تھا اور اسی پر وہ پچاس سال کی عمر تک رہے، آخر میں جب مصر گئے تو وہاں قراءت کے قائل ہو گئے، پھر نہیں معلوم کہ وجوب کے قائل ہوئے یا صرف استحباب کے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ان کے زمانہ مصر کی کتاب "کتاب الام" ہے جو آخری عمر کی ہے، اور اس کے ص ۸۹/۱ میں ہے کہ ترک قراءت میں عمد و خطا برابر ہے، کیونکہ بغیر فاتحہ کے نماز درست نہ ہوگی، مگر مقتدی کا حکم آگے آئے گا، پھر ص ۹۳/۱ میں ہے کہ منفرد اور امام پر فاتحہ پڑھنا واجب ہے اور مقتدی کا حکم آگے بیان کروں گا، پھر آگے کئی جلدوں میں اس کا بیان نہیں ہے، جس کی وجہ سے مؤلفین نے عدم ذکر و

نسیان وغیرہ کا فیصلہ کیا ہے مگر ساتویں آخری جلد کے ص ۱۵۴ میں امام شافعیؒ کی یہ وضاحت ملتی ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ جس نماز میں امام ایسی قراءت کر رہا ہو جو سنی نہ جاتی ہو تو مقتدی اس کے پیچھے قراءت کر لے یعنی امام کے جہر کی صورت میں اگر آواز سنی جا رہی ہو تو مقتدی کو قراءت کی اجازت بھی نہیں وجوب تو درکنار رہا اور یہ بعینہ وہی مذہب ہے جو امام احمد سے دوسری روایت میں اوپر بیان ہوا ہے۔ اس کے بعد امام شافعی کہتے ہیں کہ "امام کے سکتوں کی حالت میں فاتحہ پڑھے" تو، امام پر ایسے بڑے سکتے کا وجوب ماننا پڑے گا، جس میں مقتدی فاتحہ پڑھ سکے اور اس کا ثبوت شارع علیہ السلام سے نہیں ہو سکا۔

علامہ ابن تیمیہ نے فتاویٰ ص ۲/۱۴۹ اور تنوع العبادات ص ۸۷ میں صراحت کی کہ "امام کی جہری نماز میں مقتدی کے لئے فاتحہ کا وجوب قول شاذ ہے، حتیٰ کہ امام احمدؒ نے اس کے خلاف پر اجماع نقل کیا ہے۔" اگر ان کے نزدیک امام شافعیؒ کا وجوب کا قول صحیح ہوتا تو اس کو شاذ ایسے لفظ سے تعبیر نہ کرتے، البتہ اس سے اشارہ امام بخاری و ابن حزم ظاہری کی طرف ہو سکتا ہے۔

ارشاد امام احمد: امام ترمذی نے امام احمدؒ کا قول نقل کیا کہ حدیث نبوی " **لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** " کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی تنہا ہو تو اس کی نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی، پھر امام احمد نے حضرت جابرؓ کا قول پیش کیا جس میں ہے کہ جو شخص نماز کی کوئی رکعت بغیر قراءت فاتحہ پڑھے تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، اور اس کو پیش کر کے امام احمد نے فرمایا کہ دیکھو یہ صحابی رسول ہے جس نے حدیث نبوی کا وہی مطلب لیا جو ہم نے ذکر کیا ہے کہ وہ تنہا نماز والے کے لئے ہے۔ ترمذی (باب ترک القراءۃ خلف الامام)

اس کے بعد ترمذی نے لکھا کہ امام احمد باوجود اس کے بھی قراءۃ خلف الامام کے قائل تھے، لیکن یہ مطلق طریقہ سے غلط ہے، کیونکہ وہ تو صرف سری میں جواز کے قائل تھے اور جہری میں صرف اس وقت کہ امام کی قراءت کی آواز نہ سنے، اور بڑا اختلافی نقطہ صرف جہری میں ہے، اور سری کا معاملہ تو اور بھی زیادہ اہون ہے۔

جو بات اوپر امام احمد سے امام ترمذی نے نقل کی ہے، وہی ایک راوی حدیث سفیان بن عیینہ **"لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعدا"** نے کہی کہ یہ حکم نبوی تنہا نماز والے کے لئے ہے (ابوداؤد ص ۱/۱۱۹ باب ترک القراءۃ) اور محدث اسماعیلی نے بھی یہی کہا ہے (عمدہ ص ۳/۶۹) غرض ان تینوں جلیل القدر محدثین نے وہ فیصلہ دیا جو امام بخاری و ابن حزم کے اطلاقی و عمومی فیصلہ کے خلاف ہے۔

مغنی ابن قدامہ میں ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا:۔ اس امر پر اجماع ہے کہ آیت استماع و انصات نماز کے بارے میں اتری ہے اور اس پر بھی اجماع ہے کہ مقتدی پر حالت جہر میں امام کے پیچھے قراءت کرنا واجب نہیں، اور یہ بھی امام احمدؒ نے فرمایا کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کے بارے میں نہیں سنا کہ وہ یہ کہتا ہو کہ جہر امام کی صورت میں مقتدی کی نماز بلا قراءت کے نہ ہوگی، پھر فرمایا کہ یہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے، اور آپ کے سارے صحابہ و تابعین ہیں، اور حجاز کے امام مالک، عراق کے ثوری، شام کے اوزاعی، مصر کے لیث ہیں، ان میں سے کسی نے بھی ایسے شخص کی نماز کو باطل نہیں قرار دیا جس نے اپنے قاری امام کے پیچھے قراءت نہ کی ہو۔ (مغنی ابن قدامہ ص ۱/۶۰۲، فتح الملہم ص ۲/۲)

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ جن احادیث سے مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے واجب و فرض بتایا جاتا ہے وہ امام احمد کے نزدیک صحیح نہیں ہیں اور جو صحیح ہیں وہ منفرد اور امام کے حق میں ہیں۔ مقتدی کے بارے میں نہیں ہیں۔ طرفین کی پیش کردہ احادیث پر جو تفصیلی بحث و نظر اکابر امت نے کی ہے، اس سے بھی امام احمد کے ارشاد کی صحت ثابت ہوتی ہے۔

امام شافعی جمہور کے ساتھ ہیں:۔ اس سے ثابت ہوا کہ امام احمدؒ کے نزدیک امام شافعیؒ بھی آخر تک کسی وقت بھی وجوب قراءۃ فاتحہ خلف الامام کے قائل نہیں ہوئے، امام احمدؒ کا امام شافعیؒ سے بہت ہی قریبی تعلق تھا اور وہ ان کے مذہب سے بھی پوری طرح واقف تھے، اور آپ کی وفات بھی امام شافعی سے ۳۷ سال بعد ہوئی ہے گویا امام احمدؒ کے وقت تک کوئی بھی ایسی قابل ذکر ہستی نہیں تھی، جو اجماع کے خلاف وجوب فاتحہ

خلف الامام کی قائل ہو، لہٰذا امام شافعی کا جو جدید مذہب وجوب کا مشہور کیا گیا، وہ صحیح نہیں تھا، اور یہ مغالطہ صرف اس لئے کچھ بڑوں کو ہوا تھا کہ انھوں نے امام شافعی کی کتاب الام کو قدیم کتابوں میں سے سمجھ لیا تھا۔ پھر بعد والے بھی پہلوؤں کی وجہ سے مغالطہ میں پڑ گئے۔ واللہ تعالےٰ اعلم۔

محترم علامہ ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب صفدر عمّ فیضہم نے لکھا کہ اصل غلطی امام الحرمین جوینی شافعی م ۴۷۸ھ (استاذ امام غزالی شافعی م ۵۰۵ھ) سے ہوئی کہ انھوں نے کتاب الام کو امام کی کتب قدیمہ میں سے سمجھ لیا۔ پھر دوسرے علماء بھی ان کی وجہ سے مغالطہ میں پڑ گئے، اور نتیجہ میں امام شافعیؒ کا مسلک بھی غلط طور سے نقل ہونے لگا۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ ص ۲۵۲/۱۰ میں یہی بات لکھی ہے، اور علامہ سیوطیؒ نے بھی حسن المحاضرہ ص ۱۲۲/۱ میں کتاب الام کو امام شافعیؒ کے زمانۂ قیام مصر کی تالیف قرار دیا ہے، لہٰذا یہ پوری طرح ثابت ہو گیا کہ فاتحہ خلف الامام کا ترک امام شافعی کا قول جدید ہے قدیم نہیں۔ (احسن الکلام ص ۱/۱۱)

علامہ بنوریؒ نے بھی معارف السنن ص ۱۸۵/۳ میں لکھا کہ امام شافعی کے قول قدیم وقول جدید دونوں سے مقتدی کے لئے عدم جواز فاتحہ ہی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ الاملاء بھی بقول نوویؒ امام کی جدید تصانیف میں سے ہے، اور اس میں بھی ترک فاتحہ ہی ہے۔

علامہ بنوریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے کتاب الام میں مقتدی کا حکم نہیں ملا، اس لئے کہ موصوف کا ذہن جلد سابع کی طرف نہیں گیا ہوگا لیکن اس بات پر حیرت ہے کہ صاحب المہذب نے ''الام'' کے حوالہ سے امام شافعی کی طرف وجوب کیسے منسوب کر دیا؟!

غیر مقلدین کا زعم باطل

اوپر کی تفصیل سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ موجودہ دور کے اہل حدیث حضرات (غیر مقلدین) جو یہ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے اگر مقتدی نے فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز باطل اور کالعدم ہوگی، جن کے جواب میں احسن الکلام وغیرہ لکھی گئی ہیں، یہ ان کا دعوے بقول امام احمدؒ کے سراسر غلط اور ناقابل قبول ہے، اور اگر ان کو اس دعوے کی صداقت کے لئے کوئی تائید مل سکتی ہے تو ساری امت میں سے صرف امام بخاری اور ابن حزم سے، اور ان کے دلائل کا رد پہلے بھی ہو چکا ہے اور مختصراً ہم بھی یہاں کریں گے۔ ان شاءاللہ

امام بخاریؒ کا دعوے اور دلیل

آپ نے باب قائم کیا کہ ''ساری نمازوں کے اندر خواہ وہ حضر کی ہوں یا سفر کی اور خواہ وہ جہری ہوں یا سری، امام اور مقتدی دونوں پر قراءت کرنا واجب ہے'' اسی طرح ابن حزم نے اپنی ''محلی'' میں دعوے کیا ''سورۂ فاتحہ کی قراءت ہر نماز کی ہر رکعت میں فرض ہے، امام پر بھی اور مقتدی پر بھی، اور اس حکم میں فرض ونفل اور مرد وعورت سب برابر ہیں۔'' (انوار المحمود ص ۲۹۸/۱)

احادیث بخاری: یہاں چونکہ ہم شرح بخاری کر رہے ہیں اس لئے عرض ہے کہ امام بخاری نے اپنے اتنے بڑے دعوے پر دلیل کیا دی ہے، ملاحظہ ہو، پہلی حدیث الباب میں حضرت سعد کے بارے میں اہل کوفہ کی شکایت کا بیان ہے، اس میں حضرت سعد کی قراءت کا بیان ہے، مقتدی کا کچھ نہیں، پھر دعوے سے دلیل کی مطابقت کیا ہوئی؟ دوسری میں ضرور حضرت عبادہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی، اور یہ سب کو تسلیم ہے کہ امام ومنفرد پر سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب ہے، اور مقتدی پر جہری نماز میں کسی کے نزدیک بھی واجب نہیں، اور حسب تحقیق امام احمد، سفیان بن عیینہ وزہری حدیث مذکور کا تعلق صرف امام ومنفرد سے ہے۔ مقتدی کو اس حکم میں اس لئے داخل نہیں کیا کہ حضرت جابر بن عبداللہ صحابی سے مرفوعاً وموقوفاً دونوں طرح سے یہ حدیث ثابت ہوئی کہ جو شخص کسی رکعت میں فاتحہ نہ پڑھے، اس کی نماز نہ ہوگی، الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، (موطأ امام مالک۔ ترمذی وطحاوی)

احادیث جزءالقراءۃ

اصل صورت یہ ہے کہ امام بخاری اپنی شرط بخاری سے مجبوری کے باعث یہاں حضرت عبادہ کی محمد بن اسحٰق والی روایت کی پیش نہیں کر سکے اور درحقیقت ان کا مقصد اسی سے حاصل ہو سکتا ہے، کیونکہ اس میں امام کے پیچھے بھی قراءۃ فاتحہ کی گنجائش نکلتی ہے اگرچہ وجوب تو پھر بھی نہیں نکلتا۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے پہلے تو امام کے پیچھے قراءت کرنے والوں کو روکا اور ان کے اس عمل پر ناپسندیدگی ظاہر فرمائی، پھر یہ بھی فرمایا کہ اگر تمہیں قراءت کرنی ہی ہے تو فاتحہ پڑھ سکتے ہو، لیکن چونکہ یہ روایت محمد بن اسحٰق کے واسطہ سے ہے اور وہ بہت ضعیف و مجروح راوی ہیں اس لئے وہ روایت صحیح بخاری کے لئے موزوں نہ تھی، اور امام ترمذی نے بھی حضرت عبادہ کی دونوں روایت نقل کر کے دوسری روایت زہری کو محمد بن اسحٰق والی روایت سے اصح بتلایا ہے اگرچہ امام ترمذی سے یہ غلطی بھی ہو گئی کہ آگے انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ امام مالک و ابن مبارک و شافعی و احمد و اسحاق کا مذہب بھی خلف الامام قراءت کرنے کا ہے، حالانکہ یہ خلاف واقع ہے، کیونکہ امام مالک جہری میں قراءۃ خلف الامام سے منع کرتے ہیں (موطا ص ۲۸ باب القراءۃ خلف الامام فیما لا یجهر فیه بالقراءۃ) قید لگادی عدم جہر کی۔ اور مدونہ مالکیہ ص ۱/۷۰ میں یہ بھی ہے کہ وہ سریہ میں وجوب کے قائل نہ تھے، ابن مبارک بھی جہریہ میں قراءت کے قائل نہ تھے، اور خود امام بخاری نے جزءالقراءۃ میں ان کا مذہب بھی خارج میں مخالفت کا ہی ثابت ہو چکا ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے کتاب الآثار کی تعلیقات میں ان کا مذہب فقط سریہ میں قراءۃ کا ذکر کیا ہے۔ امام احمد کی مخالفت کا ذکر خود ترمذی کے حوالہ سے بھی آچکا ہے۔ محمد بن اسحٰق کا مذہب بھی خارج میں مخالفت کا ہی ثابت ہو چکا ہے، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے کتاب الآثار کی تعلیقات میں ان کا مذہب امام مالک سے موافق نقل کیا ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں امام ترمذی سے نقل مذہب میں تسامح ہو گیا ہے، الا یہ کہ ان حضرات سے فی الجملہ کسی نہ کسی درجہ میں قراءت فاتحہ خلف الامام کا ثبوت مان لیا جائے، مثلاً سریہ میں جواز یا استحباب فاتحہ، یا سکتات میں۔

غرض امام بخاری یہاں تو عبادہ والی روایت ابن اسحٰق والی لا نہیں سکے۔ مگر اس کو اپنے رسالہ جزءالقراءۃ میں بڑے زور شور سے لائے ہیں اور محمد بن اسحٰق جیسے ضعیف و مجروح راوی کی توثیق کی بھی سعی مشکور فرما دی ہے جو امام بخاری کی جلالت قدر سے مستبعد تھی، مگر ان کو تو اپنی ایک الگ اجتہادی رائے کو ثابت کرنا تھا، وہ کر گئے۔

امام بخاری کی تیسری حدیث الباب سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے نماز میں کچھ حصہ قرآن مجید کا پڑھنے کا حکم دیا جتنا بھی آسان ہو، اور وہ بھی ایک منفرد آدمی کے لئے، اس سے امام کی اقتدا میں قراءت کرنے کا اور وہ بھی قراءت فاتحہ کا ثبوت کیونکر ہو گیا، جس کے لئے ساری کوششیں اپنے رسالہ میں کی ہیں، لیکن امام بخاری ماشاء اللہ نہایت ذہین و زیرک اور متیقظ ہیں، انھوں نے یہاں بخاری کے ترجمۃ الباب میں خود ام الکتاب کا ذکر نہیں کیا، اس کو اپنے دل میں ہی رکھا، اور قراءۃ کا لفظ لائے، جس کی مطابقت تیسری حدیث سے ہو گئی۔

لمحہ فکریہ: بخاری ص ۱۰۴ کے حاشیہ ص ۹ میں جو شافعیہ کو اس مسئلہ میں مقابل ٹھیرا کر جواب دہی کی گئی ہے، وہ بے محل ہے، جیسے کہ بات پوری طرح منقح ہو گئی ہے، فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں ہمارے مقابل سابقین میں سے قابل ذکر صرف امام بخاری و ابن حزم ظاہری ہیں (اور ہم نے ثابت کیا تھا اور آگے بھی واضح کریں گے ان شاء اللہ کہ امام بخاری بھی ظاہری ہیں) ان کے بعد اس زمانہ کے اہل حدیث (غیر مقلدین) ہیں، جن کا کام صرف مغالطے دینا اور سب ائمہ کرنا اور تفریق کلمہ مسلمین ہے۔ اللہ یرحمنا وایاھم

ارشاد انور: حضرتؒ نے اس موقع پر درس بخاری شریف میں فرمایا تھا کہ امام بخاری نے اپنے رسالہ جزءالقراءۃ میں کچی پکی حدیثیں ذکر کی ہیں اور سخت کلامی کی ہے اور بعض چیزیں غلط بھی ہیں، مثلاً یہ کہ رکوع میں شامل ہونے والے کو رکعت نہیں ملی، حالانکہ یہ کسی کا بھی مذہب نہیں ہے، اور صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے ادراک رکعت و ادراک الرکوع پر۔ پھر فرمایا کہ سری نماز میں حنفیہ سے استحباب ہے (کما فی الہدایہ عن الامام محمدؒ) اور شیخ

ابن الہمام نے انکار کر دیا کہ موطأ اور کتاب الآثار میں نہیں ہے، میں کہتا ہوں کہ قول ہدایہ کا ہی درست ہے، کیونکہ اول تو ان دونوں کتابوں پر حصر نہیں ہے، دوسرے یہ ضروری نہیں ہے، کہ ہر بات کتابوں میں بھی ہو، بلکہ محض شہرت ونقل بھی کافی ہے۔ اس کے بعد حضرت نے اپنے رسالہ فصل الخطاب میں سے پڑھ کر سنایا، یہ بھی فرمایا کہ پانچویں صدی کے ہیں (م ۴۸۰ھ) باقی تفصیل فصل ص ۹۴ میں دیکھی جائے۔

پھر فرمایا کہ شیخ ابن الہمام نے سری وجہری میں قراءت کو مکروہ تحریمی کہہ دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت میں انفصال ہے یعنی دونوں کا حکم الگ الگ ہے، اور سری میں مکروہ نہیں ہے نہ تنزیہی نہ تحریمی۔ پس قول ابن الہمام جس پر آج کل کے حنفیہ چل رہے ہیں بمقابلہ قول سلف جس کا حوالہ میرے رسالہ میں ہے۔ میرے نزدیک مرجوح ہے۔ اور مقتدی کے مسئلہ میں جمہور حنفیہ کے ساتھ ہیں۔

تعامل صحابہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ آثار صحابہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نے قراءۃ خلف الامام کو بالکلیہ ترک کیا ہے، اور بعض نے جہری نماز میں ترک کیا ہے اور بعض نے کبھی جہریہ میں قراءت کی اجازت دی ہے اور کبھی نہیں دی جیسے حضرت عمر وابو ہریرہ نے۔ بعض نے اس کو مؤکد طریقہ سے مستحب سمجھا جیسے حضرت عبادہ نے، بعض نے سکتات کے اندر اس کی اجازت دی، اور وہ تو بہت ہی کم ہیں جنھوں نے جہریہ میں اس کو واجب قرار دیا ہو یا مؤکد سمجھا ہو جیسے مکحول نے (ابوداؤد) حاصل یہ کہ سب سے کم تو وہ ہیں جو جہری میں امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے، ان سے کچھ زیادہ وہ تھے جو سکتات میں پڑھتے تھے پھر ان سے بھی زیادہ وہ تھے جو سریہ میں پڑھتے تھے، جہریہ میں نہیں پڑھتے تھے، یہی سب سے زیادہ تھے، اور کچھ وہ بھی تھے جو کبھی سریہ میں پڑھتے اور کبھی ترک کرتے تھے۔ (فصل الخطاب ص ۳ وغیرہ)

ذکر احادیث: فرمایا کہ احادیث مرفوعہ میں سے کسی سے وجوب قراءۃ خلف الامام ثابت نہیں ہوتا، نہ جہریہ میں نہ سریہ میں۔ اور صحابہ سے بھی صرف کسی ایک جانب کی ترجیح ہی ثابت ہو سکتی ہے، پھر یہ کہ شارع علیہ السلام کی جانب سے ابتدائی واصولی طور سے مقتدی کے حق میں نہ قراءت فاتحہ کی تشریع ہوئی ہے نہ کسی سورت کے پڑھنے کی، نہ جہریہ کے اندر نہ سریہ میں۔ بلکہ جب بعض صحابہ کی طرف سے قراءت خلف الامام ظاہر ہوئی تو حضور علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا، گویا آپ اس سے پہلے ان کی قراءت کی طرف سے خالی الذہن تھے، اور جب ان میں سے کسی نے آپ کے پیچھے قراءت کی تو آپ کو نماز کے اندر ہی اس سے خلجان پیش آیا، اور ذہن مبارک میں الجھن پیدا ہوئی (کیونکہ خود آپ کے ارشاد سے ہی ثابت ہے کہ آپ پر آپ کے مقتدیوں کی ہر حرکت روشن ہوتی تھی حتی کہ ان کا قلبی خشوع وخضوع بھی، بخاری ص ۱۰۲ میں بھی حدیث گذری ہے کہ (واللہ ما یخفی علی رکوعکم ولا خشوعکم و انی اراکم من وراء ظھری) پھر ظاہر ہے کہ جس مقتدی صحابی نے آپ کی قراءت کے ساتھ ساتھ قراءت کی ہوگی خواہ سری نماز میں یا جہری میں تو اس سے آپ کی خلش وخلجان ذہنی آپ کے لئے فطری امر تھی۔

سؤال کی شان: اسی لئے آپ نے نماز کے بعد سوال فرمایا کہ کس نے میرے پیچھے نماز کے اندر قراءت کی ہے؟

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابہ کرام کو بہت زیادہ اور خاص اہتمام صرف فاتحہ پڑھنے کا نہ تھا، چنانچہ آتا ہے کہ ایک صحابی نے آپ کی اقتدا کر کے سورۂ سبح اسم ربک الاعلی پڑھی اور بعض نے تشہد پڑھا، گویا خود ہی انھوں نے جو سمجھ میں آیا پڑھا، حضور علیہ السلام کی طرف سے نہ فاتحہ پڑھنے کی تلقین وتشریع تھی نہ سبح اسم کی نہ تشہد کی، اور اگر منازعت کی صورت پیش نہ آتی تو سرے سے قراءت خلف الامام کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا، خصوصاً جبکہ یہ بھی ثابت ہے کہ ابتداء اسلام میں جب نماز کے اندر مقتدی بھی قراءت کیا کرتے تھے تو قرآن مجید کی آیت فاذا قرئ القرآن فاستمعوا لہ و انصتوا نازل ہوئی اور خاص طور سے نماز کے اندر قرآن مجید کی قراءت کے وقت اس کو کان لگا کر سننے اور خاموش رہنے کا حکم آ گیا تھا، امام احمدؒ وغیرہ اکابر امت نے تصریح کی ہے کہ آیت مذکورہ نماز کی قراءت کے بارے میں اتری ہے۔

قراءۃ سے اعتذار: غرض کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم[1] کے علم مبارک میں یہ بات آئی کہ اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو امام کے پیچھے قراءت

---

[1] یہ حدیث ابوداؤد باب من ترک القراءۃ فی صلوٰۃ میں حضرت عبادہؓ سے مروی ہے، اور نسائی میں بھی ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کرتے ہیں تو آپ نے سوال فرمایا کہ کس نے ایسا کیا؟ جواب میں کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے قرائۃ کی ہے مگر ہذاً کی ہے یعنی بہت تیزی سے پڑھا ہے، گویا یہ بطور اعتذار کے کہا کہ ہمارا دھیان حضور کی قراءت کی طرف سے زیادہ نہیں ہٹا، بہت ہی معمولی وقفہ لگا جس میں تیزی سے کچھ پڑھ لیا۔ (یہ سمجھ کر کہ بغیر قرائۃ کے یا بغیر فاتحہ کے نماز صحیح نہ ہوگی) حضور علیہ السلام نے یہ سن کر فرمایا کہ اگر تمہیں ضرور ہی پڑھنا ہے تو خیر صرف سورۂ فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے تو آپ کے اس طرح ارشاد فرمانے سے صرف اباحۃ مرجوحہ کی صورت نکل سکتی ہے۔

لہٰذا امام بخاریؒ وابن حزم اور آج کل کے اہل حدیث حضرات کے لئے یہی غنیمت ہے کہ اس سے اباحۃ ثابت ہوگئی، لیکن وجوب وفرضیت ممکن نہیں۔ کیونکہ سوال کی صورت ہی بتلا رہی ہے کہ شارع علیہ السلام کو اس کی اطلاع بھی نہ تھی چہ جائیکہ آپ کے حکم سے ایسا ہوا ہوتا لہٰذا نفس سوال کرنا ہی اس کی ناپسندیدگی کو ظاہر کر رہا ہے۔ پھر اس کے بعد وہ اباحت مرجوحہ بھی ختم ہوگئی جیسا کہ سنن کی دوسری حدیث ابی ہریرہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے استنکار کے بعد فقہائے صحابہ تو سارے ہی جہری نماز میں قراءۃ خلف الامام سے رک گئے، پھر کچھ اقل قلیل رہ گئے ہوں گے۔

امر خیر محض سے روکنا: حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ یہاں ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ کسی امر خیر محض سے روکنے کا حق صرف صاحب وحی کو ہے، چنانچہ حضرت علیؓ کا واقعہ آتا ہے کہ آپ نے عیدگاہ میں ایک شخص کو نفل پڑھتے دیکھا، لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ آپ اس کو منع نہیں کرتے؟ آپ نے فرمایا:۔ میں نے رسول اکرم ﷺ کو تو یہاں نفل پڑھتے بیشک نہیں دیکھا، لیکن اس کو منع اس لئے نہیں کرتا کہ کہیں آیت کریمہ "ارأیت الذی ینھی عبداً اذا صلے" کا مصداق نہ بن جاؤں،

عورتوں کی نماز جماعت میں شرکت

اسی طرح حضور علیہ السلام نے عورتوں کو جماعت کی نمازوں میں شرکت کی رغبت نہیں دلائی تھی، تاہم ان کو اس سے روکا بھی نہیں، اور اسی لئے حضرت عمرؓ نے بھی آپ کے طریقہ کی رعایت فرمائی کہ اپنی بیوی کو جماعت مسجد میں جانے سے نہیں روکا حالانکہ آپ کو ان کا گھر سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) مگر بلا تفصیل وقصۂ مذکورہ کے، نیز نسائی نے دوسرا باب ترک قرائۃ فی الجھر بہ قائم کر کے حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث بھی روایت کی جس میں اسی طرح سوال فرمایا اور ایک شخص نے کہا کہ میں نے قراءۃ کی ہے تو فرمایا اسی لئے تو میں دل میں سوچ رہا تھا کہ مجھ سے قرآن مجید کیوں چھینا جا رہا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام کا یہ فرمان سننے کے بعد سب لوگ جہری نمازوں میں حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءۃ سے رک گئے۔ ابوداؤد نے بھی اس قول کو حضرت ابو ہریرہؓ ہی کی طرف منسوب کیا ہے اور دوسرے اکابر محدثین اور علامہ ابن تیمیہ نے بھی یہی کہا ہے، مگر امام بخاری نے اس بات کو کمزور دکھلانے کے لئے جزء القراءۃ ص ۱۳ میں لکھا کہ یہ زہری کا قول ہے (حضرت ابو ہریرہؓ کا نہیں) مزید بحث ہم آگے کریں گے جب امام بخاری کے رسالہ کی باتوں کا مکمل جواب آئے گا۔ ان شاء اللہ

المعجم المفھرس کا ذکر: یہ کتاب ۳۳ سالہ محنت وریسرچ کے بعد مستشرقین یورپ نے لیدن (ہالینڈ) سے شائع کی ہے، کاغذ طباعت ٹائپ وجلد یں بھی نہایت دیدہ زیب ہیں، سات جلدوں میں حروف تہجی سے ۹ کتب حدیث (صحاح ستہ، دارمی، موطأ مالک ومسند احمد) کے الفاظ حدیث کی نشان دہی کی ہے۔ اس ریسرچ اور طباعت وغیرہ پر لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہوگا۔ کیونکہ یورپ کے مستشرقین کی تنخواہیں بھی دس بیس ہزار روپے ماہوار تک کس سے کم کیا ہوں گی۔ مگر مراجعت کے بعد اس میں نقائص پائے گئے، مثلاً آج ہی ھذًا کی تلاش کی تو ص ۸۰/۷ پر ابوداؤد کے مذکورہ لفظ ھذًا کا حوالہ نہیں ہے۔ شاید ابوداؤد کے اس ھـــــذًا کو ہذا ہی سمجھ لیا ہوگا۔ درحقیقت دنیاوی طمع یا دنیا کی نام ونمود کے لئے کوئی کام کرنے اور خلوص وللّٰہیت کے جذبہ سے کام کرنے میں بڑا فرق ہے۔ ہمارے مولانا عبدالعزیز صاحب گوجرانوالہ کی "نبراس الساری فی اطراف البخاری" کی صحیح قدر اس معجم کو دیکھنے کے بعد ہوئی۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

امام بخاری کے جزء القراءۃ ص ۸ میں بھی انا لــھـذًا ھـذًا روایت کیا ہے، فتح الملہم ص ۲/۲۶ میں ترمذی وغیرہ کی طرف اس کی نسبت کی ہے مگر مطبوعہ ترمذی اور دوسری کتب صحاح میں نہیں ملی بجز ابوداؤد کے۔ جس کا حوالہ حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی درس میں دیا تھا پس وہی صحیح ثابت ہوا

التاج الجامع الاصول ص ۱/۱۵۷ میں بھی سنن اربعہ کا حوالہ دیا ہے، مگر ابوداؤد کے علاوہ سنن میں نہیں ہے، البتہ مسند احمد میں ہے، ملاحظہ ہو الفتح الربانی ص ۳/۱۹۴ مگر اس میں ھذًا کی جگہ ہذا چھپ گیا ہے۔ واللہ اعلم "مؤلف"

مسجد میں جانا سخت ناپسند تھا، اور دل سے چاہتے تھے کہ وہ گھر ہی میں نماز پڑھیں، مسجد نہ جایا کریں۔ اور اس بات کو ان کی زوجہ مطہرہ بھی جان چکی تھیں، لیکن ان سے کہتی تھیں کہ آپ مجھے روک دیں تو رک جاؤں گی، حضرت عمرؓ مزاج نبوی کے پوری طرح واقف اور اس کی رعایت و اتباع کرنے والے تھے، چنانچہ زبان سے روکنے سے ہچکچاتے تھے، اور زوجہ محترمہ آپ کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتی رہیں تا آنکہ حضرت عمرؓ نے یہ ترکیب کی کہ ایک روز صبح کی نماز کے لئے جب وہ اندھیرے میں مسجد نبوی جارہی تھیں، ان کے پیچھے ہولئے، اور کہیں موقع پاکر ان کی چادر پر پاؤں رکھ دیا، اس سے وہ سمجھیں کہ کسی نے بری نیت سے ایسا کیا ہے، چنانچہ اناللہ پڑھتی ہوئی گھر لوٹ گئیں اور کہا کہ واقعی! زمانہ بہت خراب ہوگیا ہے اور حضرت عمرؓ کی رائے صحیح ہے۔

نماز اوقات مکروہہ: اسی طرح اوقات مکروہہ میں نماز پڑھنے کا مسئلہ بھی ہے کہ بعض حضرات فقہاء نے ان اوقات کی کراہت کا خیال کر کے ان اوقات میں نماز سے روک دیا ہے اور دوسرے فقہاء نے نماز ایسی خیر محض سے روکنا پسند نہ کیا اور اجازت دے دی۔

حضرتؒ نے ان مثالوں کے بعد فرمایا کہ ایسا ہی معاملہ قرآن مجید پڑھنے سے روکنے کا بھی ہے کہ وہ خیر موضوع ہے اور اس سے روکنا محل تامل و تردد ہے، اسی لئے جب کہ حضور علیہ السلام نے ان کو امام کے پیچھے قراءت کا کوئی حکم بھی نہیں دیا تھا۔ اور پھر بھی انھوں نے خود سے ہی پڑھا تو آپ اس سے راضی نہ ہوئے اور سوال وغیرہ کر کے اپنی ناپسند کا اظہار بھی فرمادیا مگر ان کو صاف طور سے روکا بھی نہیں، اور اس کا تحمل فرمالیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک قرأۃ خلف الامام (جہریہ نماز) کا مسئلہ حضور جماعات للنساء جیسا ہی ہے اور دونوں کی اباحت بھی ایک ہی درجہ کی ہے۔ پھر جس کا جی چاہے اس کو ترک کرے اور جو چاہے اس میں غلو کرے اور اس سے اقرب واشبہ فقیہ حنفی علامہ حلوانی کا فتویٰ ہے کہ عام لوگوں کو نماز سے نہ روکا جائے خواہ وہ مکروہ اوقات ہی میں پڑھیں، کیونکہ وہ اگرچہ ہمارے مذہب میں مکروہ ہے مگر شافعیہ کے مذہب میں تو جائز ہے، اور ممکن ہے کہ وہ روکنے سے نماز کو بالکل ہی ترک کر بیٹھیں، اس سے تو اچھا ہی ہے کہ اپنی نماز کراہت کے ساتھ پڑھ لیں۔

میں کہتا ہوں کہ نمازوں کے بارے میں اس قسم کی سستی اور تہاون حضرت امام ابوحنیفہؒ کے زمانہ میں نہ ہوا تھا، اس لئے ان کے لئے یہی مناسب تھا کہ اوقات کراہت میں پڑھنے سے روکیں، پھر جب مذاہب کی اشاعت ہوئی اور لوگوں کو دوسرے مذاہب کی رخصتیں بھی معلوم ہوگئیں اور یوں بھی نماز میں غفلت اور تکاسل وغیرہ ہونے لگا، اور دینی امور پر عمل میں سستی آتی گئی تو فقہاء متاخرین نے یہی مناسب خیال کیا کہ عام لوگوں کو نماز وقت مکروہ سے نہ روکیں۔ اور خوف کیا کہ کہیں زیادہ سختی کرنے پر وہ سرے سے نماز ہی ترک نہ کردیں۔

حاصل یہ ہے کی خیر محض سے روکنے کا موقع صرف وہ ہے کی جب اس کا تحمل کسی طرح ہو ہی نہ سکے، اور اس کا حق بھی صرف شارع علیہ السلام کو ہے، دوسرے کسی کو نہیں، جیسے آپ نے رکوع وسجدے کی حالت میں قرآن مجید پڑھنے سے روک دیا، کیونکہ وہ مناجاۃ ہے، جو اس ہیئت عجز وخشوع کے لئے کسی طرح موزوں نہیں۔ اگرچہ امام بخاری نے اس کا خیال نہیں کیا اور اجازت دے دی۔ اور حدیث صحیح مسلم شریف کو بھی ترک کردیا، جس میں اس کی صریح ممانعت وارد ہے۔

یہاں بھی تم کہہ سکتے ہو کہ حضور علیہ السلام نے قراءۃ خلف الامام کی اجازت مرجوحہ بادل نخواستہ مرحمت فرمائی ہے، اور چاہو یہ کہو کہ اجازت بطور عزیمت نہیں دی، اور یہ صورت نا حضرات پر زیادہ گراں نہ ہوگی، جو فاتحہ خلف الامام کے وجوب وفرضیت کے مدعی ہیں۔

موجبین کی ایک تاویل

ان لوگوں نے اس کا ایک جواب یہ دیا ہے کہ حضور علیہ السلام کا سوال فرمانا نفس قراءت سے متعلق نہ تھا بلکہ جہر سے تھا کہ آپ کے پیچھے پڑھنے والے نے بلند آواز سے قراءت کی تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ ایسی تاویل ہے جس کے لئے کوئی نقل پیش نہیں جاسکتی، پھر عقلاً بھی کسی عاقل صحابی سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اس اکیلے نے دوسرے تمام صحابہ کو ساکت وصامت دیکھتے ہوئے بھی بلند آواز سے قراءت کردی ہو، اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی تھا تو حضور علیہ السلام کا سوال تو جہر کے بارے میں نہیں ہوا اور نہ آپ نے اس پر کچھ نکیر فرمائی، بلکہ نفس قراءت پر ہی باز پرس فرمائی ہے پس معلوم ہوا کہ وہی آپ پر گراں گزری تھی۔

ان میں سے کچھ لوگوں نے یہ تاویل نکالی ہے کہ سؤال قراءت فاتحہ سے متعلق نہ تھا بلکہ فاتحہ کے علاوہ جو پڑھا گیا ہوگا اس کے بارے میں تھا، لہٰذا فاتحہ خلف الامام باز پرس کی اور ناپسندیدگی کی زد سے محفوظ ہے، لیکن یہ تاویل بھی باطل ہے، کیوں کہ دارقطنی کی روایت میں حضور علیہ السلام کا سؤال اس طرح مروی ہے:۔ "هل منكم من احد يقرأ شيأ من القرآن؟" (کیا تم میں سے کوئی شخص قرآن مجید کا کچھ حصہ میرے پیچھے پڑھتا ہے؟) ظاہر ہے کہ اس عموی سوال سے قراءت فاتحہ بھی محفوظ نہ رہی ہوگی۔ اور سوال مطلق قراءت قرآن سے تھا، کسی خاص سورت کے بارے میں نہ تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے نزدیک کسی ایک مقتدی پر بھی وجوب شرعی نہ تھا، ورنہ یوں نہ فرماتے کہ تم میں سے کوئی قراءت کرنے والا ہے؟ بلکہ سب ہی سے یوں سوال فرماتے کہ کیا تم قراءت کرتے ہو؟ کہ وجوب کی شان یہی تھی کہ سب پر ہوتا اور سب ہی آپ کے خیال میں قراءت کرتے، لہٰذا سب ہی مسئول اور سب ہی جواب دہ ہوتے، نیز معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءت کرنا منصب اقتدا کے خلاف تھا، اسی لئے آپ نے خلف امامكم فرمایا، خلفی نہ فرمایا، جو محل وموقع کے منصب تھا، اس سے آپ نے مطلقاً منصب اقتدا کو سمجھا دیا کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا بے محل ہے۔

وجوب کی دوسری دلیل کا جواب

حضرتؒ نے فرمایا کہ وہ لوگ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد لا تفعلوا الا بام القرآن " سے تو ہم اباحت یا عدم وجوب تسلیم کئے لیتے ہیں مگر اس کے بعد جو حضور نے تعلیل کے طور پر "فانه لا صلوٰة الا بها" فرمایا اس سے تو وجوب ضرور ثابت ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بات تو کسی طرح بھی معقول نہیں ہوسکتی کہ ایک وقت میں ایک چیز کو صرف مباح اور وہ بھی بدرجۂ اباحت مرجوحہ کہا جائے، اور پھر اسی کو اگلے جملہ میں واجب کا درجہ دے دیا جائے، اس لئے حدیث نبوی کی معقول شرح اس طرح ہو سکے گی کہ ممانعت اور پھر اباحت کا تعلق تو مقتدی کے ساتھ ہوا اور چونکہ سورۂ فاتحہ کو دوسری سورتوں کے مقابلہ میں ایک بڑا تفوق وامتیاز بھی بخشا گیا ہے کہ وہ متعین طریقہ پر نماز کے لئے ضروری ہے، اور دوسری سورتوں کے لئے یہ وصف نہیں ہے، بلکہ کوئی بھی سورت فاتحہ کے ساتھ پڑھی جاسکتی ہے، اس لئے تعلیل والے جملہ سے سورۂ فاتحہ کے تفوق کو امتیاز اور وصف خاص کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ اس کے بغیر دو نمازیں ایسی ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہوتیں، ایک منفرد کی دوسرے امام کی لہٰذا تعلیل کا مقصد ایجاب فاتحہ نہیں ہے، بلکہ اس کے وصف خاص کا اظہار ہے اور خاص مقتدی کے حق میں اس کو واجب کرنا مقصود نہیں ہے کہ اس کے واسطے تو صرف اباحۃ کا درجہ مقرر ہو چکا ہے اور اسی لئے اس کے لئے حکمی ومعنوی طور پر امام کی قراءت ہی کافی قرار دے دی گئی ہے، اور اب حکماً وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے امام یا منفرد ہونے کی حالت میں خود پڑھتا ہے۔ یہاں یہ مجبوری ہے کہ امام کی قراءت کے وقت اس کے لئے انصات وخاموشی ضروری ہے۔

مثالوں سے وضاحت

حضرتؒ نے اس کو بھی مثالوں سے واضح فرمایا کہ ترمذی میں حدیث ہے کہ "مومن کی گم شدہ چیز دوزخ کی آگ ہے" وہاں بھی حکم مذکور باعتبار تحقیق جنسی کے ہے تاکہ لوگ مسلمانوں کی چیزیں اٹھا کر حلال نہ سمجھ لیں، ورنہ اگر بالکل ہی مسلمان کی گم شدہ چیزوں کو نہ اٹھایا جائے گا تو یوں

بھی ضائع ہو جائیں گی۔

دوسری مثال یہ ہے کہ ترمذی باب البر میں ہے کہ ایک روز نبی کریم ﷺ حضرت حسن یا حسین کو گود میں لئے باہر تشریف لائے اور ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم ہی اپنے ماں باپ کو بخل پر مجبور کرتے ہو، تم ہی ان کو بزدل بناتے ہو اور تمہاری ہی وجہ سے وہ جہالت وحماقت کی باتیں کرتے ہیں، اور تم ہی ان کے لئے بمنزلہ روح وریحان بھی ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ صاحبزادے ان اوصاف ثلاثہ مذکورہ کے محل نہ تھے، البتہ ان کی جنس کے بارے میں بات درست تھی، ایسے ہی حدیث فاتحہ کو بھی سمجھنا چاہئے کہ اس کی بھی تعلیل کے ذریعہ ایک جنس کا حکم بتلایا گیا ہے۔ جس کا تعلق منفرد و امام سے ہے، موجودہ مقتدی والی صورت سے اس کا تعلق نہیں ہے اور یہ بتلایا کہ مقتدی کے لئے صرف قراءۃ فاتحہ کی اباحت ہے (دوسری سورتوں کی وہ بھی نہیں) اس لئے کہ وہ اصل و بنیاد صلوٰۃ ہے کہ اس کے بغیر نماز پوری نہیں ہوتی، اگرچہ اس وصف اصلیت کا تحقق مقتدی کے سوا منفرد و امام کے حق میں ہوگا۔

چنانچہ اس بارے میں امام احمدؒ کی ترمذی میں صراحت بھی ہے کہ حدیث لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب منفرد کے حق میں ہے، مقتدی کے لئے نہیں ہے۔ اور ایسی ہی صراحت خود راوی حدیث مذکور حضرت سلیمان بن عیینہ سے ابوداؤد میں وارد ہے۔

موجبین کی بھول: لیکن باوجود ایسے اکابر کی تصریحات کے بھی قرأۃ خلف الامام کے قائلین نے اس حدیث کو نماز جماعت کی طرف بھی منتقل کر دیا، اور جو حکم ایک شخص کے لئے بطور خود تھا اس کو ایسے شخص کے لئے بھی کر دیا جو دوسرے کے ساتھ اقتدا کر کے نماز پڑھ رہا ہے۔

مقتدی کے ذمہ بھی قراءت ہے

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک شریعت کا یہ فیصلہ نہیں ہے کہ مقتدی پر قراءت نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ امام ہی کی قراءت اس کی قراءت ہے جو حدیث صحیح سے ثابت ہے، شیخ ابن ہمام نے ایک اسناد مسند احمد بن منیع سے ایسی بھی پیش کی ہے جو شرط شیخین کے مطابق ہے۔ یہ کتاب اب مفقود ہے، شیخ ابوالحسن سندھی کے حاشیہ فتح القدیر میں ہے کہ محقق علامہ قاسم بن قطلوبغا حنفی نے اپنے استاذ شیخ ابن ہمام سے اس حدیث کی اسناد دریافت کی تھی، توانھوں نے جواب میں لکھ کر بھیجا کہ وہ "اتحاف الخیرہ بزوائد المسانید العشرہ" للبوصیریؒ میں ہے۔

علامہ موصوف نے بوصیری کا یہ بیان بھی نقل کیا کہ جب اس اسناد کو حافظ ابن حجرؒ پر پیش کیا گیا تو مسند تمام ہونے سے قبل ہی کہنے لگے کہ اس سے تو حدیث من کان له امام کی بو آرہی ہے، اور مسکرا کر چپ ہو گئے، بظاہر اس سے خوش نہ ہوئے، مگر اس پر کوئی نقد بھی نہ کر سکے، کیونکہ اس کی سند علی شرط الشیخین تھی۔ اور اپنے مسلک سے مجبور تھے، بلکہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے کہ ایسے مواقع میں فرمایا کرتے تھے، اس کی فقہ حدیث کی طرف کو چلی ہے، یعنی برعکس ہوا ہے چلنا تو حدیث سے فقہ کی طرف کو تھا، تاکہ فقہ حدیث نبوی کے تابع ہو، یہاں اگر حافظ ابن حجرؒ کے اس خواب کو بھی ذہن میں تازہ کر لیا جائے تو بہتر ہے، جو پہلے ذکر ہوا ہے کہ فقہ حنفی کے اصول جامعہ کاملہ سے متاثر ہو کر آپ نے حنفی بن جانے کا ارادہ کر لیا تھا، مگر پھر ایک خواب کی وجہ سے رک گئے تھے۔

فقہ حنفی کے خدام اکابر ملت

حقیقت یہ ہے کہ فقہ حنفی کو اگر امام محمد، امام طحاوی، علامہ زیلعی، اور حضرت علامہ کشمیری ایسے حضرات کی طرح کامل تحقیق و دقت نظر کے ساتھ کتاب و سنت اور تعامل و آثار صحابہ و تابعین کی روشنی میں پیش کیا جاتا اور اس کی اشاعت بھی اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی رہتی تو آج جو اس کی بے قدری و کم مائیگی دوسرے لوگوں کے غلط پروپیگنڈے کی وجہ سے محسوس کی جارہی ہے، یہ صورت ہرگز رونما نہ ہوتی، ہم نے جو پہلے کئی ابحاث تفصیل سے پیش کی ہیں اور یہ بحث بھی سامنے ہے، اس سے ہماری مذکورہ گذارش کی صداقت واضح ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

موجودہ دورانحطاط: بڑی تکلیف و درد کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہم نے اس آخری دور میں حضرت علامہ کشمیریؒ اور حضرت مدنیؒ ایسے محققین وکاملین سے حدیث کا درس لیا تھا، اگرچہ صحیح معنی میں دیکھا جائے تو ہمیں کچھ بھی نہ آیا کیونکہ ہماری استعداد و قابلیت اخذ ہی ناقص تھی، مگر جلد ہی اب تو ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ بیشتر ترمذی و بخاری پڑھانے والے ایسے ہیں جن میں علوم اکابر سلف وخلف کو سمجھنے کی بھی قابلیت نہیں ہے، نہ ان کا مطالعہ و معلومات وسیع ہیں، بلکہ اس کیلئے ان کے پاس وقت بھی نہیں ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ **فیا للاسف ولضیعۃ علم الحدیث۔**

تعمیم و تخصیص نہیں ہے

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہاں تعمیم و تخصیص کی صورت نہیں ہے بلکہ اصل صورت یہ ہے کہ نظر شارع میں قراءت کے بارے میں مطلق نماز کا باب مستقل اور الگ تھا جس کے تحت منفرد وامام آئے اور مقتدی کے احکام دوسرے تھے اس لئے اس کا باب الگ سے تھا جیسے حدیث میں آتا ہے **"البکر تستاذن فی نفسها و اذنها صماتها"** (باکرہ سے اس کے نکاح کے لئے زبانی اجازت لینی چاہئے اور اس کی خاموشی اجازت ہے) تو یہاں **اذنها صماتها** بطور تخصیص کے نہیں ہے، بلکہ وہ مستقل الگ اسکے لئے شریعت ہے، اس لئے اگر کوئی پہلے حکم کو عام قرار دے کر باکرہ کے لئے زبانی اجازت کو شرط قرار دے تو وہ غلطی ہوگی۔ البتہ دوسرے جملہ سے جو الگ ہے اس کے سکوت کو بمنزلہ زبانی اجازت کے مقرر کیا ہے اجازت ثابت ہوگی، اسی طرح یہاں بھی جب شریعت نے اقتدا کے قواعد واحکام الگ باب میں قائم کئے ہیں، اور غیر اقتدا کے دوسرے باب میں، تو کسی کو حق نہیں کہ ایک کے احکام کو دوسرے باب میں جاری کر دے۔

احادیث اقتداء: چنانچہ اقتدا کی احادیث دیکھئے، کسی میں بھی مقتدی کو امامت کے ساتھ قراءت کا حکم نہیں کیا گیا، اور جس حدیث میں اقتدا کی پوری کیفیت بیان کی گئی ہے اور کہا گیا کہ جب امام رکوع کرے تو تم رکوع کرو، سجدہ کرے تو سجدہ کرو وغیرہ وہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ جب امام قراءت کرے تو تم بھی قراءت کرو، حالانکہ قراءت نماز کا بنیادی رکن ہے بلکہ راس الارکان ہے، لہذا اس کا ذکر نہ کرنا اہل حدیث کے لئے جو موجبین قراءت خلف الامام ہیں، اچھا سبق تھا، پھر اس کے بعد یہ بھی وہ دیکھیں کہ ایک دوسری مستقل حدیث میں یہ زیادتی بھی صراحت کے ساتھ مل گئی کہ امام جب قراءت کرے تو تم خاموش رہو، یہ حدیث مسلم شریف کی ہے (باب التشہد فی الصلوٰۃ) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مفصل روایت نماز کے بارے میں ہے، اور امام ابوبکر ابن ابی شیبہ کی روایت میں **و اذا قرأ فانصتوا** بھی ہے، یعنی جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو جو پہلی روایت میں نہ تھا اور عام طور سے دوسرے راویوں نے اس جملہ کو نہیں لیا تھا، اسی لئے ابو اسحاق (صاحب مسلم و راوی کتاب) نے امام مسلم کو اس کمزوری کی طرف توجہ دلائی تو وہ بولے کیا تم سلیمان تیمی سے بھی زیادہ حدیث کو یاد رکھنے والا ڈھونڈتے ہو (یعنی کیا اتنے کامل الحفظ وضبط کی روایت زیادۃ پر شبہ کرتے ہو صرف اس لئے کہ دوسروں نے اس کی روایت نہیں کی) پھر سوال کیا گیا کہ کیا حضرت ابوہریرہ والی روایت بھی آپ کے نزدیک صحیح ہے جس میں یہی زیادتی ہے؟ تو اس پر امام مسلم نے فرمایا کہ وہ بھی میرے نزدیک صحیح ہے۔ اس پر کہا گیا کہ پھر آپ نے اس کو مسلم میں) کیوں نہیں لیا؟ آپ نے کہا یہ کیا ضروری ہے کہ جتنی حدیثیں میرے نزدیک صحیح ہیں، وہ سب ہی یہاں جمع کر دوں، یہاں تو میں نے وہ جمع کی ہیں جن پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس زیادتی کی امام مسلم نے تصحیح بھی کی ہے اور اس کی تصحیح جمہور مالکیہ وحنابلہ نے بھی کی ہے، بلکہ اس کی تصحیح سے احتراز صرف ان حضرات نے کیا ہے جو قراءت خلف الامام کو اپنا مسلک مختار قرار دے چکے تھے اور ان کی فقہی رائے مقدم بن کر حدیث کی طرف چلی تھی۔

امام بخاری وابوداؤد کے دعوے

حضرتؒ نے اس موقع پر نام تو نہیں لیا مگر احقر کے نزدیک اشارہ امام بخاری وابوداؤد کی طرف بھی تھا جنھوں نے اس زیادتی پر کلام کیا ہے، امام بخاری نے تو جزء القراءۃ ص۲۹ (طبع علیمی) میں سلیمان تیمی کی روایت میں عدم ذکر سماع عن قتادہ کی بات نکالی اور دوسری حدیث ابی ہریرہؓ کو ابو خالد کی عدم متابعت کا دعوے کر کے گرانے کی سعی مشکور فرمائی۔ امام ابوداؤد نے بھی حدیث ابی ہریرہ باب **الامام یصلی من قعود** کے تحت روایت کر کے زیادۃ ابی خالد کو غیر محفوظ قرار دے دیا۔

سلیمان تیمی کے بارے میں ابھی اوپر امام مسلم وغیرہ سے توثیق وتصحیح کا ذکر ہوا ہے اور علامہ عثمانی نے فتح الملہم ص۲۲/۲ میں اور بھی موثقین ومحسنین گنائے ہیں، پوری بحث وہاں پڑھنے کے لائق ہے اور ابو خالد کی عدم متابعت کا جواب مکمل بذل المجہود ص۳۳۸/۱ تا ص۳۴۱/۱ قابل مطالعہ ہے، جس سے امام بخاری اور امام ابوداؤد دونوں کے بے دلیل دعووں کی مبالغہ آرائی واضح ہو جاتی ہے۔ افسوس ہے کہ ہم بہت سی محدثانہ تحقیقات یہاں ذکر نہیں کر سکتے۔

اکابر محدثین اور فقہی اراء

اکابر محدثین خصوصاً اصحاب صحاح کی نہایت گراں قدر حدیثی خدمات کی تحسین واعتراف ہزاراں ہزار بار اور ہماری گردنیں ان کے علمی احسانات کی گراں باری کے باعث جھکی ہوئی ہیں۔ مگر جن مواضع میں انہوں نے محض اپنی فقہی آراء سے متاثر ہو کر مندرجہ بالا قسم کا کلام بھی کیا ہے، یا تراجم ابواب کے ذریعہ اپنی فقہی آراء کے احقاق کی سعی فرمائی ہے وہ لائق شکوہ ہے اور خورد مدح کے لئے تھوڑے سے کلام کی گنجائش شاید نکل بھی سکتی ہے، اسی لئے امام بخاری کے رسالہ کی دوسری چیزوں پر بھی آگے بحث آئے گی۔ ہمارا خیال ہے اکابر متقدمین سے ائمہ اربعہ کے بعد (کہ وہ تو فقہاء محدثین کاملین کے سرتاج تھے، اور ہم ان کو بعد کے سارے محدثین اصحاب صحاح، وغیرہم سے بھی علم حدیث میں فائق سمجھتے ہیں) محدث کبیر امام ابن ابی شیبہؒ کا مرتبہ سب سے اوپر ہے جنھوں نے اصحاب صحاح سے قبل ہی احادیث وآثار صحابہ وتابعین کا ایسا بے نظیر مجموعہ تالیف کر دیا تھا، جو سارے انصاف پسند افراد امت محمدیہؐ کے لئے سراج راہ تھا اور ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

فقہ وتقلید: فقہ امام اعظمؒ کے مسائل مدونہ میں سے (جن کی تعداد بارہ لاکھ ستر ہزار تک منقول ہے) ۱۲۵ مسائل پر محدث موصوف کا محدثانہ نقد تھا وہ بھی ان کی "**الدین النصیحہ**" کے تحت مخلصانہ خدمت تھی، ان کے کافی وشافی جوابات بھی بار بار دیئے گئے ہیں، پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ "**اذا صح الحدیث فھو مذھبنا**" یعنی جب بھی ہمیں یہ ثابت ہو جائے گا کہ کسی مسئلہ میں ہمارے امام صاحب کی رائے کسی حدیث صحیح نبوی کے خلاف ہے تو ہم اس حنفی مسئلہ کو ترک کر کے اس حدیث پر عمل کریں گے۔ کیونکہ ہمارے امام صاحب اور دوسرے ائمہ مجتہدین نے بھی امت کو اتباع حدیث ہی کی طرف بلایا ہے یہ دوسری بات ہے کہ وہ اعلم بمعانی الحدیث تھے، اس لئے ہم نے ان پر اعتماد کر کے ان کے مسائل **مستخرجہ من الحدیث** پر عمل کیا ہے۔

زیادتی ثقہ معتبر ہے

اس موقع پر عدم متابعت کی بات اس لئے بھی بے محل ہے کہ زیادتی ثقہ کو سب ہی نے معتبر قرار دیا ہے، خصوصاً جبکہ وہ مضمون مزید علیہ کے خلاف بھی نہ ہو، چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس "**واذا قرأ فانصتوا**" کی زیادتی کو زیادۃ ثقہ قرار دے کر معتبر قرار دیا اور کہا کہ یہ معنی مزید کے موافق ومؤید بھی ہے کیونکہ **انصات الی قراءۃ المقتدی** اتمام امام کا ایک فرد ہے، (فتح الملہم ص۲۳/۲)

تصحیح حدیث انصات: حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل الخطاب میں لکھا۔ حدیث انصات کی تصحیح مندرجہ ذیل اکابر محدثین نے کی ہے:۔ امام احمد، اسحٰق، ابوبکر اثرم، مسلم، نسائی، ابن جریر، ابو عمر، ابن حزم، منذری، ابن کثیر، ابن تیمیہ حافظ ابن حجر وغیرہ اور جمہور مالکیہ وحنابلہ۔

پھر لکھا کہ حدیث ابی ہریرہ (اذا قرأ فانصتوا والی) نسائی وغیرہ میں بھی ہے، اور سب سے زیادہ مکمل مضمون ابن ماجہ باب اذا قرأ فانصتوا میں ہے، ابوبکر ابن ابی شیبہ سے اس میں ہے کہ امام اس لیئے ہے کہ اس کی اقتدا واتباع کی جائے جب وہ تکبیر کہہ کر نماز شروع کرے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ قراءت کرے تو خاموش رہو، جب غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو جب رکوع کرے تو تم رکوع کرو الخ مکمل نقشہ امامت واقتدا کا پیش کیا ہے۔ (فصل ص ۲۷)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام بخاری نے جس لفظ حدیث کو ساقط کرنا چاہا، اسی زیادتی والی حدیث کو امام احمد، امام نسائی وابن ماجہ نے صحیح قرار دیا، حتیٰ کہ ابن حزم نے بھی تصحیح کردی، جبکہ ہم نے اوپر بتلایا کہ ہمیں اکابر امت میں سے صرف دو ہی ایسے ملے جنھوں نے منہ بھر کر قراءت خلف الامام کو فرض وواجب قرار دیا اور اس کے خلاف آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ نہی عن القراءۃ خلف الامام کی رعایت نہ کی۔ کیونکہ دوسرے بعض حضرات نے تو اتنی رعایت کی تھی کہ امام کی آواز اگر نہ آرہی ہو تو پڑھ سکتا ہے، جیسے امام احمد وشافعی وغیرہ نے، بجز نہی کی رعایت کر کے قراءت خلف الامام کو مطلق طریقہ سے کسی نے بھی ان دو بڑوں کے علاوہ واجب وفرض نہیں کہا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ پھر یہ بھی ملحوظ رہے کہ امام ترمذی نے تو ان دونوں احادیث کی روایت ہی نہیں کی۔ شاید اپنے استاذ معظم امام بخاری سے متاثر ہو کر، امام ابوداؤد نے روایت کر کے غیر محفوظ کا نقطہ لگا دیا امام مسلم نے جراءت کر کے روایت بھی کردی اور تصحیح بھی اس شان سے کردی کہ باید وشاید، امام نسائی نے بھی روایت کردی تو گویا تصحیح ہی کردی، اور ابن ماجہ نے اور بھی آگے بڑھ کر مستقل باب ہی "اذا قرأ فانصتوا" کا قائم کردیا۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا''

امام بخاری وابوداؤد نے حدیث صحیح کے جس قطعہ کو معلول وساقط کرنا چاہا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے اتنی عظمت بخشی کہ سارے ہی اکابر محدثین نے اس کی تصحیح وتوثیق کردی، حتیٰ کہ ابن حزم نے بھی جو اس مسئلہ میں فرضیت قراءۃ خلف الامام کا جھنڈا اٹھا کر امام بخاری کے ساتھ چلے تھے۔

اب صرف امام بخاری جماعت سے الگ رہ گئے، اور ہمیں درحقیقت ان ہی کے دلائل واعتراضات کا جواب دینا بھی ہے اور بقول ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے ان ہی کی وجہ سے بہت سے شافعیہ وغیرہم نے قراءت خلف الامام کو واجب ثابت کرنے کے لئے زیادہ زور لگایا ہے، شاید حضرت کا اشارہ دار قطنی وبیہقی وغیرہ کی طرف ہوگا، کہ آخر الذکر نے تو امام بخاری کی طرح مستقل رسالہ بھی لکھا ہے" کتاب القراءۃ خلف الامام"

تمام صحیح احادیث بخاری ومسلم میں نہیں ہیں

ابھی امام مسلم نے فرمایا کہ ہم نے مسلم میں ساری صحیح احادیث ذکر کرنے کا التزام نہیں کیا، امام بخاریؒ کو ایک لاکھ حدیث صحیح اور دو لاکھ غیر صحیح یاد تھیں (مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۸) لیکن ان ایک لاکھ صحیح احادیث میں سے اپنی صحیح بخاری میں غیر مکرر موصول احادیث صرف ۲۲۵۳ درج کیں اور خود بھی فرمایا کہ جو میں نے درج نہیں کیں وہ زیادہ ہیں، پھر جو روایات لائے ہیں۔ وہ بھی دوسرے محدثین کے طریقہ سے الگ صرف اپنے اجتہاد ورائے کے موافق لائے ہیں، دوسرے فقہاء مجتہدین کی رعایت نہیں کی۔

امام بخاری کے تفردات

یہی وجہ ہے کہ بہت سے مسائل میں ان کا مسلک جمہور اور اجماع کے خلاف تک ہے مثلاً سب نے اجماع کیا کہ رکوع وسجدہ میں قرآن مجید کی قراءت ممنوع ہے اور امام مسلم نے اپنی صحیح میں "باب النھی عن قراءۃ القرآن فی الرکوع والسجود" کے تحت آٹھ احادیث صحیحہ روایت کی ہیں، پھر بھی امام بخاریؒ نے ان سب سے صرف نظر کر کے اپنا یہ مسلک قائم رکھا کہ رکوع وسجدہ کے اندر قراءت

درست ہے۔ امام احمدؒ نے لکھا کہ میرے علم میں کسی کا بھی ایسا قول نہیں ہے کہ جس نے امام کے پیچھے نماز میں قراءت نہ کی، اس کی نماز نہ ہوگی، لیکن امام بخاری سب سے الگ ہو کر وجوب قرأتہ خلف الامام کے قائل ہوئے، اور جمہور کے خلاف جواز تقدیم تحریمہ علی الامام کے بھی قائل ہوئے، جمہور نے فیصلہ کیا کہ امام کے ساتھ رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے، مگر امام بخاری نے فرمایا کہ نہیں ملے گی۔ اس قسم کے تفردات امام بخاریؒ کے بہت ہیں جن کو ہم کسی موقع پر یکجا پیش کریں گے۔

غیر مقلدین زمانہ کا فتنہ

یہاں ذکر کرنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے زمانہ کے غیر مقلد حضرات حنفی عوام کو پریشان کرنے کے لئے اختلافی مسائل میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ لاؤ حنفی مسئلہ کے لئے بخاری کی حدیث، اگر وہ ایسے ہی امام بخاری کے بڑے معتقد ہیں تو بجائے شوکانی وغیرہ کے ان ہی کا اتباع کرلیں تو اچھا ہے۔ امام بخاری کا مسلک ہمیں ان کے تراجم سے معلوم ہو چکا ہے، ان سے ہم نمٹ لیں گے، یہ جو غیر مقلدین نئے نئے مسئلے پیدا کر کے نئے نئے جھگڑے نکالا کرتے ہیں ان سے تو نجات ملے گی۔

سیاق استثناء: حضرتؒ نے فرمایا:۔ کہ موجبین قراءت خلف الامام کو چاہئے تھا کہ وہ فلا تفعلوا لاابام القرآن جیسا استثناء انصات کے مقابلہ میں بھی پیش کرتے مثلا انصتوا الا بفاتحہ، مگر ایسی کوئی روایت نہیں ہے، تاہم انھوں نے اسی جیسا درجہ دے کر انصات کے حکم کو لغو کر دیا، ہم کہتے ہیں کہ جب قراءت امام کے وقت انصات وخاموشی کا صریح حکم آگیا اور کوئی استثناء بھی فاتحہ کے لئے وارد نہیں ہوا تو اس سے واضح ہوا کہ فاتحہ اور غیرہ فاتحہ سب برابر ہیں، امر انصات کے تحت صرف خاموشی ہی متعین ہے۔

حضرتؒ نے دوسرے دلائل بھی انصات للمقتدی کے لئے ارشاد فرمائے، پھر آخر میں فرمایا کہ اس مسئلہ میں ہمارے پاس نص قرآنی بھی ہے اذا قری القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا، اور احادیث صحیحہ بھی ہیں، اور مقابل میں دوسروں کے پاس مقتدی کے لئے ایجاب قراءت خلف الامام کے لئے صحیح دلائل کا فقدان ہے، جہریہ میں بھی اور سریہ میں بھی، البتہ ان کے پاس دعاوی ومبالغات ضرور ہیں، جن کو وہ بڑے طمطراق کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

رکنیت فاتحہ کا مسئلہ: فاتحہ خلف الامام کی مزید بحث سے قبل یہ بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فی نفسہ صحت نماز کیا قراءت فاتحہ پر موقوف ہے جو امام شافعی وغیرہ کا مذہب ہے یا قرآن مجید کا کوئی حصہ بھی کہیں سے پڑھ دینا صحت نماز کے لئے کافی ہے جو امام ابوحنیفہؒ وغیرہ کا مسلک ہے، امام شافعی ومالک کے نزدیک پوری سورۂ فاتحہ ہی متعین طور سے فرض ورکن صلوٰۃ ہے کہ اس میں سے ایک حرف بھی رہ گیا یا غلط پڑھ دیا تو نماز باطل ہوگی، امام احمد سے دو روایت ہیں۔ مشہور یہی قول ہے جو امام شافعی کا ہے، دوسرا قول امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ ہے، جیسا کہ نیل المآرب اور المغنی لابن قدامہ میں ہے، اور امام اوزاعی وثوری بھی امام اعظم کے ساتھ ہیں (اوجز ص ۲۳۷/۱) پھر لکھا کہ اس بارے میں کوئی شدید اختلاف نہیں ہے کیونکہ سورۂ فاتحہ کا پڑھنا امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی واجب ہے کہ عمداً ترک سے گنہگار ہوگا اور اعادہ واجب ہوگا اور سہواً ترک پر سجدۂ سہو واجب ہوگا، اگر سجدۂ سہو نہ کیا تب بھی نماز واجب الاعادہ اور ناقص رہی۔

امام شافعی کے یہاں چونکہ واجب کا درجہ نہیں ہے، انھوں نے فرض کہا، لہٰذا گویا نزاع لفظی ہے۔ اور واجب وفرض کا فرق دقائق حنفیہ میں سے ہے، دوسروں کے یہاں یہ دقت نظر نہیں ہے۔

طرق ثبوت فرض: حنفیہ کے یہاں فرض ورکن کا ثبوت صرف قرآن مجید، یا متواتر احادیث یا اجماع سے ہوتا ہے، اسی لئے صرف قراءۃ قرآن کا ثبوت تو ان کے نزدیک آیت فاقرؤا ماتیسر من القرآن اور دوسری آیت فاقرؤا ما تیسر منہ سے ہوا اور اس ارشاد نبوی سے

بھی جو آپ نے نماز غلط طور سے پڑھنے والے کو فرمایا کہ پھر تم جو آسان ہو قرآن مجید میں سے وہ پڑھنا، اور دوسری حدیث بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نماز بغیر قرآن مجید پڑھنے کے نہیں ہوتی خواہ وہ سورۂ فاتحہ ہو اور اس کے ساتھ کچھ اور ہو اور حضور علیہ السلام نے جو مسیئ صلوٰۃ کو فرمایا کہ جاؤ پھر نماز پڑھو کیونکہ تمہاری نماز نہیں ہوئی، وہ بھی حنفیہ کے خلاف اس لئے نہیں کہ وہ بھی ایسی نماز کو واجب الاعادہ کہتے ہیں، جس میں واجبات چھوٹ گئے ہوں،

- حنفیہ جواب میں یہ بھی کہتے ہیں کہ عام احادیث و آثار سے کسی چیز کو فرض و رکن قرار دینا فرق مراتب کے خلاف ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ آثار عموم قرآن مجید کے خلاف بھی ہوں، جیسے یہاں ہے کہ قرآن مجید و دیگر آثار سے تو نماز میں صرف قرآن مجید پڑھنے کا حکم ہوا اور ہم صرف آثار کے ذریعہ فاتحہ کو فرض و رکن قرار دے دیں۔ البتہ احادیث متواترہ کے ذریعہ ضرور فرض و رکن کا درجہ ثابت ہوسکتا ہے (اوجز)

نزاع لفظی یا حقیقی

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس اختلاف کو نزاع لفظی کا درجہ دینا تو محل تامل ہے، کیونکہ یہ تو ضرور ہے کہ شافعیہ کے یہاں بھی احکام حج وغیرہ کے سلسلہ میں بعد فرض ایسے ملتے ہیں جو ان کے یہاں بھی واجب کے درجہ میں ہیں کہ ان کا تدارک ہوسکتا ہے، اور فرض و رکن کا درجہ واجب سے اوپر اسی لئے ہے کہ اس کا تدارک نہیں ہوسکتا، اور جس کا ہو سکے وہ درحقیقت فرض و رکن نہیں ہے تاہم عمل کے لحاظ سے فرض و واجب بظاہر یکساں ہوتے ہیں اس لئے بات وہی صحیح ہے کہ فرض و واجب کے فرق دقیق کو صرف حنفیہ نے سمجھا ہے، شافعیہ کے یہاں بعض فرض و رکن ایسے بھی ملتے ہیں جن کو فرض و رکن بکل المعنی الکامہ نہیں کہہ سکتے لیکن تدارک سے یہ بات نکلی کہ وہ ہمارے یہاں کے واجب کے مرتبہ میں ہیں، اس لئے نزاع لفظی کی بات صحیح ہونا مشکل معلوم ہوتی ہے چنانچہ زیر بحث مسئلہ میں بھی ان کے فرض و رکن اور ہمارے واجب میں فرق بین ہے کہ وہ بغیر سورۂ فاتحہ کے نماز کو کسی طرح بھی درست نہیں مانتے اور حنفیہ صرف ناقص بتلاتے ہیں جس کا تدارک ترک سہواً ہو تو سجدۂ سہو سے اور عمداً ہو تو اعادہ سے ہوتا ہے، اور پہلی نماز بھی اجر سے خالی نہ ہوگی اگرچہ اجر ناقص ہوگا جبکہ شافعیہ کے نزدیک باطل محض ہونے کی وجہ سے اجر صلوٰۃ اس کو کچھ بھی نہ ملے گا یا یوں تسبیحات وغیرہ کا اجر شاید وہ بھی مانتے ہوں، واللہ تعالیٰ اعلم۔

ابن قیم کا اعتراض: حافظ ابن القیمؒ نے اعلام الموقعین (ترجمہ ۴/۸۶) میں اسی مسئلہ پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا کہ حنفیہ نے محکم دلائل کو ترک کردیا، گویا قرآنی آیات کے مقابلہ میں اخبار آحاد کو محکم دلائل قرار دیا، اور جو احادیث حنفیہ کی مستدل ہیں ان کو متشابہ بتلایا، نیز لکھا کہ اعرابی (مسیئ صلوۃ) والی حدیث کو حنفیہ کا پیش کرنا بتلاتا ہے کہ وہ حدیثی اعتبار سے بالکل مفلس ہیں، کیونکہ ابوداؤد کی روایت میں حضور علیہ السلام کا حکم سورۂ فاتحہ پڑھنے کا صریح موجود ہے۔

جواب ا: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث ابوداؤد "**باب صلوٰۃ من لا یقیم صلبه فی الرکوع و السجود**" میں ہے اور اس میں چار حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔ تین روایتوں میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ قرآن مجید میں سے جتنا آسان ہو وہ نماز میں پڑھا جائے اور صرف ایک روایت میں یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف سورۂ فاتحہ متعین نہیں ہے، ورنہ ابوداؤد ہی کی تین روایتوں میں بغیر ذکر فاتحہ کے **ما تیسر من القرآن** پڑھنے کا ارشاد نہ فرماتے، پھر قصہ بھی ایک ہی ہے اس لئے بھی تعیین فاتحہ میں شبہ پڑ گیا، اور فاتحہ کو واجب حنفیہ بھی کہتے ہیں، صرف رکن نہیں کہتے، کیونکہ رکنیت اور فرض کا درجہ ثابت کرنے کے لئے قطعی ثبوت کی ضرورت ہے۔ اور اخبار آحاد سے ظنی ثبوت ملتا ہے جس سے وجوب کا درجہ ثابت کرتے ہیں جو علم ویقین کے لحاظ سے فرض سے کم مرتبہ ہے، اگرچہ عملاً فرق زیادہ نہیں ہے۔

جواب ۲: یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ شافعیہ اور ابن قیم وغیرہ جو رکنیت فاتحہ پر حدیث ابوداؤد مذکور سے استدلال کرتے ہیں اس میں

صرف ام القرآن کا ذکر نہیں بلکہ دو چیزوں کا حکم ہے کہ تم ام القرآن پڑھو اور اس کے ساتھ اور بھی جو کچھ اللہ نے چاہا ہے (ام القرآن کے علاوہ) وہ بھی پڑھو، لیکن شافعیہ اور ابن القیم وغیرہ نے (جو صرف فاتحہ کو رکن وفرض کہتے ہیں اور اس کے علاوہ سورت وغیرہ کو صرف سنت بتلاتے ہیں) آدھی حدیث پر عمل کیا اور آدھی کو چھوڑ دیا۔ اگر اس حدیث ابی داؤد کی وجہ سے ام القرآن فرض ہوئی تو دوسری سورت بھی فرض ہونی چاہیے، مگر وہ اس کو واجب تک کا بھی درجہ نہیں دیتے اور صرف سنت مانتے ہیں جبکہ حنفیہ کے نزدیک حدیث نبوی کی وجہ سے سورۂ فاتحہ بھی نماز میں واجب ہے اور دوسری سورت بھی۔

ائمہ ثلاثہ درجہ وجوب کے قائل ہیں

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حافظ ابن تیمیہ (استاذ علامہ ابن القیم) نے لکھا کہ ''ائمہ ثلاثہ (امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ وامام احمدؒ) کے نزدیک نماز کی ترکیب، فرائض، واجبات وسنن سے ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس کی ترکیب صرف فرائض وسنن سے ہے۔'' تو جب حنابلہ کے نزدیک بھی وجوب کا درجہ تسلیم شدہ ہے تو حنفیہ پر مرتبہ واجب کی وجہ سے اعتراضات کیوں کرتے ہیں، نیز فرمایا کہ عمدۃ القاری ص۶۴/۳ میں ہے کہ جو امام صاحب کا مذہب ہے وہ امام مالکؒ سے بھی ایک روایت ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جس نے کسی رکعت میں بھول کر فاتحہ ترک کر دی اور سجدۂ سہو کر لیا تو نماز صحیح ہو جائے گی، اور ابن الحکم وغیرہ سے بھی اسی طرح امام مالک سے منقول ہے۔ اور وزیر ابن ہبیرہ حنبلی نے بھی ان کے نزدیک عدم رکنیت فاتحہ کی روایت "الاشراف مذاهب الاشراف" میں نقل کی ہے (معارف السنن ص۳۸۲/۲)

افادۂ مزید: حضرتؒ نے فرمایا:۔ جو کچھ اختلاف ہے وہ "واجب الشیء" میں ہے، "الشیء الواجب" میں نہیں ہے، اور واجب الشی، صرف نماز وحج میں ہے، البتہ الشیء الواجب کا درجہ وہ سب چیزوں میں ہے، پھر یہ کہ جو چیز دلیل قاطع سے ثابت ہوتی ہے اس کے ارکان وشروط دلیل ظنی سے ثابت نہیں ہو سکتے، البتہ جو چیز دلیل ظنی سے ثابت ہو اس کے شروط وارکان دلیل ظنی سے بھی ثابت ہو سکتے ہیں، جیسے نماز استسقاء وغیرہ۔ (العرف الشذی ص۱۳۷)

امام بخاری کے دلائل: امام ہمامؒ نے وجوب قراءۃ خلف الامام ثابت کرنے کے لئے مستقل رسالہ لکھا، جو ۳۲ صفحات میں مطبع علمی دہلی سے طبع شدہ ہمارے سامنے ہے اس میں ۱۲۵ آثار مرفوعہ وموقوفہ درج کئے۔ جن میں مطلق قراءت کے ۲۹۔ مطلق قراءت فاتحہ کے ۴۷۔ مطلق قراءت فاتحہ خلف الامام کے ۱۵۔ قراءۃ خلف الامام جہریہ کے ۱۳۔ قراءۃ دیگر سور کے ۶ نہی عن القراءۃ خلف الامام کے ۱۱۔ اور آثار غیر مطابق ومخالف ترجمہ امام بخاری ۴ ہیں۔

(۱) مطلق قراءت کی فرضیت سب کے لئے تسلیم شدہ ہے (۲) مطلقا قراءت فاتحہ کا بھی کوئی منکر نہیں، صرف رکنیت و وجوب کا اختلاف ہے (۳) مطلق قراءت فاتحہ خلف الامام کا بھی انکار نہیں کیونکہ سری نمازوں میں سب جائز مانتے ہیں۔ (۴) قراءۃ خلف الامام جہری کی ضرور اختلافی ہے لیکن اس کے لئے ۱۲۵ میں سے امام کے رسالہ میں صرف ۱۳۔ آثار ہیں۔ ہم ان پر بحث کریں گے (۵) دوسری سورت فاتحہ کے ساتھ پڑھنا ہمارے نزدیک واجب ہے اور شافعیہ نیز امام بخاری اس کو صرف سنت مانتے ہیں، لہٰذا وہ ۶۔ آثار ہمارے موافق اور ان کے مخالف ہیں۔ (۶) ۱۱۔ آثار بھی ان کے مخالف ہیں اور خاص طور سے امام بخاری وابن حزم کے مخالف ہیں کہ وہ باوجود ممانعت شرعیہ کے بھی جہری ہیں۔ قراءۃ خلف الامام کو نہ صرف جائز بلکہ واجب وفرض کہتے ہیں، اس کو کیا کہا جائے اور ایسے بڑوں کے لئے ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ پھر یہ بات آیت قرآنی اذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا اور حدیث مسلم ونسائی وابن ماجہ ومسند احمد وغیرہ" قرأ فانصتوا" کے بھی خلاف ہے، امام بخاری نے تو یہ عذر کر دیا کہ آیت خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور حدیث کے راوی کو ضعیف بتلا

دیا۔ حالانکہ آیت سورۂ اعراف کی ہے جو مکہ معظمہ میں نازل ہوئی تھی جبکہ جمعہ کی نماز شروع بھی نہ ہوئی تھی تو خطبہ کہاں ہوتا، اور حدیث مذکور کی تصحیح سارے اکابر محدثین نے کی ہے۔ اور ابن حزم نے بھی کی ہے پھر معلوم نہیں انھوں نے اس کی مخالفت سے بچنے کی کیا سبیل نکالی ہوگی۔

(۷) آخر میں امام بخاری نے باب القراءۃ فی الظھر الاربع کلھا قائم کیا (ص۳۰) اس میں سب سے پہلا اثر نہ صرف ترجمہ وعنوان سے غیر مطابق ہے بلکہ اس میں یہ بھی ہے کہ جس نے کوئی رکعت پڑھی اور اس میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز صحیح نہیں ہوئی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو۔ یہ اثر امام بخاری کے مسلک اور رسالہ کے مقصد سے بھی مختلف ہے۔ پھر آگے بھی ابوالدرداء کا اثر ص۳۱ میں ہے جس میں ترجمۃ الباب سے نامطابقت ہے کہ اس میں صرف یہ ہے کہ ہر نماز میں قراءت ہونی چاہئے، نماز ظہر کا کوئی ذکر نہیں، اس کے یہاں ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی اور کون اس کا منکر ہے؟ ص۳۲ میں عبادہ کا اثر ہے جس کا ترجمۃ الباب سے کوئی تعلق نہیں، اور سب سے آخر میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ نماز بغیر فاتحہ اور اس کے ساتھ دوسری آیات یا سورت ملائے بغیر نہیں ہوگی، حالانکہ امام بخاری نے ابتداء رسالہ میں سب سے پہلے صفحہ پر حدیث کے لفظ فصاعدا کو گرایا تھا اور لکھا تھا کہ یہ معمر کی روایت ہے اور عامۂ ثقات نے معمر کی تائید نہیں کی ہے، اب یہاں آخر میں کوئی بھی اعتراض نہیں کیا حالانکہ فصاعدا اور فمازاد کے مقصد اور مطلب میں کچھ بھی فرق نہیں ہے۔

امام شافعی وجوب کے قائل نہ تھے

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ قدمائے شافعیہ امام شافعیؒ کے دونوں قول ذکر کیا کرتے تھے، متاخرین جدید پر اقتصار کیا اور میری رائے یہ ہے کہ امام شافعیؒ آخر تک جہریہ میں اختیار واستحباب ہی کے قائل رہے، ایجاب کے قائل نہیں ہوئے۔

ابن خزیمہ اور بیہقی نے جزء البخاری کا اتباع کر کے ہر مصلی کے لئے ایجاب فاتحہ کا قول اختیار کیا ہے (معارف ص۲/۳۸۴ وفصل ص۴)

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ سلف میں اختلاف صرف اس امر میں تھا کہ امام کے پیچھے بطور استحباب فاتحہ پڑھیں یا ترک کریں۔ ان کے دور کے بعد ایجاب وعدم ایجاب کا اختلاف بن گیا۔ اور ایسا بہت ہوا ہے کہ سلف میں اختلاف ہلکا تھا، بعد کے حضرات نے اس کو بڑھا دیا اور یہی بات ابن حبان نے کوفیوں سے نقل کی ہے کہ وہ ترک کو اختیار کرتے تھے، یہ نہیں کہ اس کو مکروہ یا حرام کہتے تھے، کمافی فتح القدیر، اگرچہ ابن ہمام کی خود اپنی رائے اس کے خلاف ہے۔ تاہم میری رائے ہے کہ ان کا منشا بعض سلف کے مبالغہ کے الفاظ ہیں، جبکہ مبالغہ بعض اختیار وترک والوں سے بھی ہو ہی جاتا ہے حالانکہ ان کی نیت ایجاب وتحریم کی نہیں ہوتی (فصل ص۴) ہم نے اوپر یہ بھی کتاب الام سے ثابت کیا ہے کہ امام شافعی کا قول جدید بھی وجوب کا نہیں تھا، بعض حضرات کو کتاب الام امام شافعی کی قدیم تالیف سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط فہمی ہوئی تھی، اور امام احمد سے زیادہ امام شافعی کے مسلک کو جاننے والا کون ہوگا جنھوں نے دعویٰ کیا کہ ان کے زمانہ تک کوئی بھی وجوب فاتحہ خلف الامام فی الجہر یہ کا قائل نہیں تھا۔

اس تمام تفصیل سے معلوم ہوا کہ امت میں سے وجوب وفرضیت مذکورہ کے قائل بڑوں میں سے صرف امام بخاری وابن حزم ظاہری ہوئے ہیں، اور چونکہ ہم شرح بخاری کر رہے ہیں، اس لئے مناسب ہے کہ ان کے دلائل پر بحث ونظر کریں۔ واللہ الموفق

اکابر کا شکوہ: ابھی اوپر حضرتؒ کا ارشاد نقل ہوا کہ بعض سلف سے بھی چونکہ کچھ مسائل میں مبالغہ آمیز کلمات نقل ہوئے تھے، اس لئے بعد والوں نے اس کو اور بھی بڑھا چڑھا کر اختلاف کی خلیج میں اضافہ کر دیا۔ قراءۃ خلف الامام کے مسئلہ میں درحقیقت اختلاف صرف اختیار وترک کا تھا جس کو امام بخاری نے ایجاب وتحریم کی شکل دے دی، آپ ہی کی روش ابن خزیمہ، دارقطنی، بیہقی وغیرہ نے اپنائی، اور اس زمانہ کے غیر مقلدین نے تو آسمان سر پر اٹھالیا کہ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں بھی اگر کوئی قراءت نہ کرے تو اس کی نماز کو باطل اور کالعدم قرار دینے پر تل گئے۔ جن کے جواب میں پاکستان میں مولانا محمد سرفراز خاں صاحب صفدر نے احسن الکلام دو حصوں میں لکھی اور حضرت مولانا ظفر احمد

صاحب عثمانیؒ نے فاتحۃ الکلام لکھی۔ دونوں نے احقاق کا فریضہ بحسن وخوبی ادا کر دیا ہے، جزاهم الله خير الجزاء

جب بات مبالغہ آرائی کی آئی، تو امام بخاری کا ذکر خیر بھی ناگزیر ہو گیا، وہ صحیح بخاری میں تو بڑی حد تک محتاط بھی رہے ہیں مگر باہر ان کا طریق دوسرے مبالغہ کرنے والوں سے الگ نہیں ہوا۔ اور راقم الحروف کا حاصل مطالعہ تو یہ ہے کہ امام بخاری کے علاوہ دوسرے بھی متعدد اکابر نے کچھ مسائل میں جو نہایت شدت وعصبیت کا رنگ اختیار کیا، وہ بھی امام بخاری ہی کا اتباع ہے۔ جس کی طرف حضرتؒ نے بھی اشارہ فرمایا ہے، واللہ تعالےٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم

مثال کے طور پر حافظ ابن حجر کا شکوہ تو اکثر ہوتا ہی آیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کا طریقہ بھی ہم نے جلد ص ۱۱ میں زیارت وتوسل وغیرہ مسائل کے تحت ذکر کیا ہے، اور ان کے تفردات بھی گنائے تھے، حافظ ابن قیمؒ کی اعلام الموقعین بھی سامنے ہے جو ائمہ مجتہدین کے خلاف شدت وحدت میں لاجواب ہے، بلکہ علامہ موصوف کی دوسری تالیفات قیمہ نافعہ کو پڑھنے والا تو مشکل ہی سے یقین کرتا ہے کہ آپ نے ایسی دل آزار کتاب بھی لکھی ہے، اسی لئے ہندوستان کے غیر مقلدین نے تو اس کا اردو ترجمہ ایسے شوق وولولہ سے شائع کیا ہے کہ گویا دین قیم کی انھوں نے اتنی عظیم الشان خدمت ادا کر دی ہے، جس سے ان کے لئے جنت کی اعلیٰ درجہ کی سیٹیں ریزرو ہو گئیں حالانکہ مسائل ائمہ مجتہدین خصوصاً حنفیہ کے خلاف ان کے دلائل صرف مبالغہ آرائی اور مغالطہ آمیزی پر مشتمل ہیں، ہم نے اسی لئے پہلے کہیں دو بڑوں کا فرق بھی دکھلایا تھا کہ جتنے حافظ ابن تیمیہ فقہ حنفی کے لحاظ سے ہم سے قریب بلکہ اقرب ہیں، اتنے ہی ابن قیم حنفیہ سے بعید اور ابعد ہیں۔

امام بخاریؒ نے حضرت عبادہؓ والی حدیث کا جتنا حصہ اصح تر تھا، وہ صحیح بخاری میں ذکر کر دیا، جس کی سند بھی لاکلام ہے، اور اتنے حصہ سے چونکہ صرف قراءت فی الصلوٰۃ کا وجوب نکل سکتا تھا، اسی لئے باب کا ترجمہ بھی وجوب القراءۃ کا قائم کیا، اور تینوں احادیث الباب سے بھی صرف قراءۃ یا سورۂ فاتحہ کی ضرورت ثابت ہوتی ہے، خلف الامام اور وہ بھی جہریہ کا ثبوت مقتدی کے لئے کسی طرح بھی ان سے نہیں ہوتا، جس میں امام بخاری نے سب سے الگ روش اختیار کی ہے۔

لیکن چونکہ امام بخاری کو اس مسئلہ میں بہت ہی کدواصرار تھا، اس لئے الگ سے مستقل رسالہ تالیف فرمایا، جس کا کچھ تعارف ہم نے اوپر کرایا ہے، مزید یہ کہ دلائل کے علاوہ پورے رسالہ میں جگہ جگہ فقہ حنفی پر تنقید بھی بقول حضرت شاہ صاحبؒ کے درازلسانی کی حد تک کر گئے ہیں۔ اور مبالغہ آرائی بھی رسالہ رفع یدین کی طرح کی ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری کی وہ مثال ہے کہ زور والا مارے اور رونے نہ دے، یہ حضرتؒ کا نہایت ہی اعلیٰ وارفع وسیع ظرف تھا، جس کا اظہار اس مثال سے فرمایا اور ہم نے فتنۂ دیوبند میں بھی حضرتؒ کے صبر وتحمل کی بے نظیر شان دیکھی ہے، لیکن عاجز وضعیف راقم الحروف کے قلب میں اتنی قوت وطاقت صبر وتحمل کہاں؟ اس لئے امام اعظم وفقہ حنفی پر امام بخاری کی تعدی وظلم کی تاب نہ لا کر پہلے بھی رویا ہے (دیکھو مقدمہ انوار الباری ص ۲/۲۱) اور اب بھی امام بخاری کی مار کھا کھا کر برابر روؤں گا اور داستان مظلومیت سب کو سناؤں گا۔

نوارا تلخ ترے زن چو ذوق گریہ کم یابی۔ عدی را تیز بر خاں چو محمل را گراں بینی۔

اور یہ بھی شاید کسی نے احقر جیسے کے لئے ہی کہا ہوگا ۔ ضبط کروں میں کب تک آہ؟۔ چل مرے خامے بسم اللہ

بحث ونظر: (۱) امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ ص ۵ میں حضرت عبادہ ابن الصامتؓ اور عبداللہ بن عمروؓ سے روایت پیش کی کہ نماز فجر میں کسی مقتدی صحابی نے آپ کے پیچھے قراءت کی تو آپ نے فرمایا کہ ہرگز کوئی شخص امام کی قراءت کے وقت قراءت نہ کرے، بجز ام القرآن کے۔ پھر امام بخاری نے فرمایا کہ دو حدیث ہیں ایک یہ اور دوسری من كان له امام فقراءة الامام له قراءة تو اگر یہ دونوں صحیح ہیں تو الا بام القرآن کے ذریعہ فاتحہ کو مستثنیٰ قرار دینا چاہیے، جس طرح حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ساری زمین میرے لئے مسجد وطہور بنادی گئی پھر دوسری حدیث میں الا المقبرة فرما کر اس

کو مستثنی کر دیا۔ اسی طرح فاتحہ کو من کان له امام کے عموم سے خارج کرنا چاہئے۔ اگرچہ اس حدیث میں انقطاع کی علت ہے۔

دوسری بات تارکین قراءت خلف الامام سے یہ کہنی ہے کہ اہل علم اور آپ بھی اس سے متفق ہیں کہ امام قوم کے کسی فرض کا متحمل نہ ہو گا۔ تو قراءت کو بھی تم فرض مانتے ہو مگر کہتے ہو کہ اس فرض کو امام اٹھا لے گا، جہری نماز ہو یا سری، اور یہ بھی کہتے ہو کہ امام سنتوں میں سے کسی کا متحمل نہ ہوگا، جیسے ثناء، تسبیح، تحمید، تو اس طرح تم نے فرض کو نفل سے بھی کم درجہ کا کر دیا، حالانکہ تم بھی عقل و قیاس سے یہی کہتے ہو کہ نفل فرض کی برابر نہیں ہو سکتا، اور فرض کو تطوع سے کم درجہ کا نہ ہونا چاہئے۔

اور یہ بھی تمہارے نزدیک معقول ہے کہ فرض یا فرع کو اسی قسم کے فرض کے برابر کرنا چاہئے، لہٰذا یہی بہتر ہے کہ تم قراءت کو رکوع، جود وتشہد کے برابر کرو جبکہ یہ سب ایک طرح کے فرض ہیں پھر اگر ان میں کسی فرض میں اختلاف ہو تب بھی قیاس والوں کے نزدیک بہتر یہی ہوگا کہ وہ فرض یا فرع کو فرض ہی کے برابر کریں۔

جواب امام بخاری

امام بخاری نے اپنے رسالہ میں سب سے پہلا اثر حضرت علیؓ کا ذکر کیا، جس میں ان کا ارشاد ہے کہ جب امام جہر سے قراءت نہ کرے تو تم سورۂ فاتحہ پڑھو اور اس کے ساتھ ظہر و عصر کی نماز میں پہلی دو رکعتوں میں کوئی سورت بھی ملاؤ، اور باقی دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھو اور مغرب کی آخری اور عشا کی آخری دو رکعت میں بھی اسی طرح پڑھو، ظاہر ہے کہ غیر جہری رکعات میں جواز قراءت سب کے یہاں ہے جس کی وضاحت پہلے ہو چکی ہے۔ اس کے بعد امام بخاری نے حضرت عبادہ والی روایت ذکر کہ جو یہاں صحیح بخاری میں بھی دوسری حدیث الباب ہے۔ یہ منفرد و امام کے لئے ہے، خلف الامام کا اس میں ذکر نہیں تو یہ بھی کسی کے خلاف نہیں۔ پھر آگے حدیث لائے جس میں فصاعدا ہے تو اس کو گرا گئے، حالانکہ اوپر پہلے ہی اثر علیؓ میں فاتحہ کے ساتھ سورت ملانے کا ثبوت لا چکے ہیں، پھر اس کو تو گرایا اور خود ہی اپنے رسالہ میں فصاعدا کے ہم معنی کلمات گیارہ جگہ احادیث و آثار میں لائے ہیں۔ پھر دوسرا کمال آگے یہ دکھائیں گے کہ اسی حدیث عبادہ کو محمد بن اسحاق کی روایت سے لائیں گے جس میں یہ اضافہ ہے کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی سورۂ فاتحہ ضروری پڑھنی چاہئے (ورنہ نماز صحیح نہ ہو گی) حالانکہ محمد بن اسحٰق نہایت ضعیف راوی ہیں اور اسی لئے ان کی روایت بخاری میں نہیں لائے، ورنہ اپنی شرط پر زد پڑتی۔ غرضیکہ باوجود سخت ضرورت کے بھی کہ ترجمۃ الباب میں دعوئے وجوب قراءۃ خلف الامام کا جہری نماز کے لئے بھی کر چکے تھے، اس روایت محمد بن اسحٰق کو نہیں لا سکے، پھر ایک نکتہ ملاحظہ ہو کہ ص ۵ میں بھی پوری سند ذکر نہیں کی، کیونکہ مجروح راوی محمد بن اسحٰق سامنے آ جاتے، اور ص ۱۸ پر جا کر ان کو ظاہر کیا اور اپنی بات پختہ کرنے کے لئے ان کی شان میں شعبہ کا قول ''امیر المحدثین'' کا نکال لائے۔

معلوم نہیں ایسے بڑے ''امیر المحدثین'' سے امام بخاری نے اپنی صحیح میں کیوں اجتناب کیا کہ کہیں بھی ساری بخاری میں ایک حدیث بھی ان سے روایت نہیں کی، اگر احکام شرعیہ کی روایات میں وہ ضعیف یا ضعیف تر تھے جیسا کہ سب کہتے ہیں تو سیر و مغازی میں تو وہ معتبر مانے گئے ہیں، امام بخاری نے تو ان سے مغازی میں بھی کوئی روایت نہیں لی۔ فیا للعجب؟!

علامہ تاج الدین سبکی نے ابو طاہر فقیہ کو امام المحدثین والفقہاء لکھا تھا۔ جس پر صاحب تحفۃ الاحوذی نے ص ۲/۷۵ میں لکھا کہ امام المحدثین ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ ثقہ اور قابل احتجاج بھی ہو اور محقق نیموی نے ابو عبداللہ فنجویہ دینوری کو کبار محدثین میں لکھا تو صاحب تحفہ نے ص ۲/۷۵ میں لکھا کہ ان کے کبار محدثین میں سے ہونے سے یہ ضروری نہیں کہ وہ ثقہ بھی ہوں۔

محمد بن اسحٰق کو ائمہ جرح و تعدیل نے جب کذاب اور دجال تک کہا ہے تو شعبہ کے امیر المحدثین کہنے سے کیونکر توثیق ہو جائیگی؟

امام احمد ان سے سنن میں احتجاج نہیں کرتے تھے، اور کہا کہ وہ تدلیس کرتے تھے، اور وہ حجۃ نہیں تھے (جن کی حدیث سے استدلال کیا جاسکے) یحیٰ بن معین نے کہا کہ وہ ثقہ تھے مگر حجت نہیں تھے، امام مسلم نے ان سے صرف متابعات میں روایت لی ہے، امام مالک نے ان کو دجال جیسا جھوٹا کہا۔ ایک روایت میں ہے کہ شعبہ سے سوال کیا گیا آپ محمد بن اسحٰق کی امیر المومنین فی الحدیث کیوں کہتے ہیں تو جواب دیا کہ ان کے حفظ کی وجہ سے (تہذیب ص۹/۴۰) مگر امام ترمذی نے لکھا کہ بعض محدثین نے ان میں کلام حافظ کی خرابی کی وجہ سے کیا ہے۔ (کتاب العلل ص۲/۲۲) غرض متضاد باتیں بھی ہیں۔

حافظ ابن حجر نے بھی محمد بن اسحٰق کی توثیق کے لئے سعی کی ہے، اور یہ بھی کہا کہ امام مالکؒ نے رجوع کرلیا تھا، حالانکہ خطیب بغدادی نے لکھا کہ امام مالک نے جو محمد بن اسحٰق میں کلام کیا ہے، وہ کسی بھی فن حدیث کے واقف سے مخفی نہیں ہے (تاریخ خطیب ص۱/۲۲۴)

امام بخاری نے علی بن المدینی سے بھی توثیق نقل کی ہے، جبکہ ان سے یہ بھی نقل ہوا کہ لوگوں نے محمد بن اسحٰق کی تضعیف اس لئے کی ہے کہ وہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے روایات لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ (تہذیب ص۹/۴۵)

رہی یہ بات کہ بعض مسائل میں حنفیہ نے بھی ان کی روایات ذکر کی ہیں تو وہ بطور استشہاد اور متابعات کے لی گئی ہیں۔

ان کی روایات پر حنفیہ کے مسلک کا مدار کسی مسئلہ میں بھی نہیں ہے، اور اگر کسی حنفی نے ایسا کیا بھی ہو تو یہ اس کی غلطی ہے۔

امام بخاری نے حدیث من کان له امام فقراء ة الامام له قراء ة میں انقطاع کی علت بتلائی، جبکہ اس کی تصحیح کبار محدثین نے کی ہے وہ ہم آگے لکھیں گے۔ اور امام بخاری نے جو عقل و قیاس والے اعتراضات کئے ہیں وہ اس لئے بے محل ہیں کہ امام کے پیچھے جہری نمازوں میں قراءت سے روکنے کی وجہ قرآن مجید اور حدیث نبوی کا اتباع ہے، امام نفل یا فرض کا متحمل ہوگا یا نہ ہوگا یا کس چیز کا تحمل اسکے لئے عقلا درست ہے اور کس کا نا درست، یہ سب موشگافیاں نقلی و شرعی احکام میں لا یسمن و لا یغنی من جوع کے قبیل سے ہیں۔ واللہ تعالےٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

امام بخاری کے قیاسی و عقلی اعتراضات

صاحب نصب الرایہ علامہ محدث محقق زیلعیؒ نے امام بخاریؒ کے عقلی اعتراضات درج شدہ جزء القراءۃ کا ذکر ایک جگہ کر دیا ہے (نصب الرایہ ص۲/۱۹ تا ص۲/۲۱) اور یہ بھی صراحت کر دی کہ یہ اعتراضات حنفیہ اور دوسرے غیر موجبین قراءت خلف الامام پر عائد کئے گئے ہیں۔ مگر جوابات کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ اور سب سے آخر میں امام بخاری کا یہی اعتراض نقل کیا کہ امام جب سنن کا تحمل نہیں کرتا تو اس کو فرض (قراءت) کا بھی تحمل نہ کرنا چاہیئے، ورنہ فرض کا درجہ سنن سے بھی کم ہو جائے گا۔ ہمارے دوسرے اکابر نے بھی زیادہ جوابات بخاری کا رخ تحقیقی محدثانہ ہی رکھا ہے، البتہ حضرت اقدس نانوتویؒ نے قیاسی و عقلی جوابات پر بھی توجہ فرمائی ہے۔ جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

حضرت نانوتویؒ کے عقلی جوابات

(۱) امام اور مقتدی کی نماز متحد (ایک) ہے یعنی جماعت سے پڑھی جانے والی نماز عرض (چوڑائی) میں ایک نماز ہے، اور نماز کے ساتھ حقیقۃً امام متصف ہے، اور مقتدی اس کے واسطہ سے نماز کے ساتھ متصف ہے، یعنی مقتدیوں کے وصف نماز کے ساتھ متصف ہونے کے لئے امام واسطہ فی العروض ہے۔

(۲) نماز کی اصل حقیقت قراءت قرآن ہے اس لئے وہ صرف امام کے ذمہ رہے گی، اور جو چیز بالعرض نماز کے ساتھ متصف ہونے کے لئے ضروری ہے، یعنی اقتداء کی نیت اس کی حاجت صرف مقتدیوں کو رہے گی، کیونکہ وہی موصوف بالعرض ہیں البتہ حضوری دربار خداوندی کے لحاظ سے جو چیزیں ضروری ہیں مثلاً رکوع، سجدے، قیام، ثناء وغیرہ ان کی حاجت دونوں کو ہوگی۔

(۳) نماز کو "صلوۃ" اس لئے کہا گیا ہے کہ اس کی اصل حقیقت دعا ہے، اور دوسری چیزیں قیام، رکوع سجدے وغیرہ اس کے متعلقات

وملحقات ہیں اور دعا، سورۂ فاتحہ میں ہے، جس کا جواب دوسری سورت میں ہے، جو فاتحہ کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ پس یہی دونوں چیزیں نماز کی اصل حقیقت ٹھیریں۔ جو صرف اس شخص کے ذمہ رہیں گی جو نماز کے ساتھ حقیقۃً متصف ہے، یعنی صرف امام کے ذمہ۔

(۴) عبادت نام ہے معبود کی مرضی کے موافق کام کرنے کا، اس لئے شوق عبادت کا تقاضہ یہ ہے کہ معبود ہی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس سلسلہ میں ہماری رہنمائی فرمائے، لہٰذا یہی نماز کی اصلی غرض ہے، یعنی معبود حقیقی کی تعریف اور عظمت و بڑائی بیان کر کے درخواست ہدایت پیش کرنا اور اس کا جو جواب ملے اس کو غور سے سننا۔ اور اسی کے لئے یہ افضل عبادات (نماز) مقرر ہوئی ہے۔

(۵) قیام وغیرہ کو اس طرح سمجھو کہ قیام درخواست حالی ہے کہ نمازی دست بستہ غلاموں کی طرح قیام کی حالت میں سراپا سوال و درخواست بن جاتا ہے، اور ساتھ ہی زبان قال سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے، پھر سبحانک اللّٰھم الخ سے اس کے وصف بے عیبی، اور بابرکت و عالی شان ہونے کا ذکر کرتا ہے، یہ گویا سلام دربار ہے، پھر شیطان سے استعاذہ کر کے، اللہ تعالے کا نام لے کر الحمد شریف پڑھتا ہے، جس میں اول اللہ تعالیٰ کی تعریف، اس کی تربیت عامہ و رحمتِ خاصہ کا تذکرہ کرتا ہے، اس کی مالکیت اور جزاء و سزاء کے اختیارِ مطلق کا اعتراف کرتا ہے، اس کے بعد ہدایت کی درخواست پیش کرتا ہے، اور اس کا جو جواب ملتا ہے، اسے غور سے سنتا ہے، پس فاتحہ کے بعد قرآن مجید کی دوسری آیات وسورت کا پڑھنا ہی درخواست کا جواب ہے۔ پھر درخواست منظور ہونے کے شکریہ میں نمازی آداب و نیاز بجالاتا ہے، یعنی رکوع وسجدہ کرتا ہے۔

(۶) رکوع کو ایک لحاظ سے سوال حالی بھی کہہ سکتے ہیں کہ نمازی کا اس سے حضرت حق کی طرف میلان اور جھکاؤ ثابت ہو رہا ہے، جو ایک سراپا احتیاج کا غنی ومغنی کی طرف ہونا ہی چاہیئے اور اس کے بعد سجدہ میں گر کر اپنے کامل انقیاد و امتثال کو ظاہر کر رہا ہے، کہ منقاد کا زیرِ حکم منقادلہ ہونا اس ذات باری کے ترفع اور اس کے تسفل پر اور اس کے تعزز اور اس کے تذلل پر دلالت کرتا ہے۔

(۷) اگر مقتدی امام کو رکوع کی حالت میں پائے تو مقتدی سے فریضۂ قیام (جو نماز کے اہم ارکان میں سے ہے) ساقط ہو جاتا، اسی لئے مقتدی کو چاہیے کہ قیام کی حالت میں صرف تکبیر تحریمہ کہہ کر فوراً امام کے ساتھ رکوع میں جاملے۔

یہ مسئلہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ مقتدی مجازاً مصلی ہے اور چونکہ اس پر امام کے پیچھے قراءت[1] واجب نہیں ہے، اس لئے رکوع سے پہلے

---

[1] اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام جو بروئے حدیث صحیح ترمذی وابوداؤد وابن ماجہ ومسند احمد (الامام ضامن) اپنے سارے مقتدیوں کا ضامن وکفیل ہے، وہ اصل حقیقت نماز قراءت فاتحہ وسورت کی وجہ سے ہے اسی لئے اس کی قراءت کی وجہ سے مدرک رکوع کو نہ قراءت کی ضرورت رہی نہ قیام کی، اور یہ مسئلہ سب کا متفقہ و اجماعی ہے، بجز امام بخاری کے کہ صرف ان کے نزدیک مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں ہوتا اور انھوں نے اپنے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی ملانا چاہا اور ص ۷۱ جزء القراءۃ میں لکھا کہ ادراک رکعۃ بادراک رکوع کے قائل صحابہ میں سے وہ حضرات تھے جو قرأۃ خلف الامام کے قائل نہ تھے، لیکن قراءت خلف الامام کے قائل حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے یہی ہے کہ رکوع پانے والے مقتدی کی وہ رکعت جب تک محسوب نہ ہوگی کہ وہ امام کو قیام کی حالت میں نہ پالے۔

اس بارے میں گذارش ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے صرف یہ ہے کہ امام کو رکوع سے قبل پالینا چاہیئے یعنی جھکنے سے قبل شریک ہو جانا ضروری ہے، یہ نہیں ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے قراءت فاتحہ بھی کر لے تو اس سے حضرت ابو ہریرہؓ کا قائلین وجوب قراءۃ فاتحہ خلف الامام میں شامل کرنا کیسے درست ہو گیا؟ دوسرے یہ کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے جو یہ ثابت ہوا کہ آپ نے فرمایا "اقرأ بہا فی نفسک یا فارسی!" اس کی مراد میں اختلاف ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فاتحہ کی نہایت اہمیت کا خیال فرما کر یہ چاہا کہ نمازی دل میں ہی ان مضامین کا خیال و دھیان قائم رکھے جو فاتحہ کے ہیں۔ اور حسب تحقیق حضرت نانوتوی "حقیقت نماز ہی فاتحہ وسورت کی قراءت ہے، اور حدیث صحیح قسمت الصلوٰۃ الخ سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ نماز کی روح فاتحہ ہی ہے۔ غرض حضرت ابو ہریرہؓ کی بھی سارے اکابر صحابہ سے الگ یہ رائے بظاہر نہیں تھی کہ جہری نماز میں مقتدی امام کے پیچھے قراءت کریں۔ پھر مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۷۷/ا باب من کرہ القراءۃ خلف الامام میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی یہ مرفوع روایت بھی مروی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: "امام اسی لئے ہے کہ اس کی اتباع کی جائے لہٰذا جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب قراءت کرے تو تم خاموش رہو"۔

امام بخاری نے اپنے جزء القراءۃ ص ۵ میں حضرت عائشہؓ کی طرف بھی یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ قراءت خلف الامام کے لئے حکم کرتی تھیں، حالانکہ ان کا قول مذکور بھی صرف غیر جہری نماز کے لئے ہے، جہری کے لئے نہیں ہے (اور سری میں سب کے نزدیک گنجائش ہے) (دیکھو فصل الخطاب ص ۳۶)

اس کے لئے قیام بھی فرض نہ رہا۔ قیام قراءۃ ہی کی وجہ سے تھا، جب قراءت اس کے ذمہ نہیں تو قیام کا مطالبہ بھی ختم ہو گیا، پھر باقی رکعتوں میں جو وجوب قیام ہوگا وہ بحکم حضور دربارخداوندی ہے، بحکم صلوٰۃ نہیں۔

(۸) بعض حضرات یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اگر امام موصوف بالذات ہے اور اس وجہ سے امام اور مقتدیوں کی نماز واحد ہے تو مقتدیوں کے ذمہ طہارت، ستر عورت، استقبال کعبہ، رکوع وسجدہ بھی نہ ہونا چاہیئے۔ اس بار کا تحمل بھی قراءت کی طرح صرف امام کے ہی سر رہتا، بلکہ سبحانک، تسبیحات، التحیات، درود ودعا اور تکبیر کو تسلیم بھی جس درجہ میں مطلوب ہیں، امام سے ہی مطلوب ہوتیں، اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی بصورت حضوری دربارخداوندی ہوتی ہے، اور یہ بات اس کے ہر قول وفعل سے ظاہر ہوتی ہے، سبحانک میں کاف خطاب، اہدنا میں صیغۂ خطاب، اور دست بستہ کھڑا ہونا، پھر کبھی جھکنا، کبھی سر زمین پر رکھ دینا، اور نماز سے فارغ ہونے پر دائیں بائیں سلام پھیرنا کہ بوقت نماز گویا اس عالم امکان اور عالم ظلماتی سے باہر عالم وجوب یعنی بارگاہ ذی الجلال والاکرام میں چلا گیا تھا، یہ سب امور بتلاتے ہیں کہ نماز نام ہے حضوری دربارخداوندی کا پھر نماز جماعت میں چونکہ امام واسطہ بنتا ہے خالق ومخلوق کے درمیان، اور اسی لئے وہ سب سے آگے اور قبلہ کی دیوار سے قریب کھڑا ہوتا ہے اور سارے مقتدی اس کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں تو گویا اس وقت امام ومقتدی سب دربارخداوندی میں حاضر ہیں، تو جس طرح احکام دنیا کے دربار میں حاضری کے لئے صفائی پاکی، لباس کی درستگی، بوقت حاضری ان کی طرف توجہ اور آداب دربار کی بجا آوری ضروری ہوتی ہے، اسی طرح دربارخداوندی میں حاضری کے لئے یہ سب امور ضروری ہوں گے۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب امور وصف صلوٰۃ (نمازیت) کے تقاضے سے نہیں ہیں، ورنہ **لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب** کے پیش نظر لازم ہوتا کہ شروع سے آخر تک صرف فاتحہ ہی فاتحہ ہوتی، دوسرا کوئی امر نہ ہوتا، پس ثابت ہوا کہ یہ سب دوسرے امور حضوری دربار کے تقاضے سے ہیں، نماز کے مقتضیات نہیں ہیں کہ نماز کی حقیقت اور مقتضٰی صرف قراءت ہے،

اس کے بعد یہ سمجھنا چاہیئے کہ حضوری دربار میں امام ومقتدی سب مشترک ہیں تو اس کے مقتضیات میں بھی سب مشترک رہیں گے، اور نماز کی حقیقت مذکورہ کے لحاظ سے امام تنہا ہے، تو قراءت صرف اس کے ذمہ رہے گی۔

اس تفصیل سے امام بخاریؒ کا یہ اعتراض ختم ہو گیا کہ ثناء، دعاء اور تسبیحات جو چنداں ضروری نہیں ہیں وہ تو مقتدیوں کے ذمہ رہیں اور قراءت بالخصوص فاتحہ (جو نماز کا اہم رکن ہے) مقتدی کے ذمہ نہ رہے، یہ عجیب بات ہے۔

خلاصہ یہ کہ آداب دربار وسلام وغیرہ تو سب ہی حاضران دربار بجالایا کرتے ہیں اور عرض مطلب واستماع جواب کے لئے کسی ایک ہی کو آگے بڑھایا کرتے ہیں، اور وہ بھی جس کو سب سے لائق وفائق خیال کرتے ہیں۔ اس لئے اگر ثناء، تسبیحات، التحیات اور تکبیرات سب ہی بجالائیں، اور قراءت جو درحقیقت عرض مطلب ہے، یا ادھر کا جواب، وہ فقط امام ہی کے ذمہ پر رہے تو کیا بے جا ہے؟!

آخر میں حضرت نانوتویؒ نے لکھا کہ نماز جماعت کی ایسی معقول ومقبول صورت کے باوجود اگر امام ابوحنیفہؒ پر طعن کئے جائیں اور غیر موجبین قراءت خلف الامام پر الزامات دھرے جائیں تو یہ انصاف کی راہ نہیں ہے۔ اس کے بعد ہم حضرت گنگوہیؒ کے نقلی جوابات کا بھی خلاصہ پیش کرتے ہیں:۔

حضرت گنگوہیؒ کے نقلی جوابات:

حضرتؒ نے جو مستقل رسالہ (ہدایۃ المعتدی فی قراءۃ المقتدی) زیر بحث مسئلہ پر لکھا تھا، اس کا جو خلاصہ اعلاء السنن ص ۱۱۵/۴ میں نقل کیا گیا ہے اس کو یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

(۱) قراءت خلف الامام ابتداء اسلام میں تھی، محدث بیہقیؒ نے روایت پیش کی کہ صحابہ کرام حضور علیہ السلام سے تلقی کرتے تھے کہ

جب آپ قراءت فرماتے تو وہ بھی آپ کے ساتھ قراءت کرتے تھے، حتی کہ سورۂ اعراف کی آیت اتری **واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا**، اس کے بعد آپ پڑھتے تھے تو وہ خاموش رہتے تھے۔

دوسری روایت بیہقی وعبد بن حمید وابوالشیخ نے نقل کی کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے اور قراءت کرتے تو آپ کے اصحاب بھی قراءت کرتے تھے، پھر آیت **فاستمعوا له وانصتوا** اتری تو سب لوگوں نے سکوت اختیار کیا اور صرف حضور علیہ السلام پڑھتے تھے۔

نیز بیہقی، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے روایت کی کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے اپنے اصحاب کو نماز پڑھائی تو کچھ لوگوں کو سنا کہ وہ آپ کے پیچھے قراءۃ کرتے تھے، آپ نے نماز کے بعد فرمایا:۔ کیا تمہارے لئے وقت نہیں آیا کہ تم آیت قرآنی **واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا** کا مطلب سمجھو۔

(۲) مذکورہ روایات سے ثابت ہوا کہ قراءۃ خلف الامام شروع زمانہ میں تھی، پھر آیت مذکورہ سے منسوخ ہوگئی۔ اور جس نے یہ کہا کہ آیت مذکورہ خطبہ کے بارے میں اتری تھی، وہ ہرگز صحیح نہیں ہے، کیونکہ اول تو جمعہ کی فرضیت مدینہ طیبہ میں ہوئی، اور جو لوگ مکہ معظمہ میں کہتے ہیں، وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ حضور علیہ السلام اس کو مکہ معظمہ میں قائم نہ کر سکے تھے، اور جب وہاں جمعہ نہیں پڑھا گیا تو خطبہ کیسے ہوا اور کس طرح صحابہ نے اثناء خطبہ میں کلام کیا، جس پر آیت مذکورہ اتری؟ اگر کہا جائے کہ صرف یہ آیت مدینہ طیبہ میں اتری ہوگی، تو یہ بھی غلط ہے، کیونکہ سارے محدثین ومفسرین نے پوری سورۂ اعراف کو بلا کسی آیت کے استثناء کے مکیہ کہا ہے، پھر یوں بھی حکم عموم لفظ پر ہوتا ہے خصوص مورد پر نہیں، لہٰذا قرآن مجید کی تلاوت کے وقت استماع وانصات کا حکم عام ہی رہے گا، اور جن بعض روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آیت مذکورہ، نماز وخطبہ دونوں کے بارے میں اتری ہے ان کا مطلب بھی یہ ہے کہ آیت کا حکم دونوں کو شامل ہے۔

(۳) غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ قرائۃ مقتدی آیت مذکورہ کے ذریعہ مکہ معظمہ ہی میں منسوخ ہوگئی تھی، اور اس سے مہاجرین سابقین واقف بھی ہو گئے تھے، جیسے عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ، پھر جب حضور علیہ السلام نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی، اور نماز جماعت کبیرہ کے ساتھ ہونے لگی۔ جس میں نسخ قراءت خلف الامام سے واقف مہاجرین سابقین بھی تھے، اور اس سے ناواقف دوسرے حضرات بھی تھے، لہٰذا کچھ لوگوں نے آپ کے پیچھے قراءت کی، اور وہ آپ پر بھاری ہوئی اور وہ تھی بھی بغیر آپ کے حکم وعلم کے۔ اسی لئے حسب روایت حضرت عبادہؓ آپ نے نماز کے بعد فرمایا:۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، دوسری روایت میں ہے کہ شاید تم پڑھتے ہو، ایک اور روایت میں بطور سوال فرمایا کیا تم پڑھتے ہو؟ تو اگر ان کی قراءت آپ کے علم وحکم سے ہوتی تو ظاہر ہے اس طرح استفسار نہ فرماتے۔ بلکہ آپ کے علم میں یہ ہوگا کہ آیت اعراف کی وجہ سے سب ہی صحابہ نے قراءت ترک کردی ہوگی، اور جب ان کی قراءت کا علم واحساس ہوا تو وہ آپ پر گراں ہوئی اس لئے استفسار فرمالیا، اور ان کے اعتراف کے بعد منازعت امام سے ان کو روک دیا جس سے سکتات کے اندر ان کو قرائۃ بلا منازعت کی اجازت پھر بھی باقی رہ گئی۔

(۴) بعض حضرات سے حکم مذکور کی رعایت نہ ہو سکی، اور مکرر حضور علیہ السلام پر ان کی قراءۃ بار خاطر ہوئی تو آپ نے پھر ان کو قراءۃ سے روکا اور صرف فاتحہ پڑھنے کی اجازت سکتوں کے اندر باقی رکھی۔ کیونکہ اس میں منازعت کم تھی کہ وہ اکثر لوگوں کو یاد تھی، سہولت سے اس کو سکتوں کے اندر تیزی سے پڑھ سکتے تھے۔

(۵) پھر جب نماز جماعت میں اور بھی زیادہ اجتماع ہونے لگا، اور ان کی محتاط سری قراءت سے بھی تشویش کی صورت پیدا ہوئی تو آپ نے ان کو **اذا قرأ فانصتوا** اور **من کان له امام فقراءته له قراءة** فرما کر بالکل ہی قراءت سے روک دیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

(نوٹ) صاحب اعلاء السنن نے حضرت گنگوہیؒ کے ارشادات ختم کر کے لکھا کہ توجیہ مذکور بہت اچھی ہے جس سے ساری روایات

جمع ہو جاتی ہیں، لیکن اس میں بعض احادیث کے تقدم کا اور بعض کے تاخر کا دعوے، بغیر تاریخی معرفت و وثوق کے محل تامل ہے البتہ ہمارے حنفی اصولین کا یہ قاعدہ یہاں چل سکتا ہے کہ جہاں تقدم و تاخر کا یقینی علم نہ ہو سکے تو ممانعت والی احادیث احادیث مبیحہ کے لئے ناسخ ہوتی ہیں۔ واللہ تعالےٰ اعلم (۔۔۔۴/۱۱۷)

حضرت گنگوہیؒ نے اپنے رسالہ میں منقولات وقرائن کے ذریعہ یہ بھی ثابت فرمایا کہ اکثر صحابہ کرام کا مذہب مطلقاً ترک قراءۃ خلف الامام تھا اور یہ بھی محقق کیا کہ قراءۃ خلف الامام والی روایات الباب سے وجوب قراءۃ ثابت کرنا صحیح نہیں ہے۔ وغیرہ پورا رسالہ پڑھنا چاہیے۔ (امام بخاری کا استدلال صحابہ وتابعین سے) ص ۵ جزء القرأۃ میں امام بخاری نے بہت سے صحابہ وتابعین کے نام لکھے اور ان کو قائلین قراءت خلف الامام کے زمرے میں شامل کیا، حالانکہ تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ مطلقاً اس کے قائل نہ تھے، بلکہ سری نمازوں میں یا جہری میں سکتات کے اندر پڑھنے کے قائل تھے، جس کا کوئی مخالف نہیں ہے، حضرت حسن بصری اور سعید بن جبیرؒ سے بھی سکتۂ امام کے وقت یا دل میں پڑھنے کی قید ہے۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱/۳۷۶ میں حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، حضرت زید بن ثابت وغیرہ صحابہ سے قراءت خلف الامام کی مخالفت ثابت ہے، اور امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کی طرف بھی امر قراءۃ خلف الامام کی نسبت غلط کی ہے، کیونکہ ان کا قول بھی غیر جہری کے لئے ہے۔

امام بخاری اور سکتات کی بحث

جزء القراءۃ ص ۶ میں امام بخاریؒ نے بعض آثار سے یہ ثابت کیا کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قراءۃ فاتحہ سکتات کے اندر ہونی چاہیے، چونکہ اسی بات کو امام بخاری آگے ص ۲۹ میں مستقل باب قائم کر کے لائیں گے، اس لئے یہاں صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ وغیرہ میں اس کی تضعیف کے لئے بہت کافی لکھدیا ہے، جس کو غالباً اس زمانہ کے غیر مقلدین بھی ضرور تسلیم کریں گے۔

پھر اس کے بعد امام بخاری نے امام اعظمؒ پر سخت لہجہ میں اعتراضات کئے ہیں، مثلاً یہ کہ انھوں نے قراءت بالفارسی کی اجازت دی حالانکہ یہ مسئلہ رجوع شدہ ہے، اور یہ کہ انھوں نے فرض کو تطوع سے کم درجہ میں کر دیا، اور بعض امور شرعیہ میں حضور علیہ السلام کے ارشادات کے برعکس حکم کر دیا ہے، ان سب اعتراضات کی حقیقت اور جوابات ہم الگ سے ایک جگہ کر کے تحریر کریں گے، ان شاء اللہ۔

اثر حضرت عمرؓ وغیرہ: ص ۷ میں امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ کا اثر ذکر کیا کہ وہ امام کے پیچھے بھی قراءت کی اجازت دیتے تھے اور حضرت ابی بن کعب سے بھی ایسا ہی نقل کیا، لیکن ان دونوں اثر میں جہری کی صراحت نہیں ہے، اور سری میں سب جواز کو مانتے ہیں، پھر حضرت علیؓ سے نقل کیا کہ وہ ظہر وعصر میں قراءت فاتحہ وسورت پڑھنے کو اچھا سمجھتے تھے، تو یہاں تو جہری کی خود ہی نفی موجود ہے دوسرے یہ کہ امام بخاری وغیرہ فاتحہ کی طرح سورت پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، تو یہ ان کی تحقیق فصاعداً والی کے خلاف ہوگا۔

روایت محمد بن اسحٰق وغیرہ: ص ۸ میں امام بخاریؒ نے وہی حضرت عبادہ والی روایت محمد بن اسحٰق کے واسطہ سے نقل کی، جس کے کمال ضعف کا حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں، پھر ص ۹ میں روایت **ابو قلابه عن محمد بن ابی عائشه عن من شهد ذلک** نقل کی، اس میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ ابو قلابہ اگرچہ ثقہ تھے، مگر نمبر ایک کے مدلس تھے، کہ بقول علامہ ذہبی ان سے بھی تدلیس کرتے ہیں جن سے ملے ہیں اور ان سے بھی جن سے نہیں مل سکے، (میزان ص ۲/۳۹)

علماء اصول حدیث کا یہ فیصلہ ہے کہ حدیث صحیح کی صفت یہ ہے کہ اس میں حضور علیہ السلام سے روایت ایسے صحابی کے ذریعہ ہو، جس کے نام وغیرہ میں کوئی جہالت نہ ہو، یعنی وہ پوری طرح معلوم ومشخص ہو (معرفۃ علوم الحدیث) مقدمہ مسلم وغیرہ) علامہ جزائری نے اس کی وجہ بھی بیان کی کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں منافق بھی تھے اور مرتد بھی، جب تک راوی صحابی کا نام نہ بتلائے گا اور اس کا صحابی ہونا معلوم نہ ہوگا اس

کی روایت قابل قبول نہ ہوگی۔ الخ پوری تفصیل اور استدلال بخاری وبیہقی کا جواب احسن الکلام ص۸۹ تا ص۹۳ جلد دوم میں قابل مطالعہ ہے۔

حدیث سیدنا حضرت ابو ہریرہؓ: ص۱۰ و ص۱۱ میں امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی آٹھ روایات درج کی ہیں ان میں سے کسی میں یہ ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز نہیں ہوتی، یہ سب ہی کو تسلیم ہے، کیونکہ حنفیہ بھی بغیر فاتحہ کی نماز کا اعادہ ضروری بتلاتے ہیں البتہ اس حدیث کو سارے ائمہ نے صرف منفرد کے لئے قرار دیا ہے، ترمذی شریف میں خود راوی حدیث اور حضرت امام احمدؒ سے نقل ہوا کہ یہ حکم تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے ہے یا امام کے لئے۔ مقتدی کے لئے نہیں ہے۔

اور کسی حدیث میں ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز ناقص ہوگی، یہ بھی سب کو تسلیم ہے، اور مقتدی کے لئے جہری نماز میں سب یہ کہتے ہیں کہ امام کی قراءت مقتدی کے لئے کافی ہے، لہٰذا اس کی نماز بھی بغیر فاتحہ کے نہ ہوئی۔

حدیث قدسی: ایک حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:۔ میں نے نماز کو اپنے اور بندے کے درمیان نصفا نصفی کر کے تقسیم کر دیا ہے، جب وہ الحمد للّٰہ رب العالمین کہتا ہے تو اس نے میری حمد کی، اور اس کو جو چاہے گا ملے گا، پھر وہ الرحمن الرحیم کہتا ہے تو اس نے میری ثناء کی اور اس کو جو چاہے گا ملے گا، پھر وہ مالک یوم الدین کہتا ہے تو اس نے میری بڑائی بتلائی، پھر وہ ایاک نعبد و ایاک نستعین کہتا ہے تو یہ آیت آدھی میری ہے اور آدھی بندے کے لئے، پھر وہ عرض کرتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین. یہ سب بندے کے لئے ہیں، اور میرے بندے کو وہ سب ملے گا جس کی اس نے خواہش کی۔ درحقیقت یہ حدیث البخاری کامل ومکمل طور سے ہماری حجت ہے، کیونکہ اس میں پوری نماز کی حقیقت سورۂ فاتحہ بتلائی گئی ہے، اور اس کی قراءت نماز میں سب کے نزدیک منفرد وامام کے لئے ضروری ہے، اور پہلے مقتدی بھی امام کے ساتھ پڑھا کرتے تھے جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن جب سے آیت کریمہ "واذا قری القرآن فاستمعوا لہ و انصتوا" نازل ہوئی، مقتدیوں نے امام کے پیچھے قراءت کو ادب قراءۃ امام کے خلاف سمجھا اور تعمیل ارشاد خداوندی میں صرف استماع وانصات کو اختیار کر لیا، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قراءت مقتدی کا ترک کسی اور وجہ سے نہیں ہے کہ غیر موجبین پر عقلی اعتراض کیا جائے کہ انھوں نے فرض کو تطوع سے کم درجہ میں کر دیا وغیرہ۔

اثر عطاء کا جواب: امام بخاریؒ نے ص۱۴ میں حضرت عطا کا اثر ذکر کیا کہ امام جب جہری قراءت کرے تو اس سے پہلے یا بعد اس کے سکوت کے سورۂ فاتحہ پڑھ لے، لیکن جب امام قراءت کر رہا ہو تو خاموش رہے لقولہ عزوجل واذا قری القرآن فاستمعوا لہ و انصتوا. حضرت عطاء کا فتویٰ مذکورہ بھی امام بخاری اور غیر مقلدین کے موافق نہیں ہے، بلکہ حنفیہ وغیرہم کے موافق ہے، کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ آیت مذکورہ حضرت عطا کے نزدیک بھی قراءت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے خطبہ کے بارے میں نہیں جو امام بخاری کا خیال ہے، اور ہم بھی اس سے منع نہیں کرتے کہ کوئی موقع مل سکے تو پڑھ لے، جیسے سری میں جواز ہے، مگر وجوب نہیں مانتے، نہ امام بخاری وابن حزم کے علاوہ اکابر امت میں سے کوئی امام کے پیچھے اس کا قائل ہوا ہے۔

حدیث حضرت انسؓ سے استدلال: ص۲۸ جزءالقراءۃ میں امام بخاریؒ نے حدیث انسؓ سے استدلال کیا، حالانکہ یہ روایت بھی ضعیف ہے کیونکہ اس میں ابوقلابہ مدلس موجود ہیں اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔ اس روایت میں ابوقلابہ نے عن انس روایت کی ہے، دوسرے اس کی سند میں اضطراب بھی ہے یہاں بھی جزءالقراءۃ کے اندر کسی میں عن انس اور کسی میں عن النبی ﷺ ہے، اور دارقطنی وبیہقی وغیرہ میں عن محمد بن ابی عائشہ عن رجل من اصحاب رسول اللہ ﷺ ہے، اور متن میں بھی اضطراب ہے کہ یہاں جزءالقراءت کی ایک روایت میں ولیقرأ احدکم بفاتحۃ الکتاب فی نفسہ اور دوسری میں صرف لیقرأ بفاتحۃ الکتاب ہے کتاب القرائۃ کی ایک روایت میں یہ عبارت فلا تفعلوا پر ختم ہوگئی ہے دوسری میں جملہ استثنائیہ بھی ہے، پھر فی نفسہ کا مطلب دل میں پڑھنے کے بھی ہیں یا دھیان کرنے کے، لہٰذا اس سے قراءت خلف الامام

کا ثبوت نہ ہوگا۔ نیز حضرت انسؓ سے بسند صحیح یہ روایت مروی ہے ہے کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو (کتاب القراءۃ ص ۹۲)

اثر سعید بن جبیر کا جواب

امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ ص ۲۹ میں حضرت سعید بن جبیرؒ کا فتوے نقل کیا ہے کہ ان سے عبداللہ بن عثمان بن خثیم نے سوال کیا کہ کیا میں امام کے پیچھے قراءت کروں؟ فرمایا ہاں! اگر چہ تم اس کی قراءت بھی سنتے ہو، لوگوں نے نیا طریقہ نکالا ہے جو سلف نہیں کرتے تھے، سلف کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی امام ہوتا تو وہ تکبیر کہہ کر خاموش رہتا تھا یہاں تک کہ اس کے خیال میں مقتدی فاتحہ پڑھ لیتے تھے، پھر وہ قراءت کرتا اور مقتدی خاموش رہتے تھے۔

اس سے حالت سکتہ میں قرائۃ کا ثبوت ہوا، جن سے کسی کو اختلاف نہیں، اور وجوب کی کوئی دلیل نہیں، کیونکہ امام پر سکتہ طویلہ کا واجب ہونا کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں ہوا، حافظ ابن تیمیہ بھی یہی کہتے ہیں، پھر یہ کہ تکبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ تو ثنا کے لئے ہے، جس میں امام بھی ثنا پڑھتا ہے، اور یہ مختصر وقفہ ہوتا ہے اور دونوں سورتوں کو جدا کرنے کے لئے امام کے ساتھ آمین کا توافق ہونا چاہیئے، اور اس طرح یہاں مقتدیوں کی آمین ان کی فاتحہ سے قبل ہوجائے گی جو قلب موضوع ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۷۷/۱ میں حضرت سعید بن جبیرؒ کا فتویٰ دوسری طرح ہے کہ ان سے قراءت خلف الامام کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ امام کے پیچھے قراءت نہیں ہے۔ اس کے سب راوی ثقہ ہیں جن سے اصحاب صحاح نے احتجاج کیا ہے لہٰذا ان کا جو فتوے نص قرآنی واذا قرئ القرآن فاستمعوا له و انصتوا اور حدیث صحیح واذا قرأ فانصتوا اور حدیث صحیح من كان له امام فقراء ته له قراءة کے موافق ہوگا وہی راجح وصحیح ہوگا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت سعید بن جبیرؒ نے فرمایا:۔ جب تم امام کی قراءت نہ سن رہے ہو تو اگر چاہو اپنے دل میں پڑھ لیا کرو۔ (مصنف ص ۳۷۴/۱)

ایک روایت امام ابن جریر نے عبداللہ بن مبارک کے طریق سے روایت کی کہ ثابت بن عجلان نے حضرت سعید بن جبیرؒ سے سنا کہ آیت اذا قرئ القرآن خطبہ، جمعہ اور جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کی ممانعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے (تفسیر ابن کثیر ص ۲۸۳/۲)

آخر میں یہ امر بھی امام بخاری کے استدلال کے سلسلہ میں قابل ذکر ہے کہ ان کی اس روایت میں ایک راوی عبداللہ بن رجا مکی ہے جس کے لئے امام احمد واوزاعی نے کہا کہ اس کی روایت میں نکارت ہوتی ہے، ساجی نے ''عنده مناكير'' کہا (میزان ص ۳۷/۲ وتہذیب ص ۲۱۱/۵) دوسرا راوی عبداللہ بن عثمان بن خثیم ہے، امام رجال یحییٰ بن معین نے کہا کہ اس کی احادیث قوی نہیں ہیں۔

ابوحاتم نے کہا کہ قابل احتجاج نہیں۔ امام نسائی نے اس کو لین الحدیث کہا (میزان الاعتدال ص ۲/۵۶) ابن حبان نے صاحب خطا کہا، ابن المدینی نے منکر الحدیث بتلایا، (تہذیب ص ۵/۳۱۵) دارقطنی نے کہا کہ دوسرے محدثین نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ (نصب الرایہ ص ۱/۳۵۳)

امام بخاریؒ کے دلائل نمبر ۲ اور اعتراضات رسالۂ جزء القراءۃ میں

اوپر ہم نے امام بخاریؒ کے دلائل نمبر ا جہریہ نمازوں میں وجوب قراءۃ خلاف الامام کے مع جوابات ذکر کئے ہیں، ان کے علاوہ یا تو انہوں نے وہ احادیث وآثار پیش کئے ہیں جن سے مطلقاً قراءۃ فاتحہ کا ثبوت ہوتا ہے۔ یا مطلقاً قرائۃ خلف الامام کا، کہ جہری وسری کی تعیین کچھ نہیں ہے اور ہم نے اوپر بتلایا ہے کہ نماز کے لئے ہمارے سب کے نزدیک بھی نہ صرف مطلق قرائۃ قرآنِ مجید ضروری، بلکہ تعیین کے ساتھ سورۂ فاتحہ کے ساتھ چند آیات یا سورت کا پڑھنا بھی ضروری ہے، ورنہ نماز قابلِ اعادہ ہوگی۔ اختلاف صرف اقتدا کی صورت میں ہے کہ سارے صحابہ وتابعین، ائمۂ مجتہدین، محدثین ومفسرین جہری نماز میں امام کے پیچھے وجوب قرائۃ فاتحہ کے منکر ہیں، حتیٰ کہ امام شافعیؒ کا بھی

آخری فیصلہ یہ ہے کہ صرف اس صورت میں کہ امام کی آواز مقتدی کو نہ آرہی ہو تو فاتحہ پڑھ لے۔ اس قید سے معلوم ہوا کہ، اگر آواز آرہی ہو تو بغیر پڑھے بھی نماز صحیح ہو جائے گی۔

امام بخاری وغیرہ کے خلاف امام احمد کا اہم فیصلہ

اور یہی مذہب امام احمد کا بھی ہے، اور انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نہیں جانتا کہ اہلِ اسلام میں سے کوئی بھی یہ کہتا ہو کہ جس نے امام کے پیچھے قرائۃِ فاتحہ نہ کی۔ اس کی نماز نہ ہوگی چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ وتابعین اور اہلِ حجاز میں امام مالک، اہل عراق میں سفیان ثوری، اہلِ شام میں اوزاعی، اہلِ مصر میں لیث بن سعد، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب امام قرائۃ کر رہا ہو اور مقتدی قراءت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہے۔ (مغنی ابن قدامہ ص ۱\۶۰۶)

اس سے معلوم ہوا کہ جہری نماز میں امام احمدؒ کے زمانہ تک کوئی بھی اس امر کا قائل نہ تھا، جس کے قائل امام احمد کے بعد سب سے پہلے امام بخاری ہوئے اور ان کی وجہ سے کچھ شافعیہ بھی وجوب کے قائل ہوئے، مثلاً ابن خزیمہ وبیہقی وغیرہ (کما حققہ الشیخ الانورؒ) اور کچھ شافعیہ بھی اس لئے وجوب کے قائل ہو گئے کہ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ امام شافعی کا جدید قول وجوب کا تھا، حالانکہ کتاب الام کی آخری جلد نمبر ۷ میں امام شافعی کا قول عدمِ وجوب کا آچکا تھا، اور امام احمد کی تصریح بھی یہی بتلا رہی ہے جو امام شافعیؒ کے مذہب سے بھی پورے واقف تھے، مگر کچھ لوگ اس مغالطہ میں پڑ گئے کہ کتاب الام امام شافعی کی طرف منسوب قدیم تالیف ہے۔ حالانکہ وہ جدید اور زمانۂ قیام مصر کی ہے۔

امام بخاری اور غیر مقلدینِ زمانہ

امام بخاری کے بعد جہری میں وجوب کے قائل ابن حزم ظاہری ہوئے ہیں اور ان کے بعد ہند و پاک کے غیر مقلدین، جو دعوے کرتے ہیں کہ اگر جہری نماز میں امام کے پیچھے مقتدی نے فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز باطل اور کالعدم ہوگی جیسے اس نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ اور اپنے اس غلط دعوے کو ثابت کرنے کے لئے پوسٹر اور رسالے لکھ کر شائع کرتے ہیں اور عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔

مخالفین امام احمد کے لئے حنابلہ کی سرپرستی

بڑی حیرت اس پر ہے کہ امام احمد کے مذکورہ بالا صریح فیصلے کے خلاف کرنے والوں کو سعودی حکومت کی سرپرستی اور بڑی بڑی امدادیں مل رہی ہیں، جس حکومت کے علماء داعیان کا مذہب حنبلی ہے۔

مسئلہ طلاق ثلاث اور غیر مقلدین کا فتنہ:

اسی طرح یہ غیر مقلدین جو اپنے کو سلفی بھی کہتے ہیں امام احمدؒ کے صریح فیصلہ کے خلاف ایک ساتھ تین طلاق دینے والے کا نکاح فسخ نہیں مانتے اور سارے ہند و پاک کے مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ ایسے آدمی اپنی بیویوں سے بدستور تعلق رکھیں، اور امام احمد و دیگر سارے ائمۂ مجتہدین، اور سلف وخلف کے خلاف حرام کو حلال بتلاتے ہیں۔ مولانا عامر عثمانی مرحوم نے ان لوگوں کے اس فتنہ سے متاثر ہو کر ''تجلی'' کے تین نمبر ضخیم نکالے تھے جن میں غیر مقلدین اور ارکانِ جماعتِ اسلام کے ان تمام مضامین کا جو یہاں شائع ہوئے تھے، مکمل و مدلل رد کیا تھا، اور پوری تحقیق ومطالعہ کے بعد سلف وجمہور اہلِ سنت کی نہایت موثر انداز میں تائید کی تھی۔ مرحوم نے اس سلسلے میں راقم الحروف سے بھی رابطہ قائم کیا تھا اور کچھ معلومات طلب کی تھیں۔ وہ تینوں نمبر جو بھی پڑھے گا، یقیناً مسلک جمہور کی حقانیت کا قائل ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے غیر مقلد بھائیوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ برابر اپنی ریشہ دوانیوں میں مشغول رہتے ہیں۔

سعودی حکومت سارے عالمِ اسلامی کی نمائندہ مرکزی حکومت ہے، اس لئے وہاں کے اعیان و علماء کو سارے ہی صحیح الخیال مسلمانانِ عالم سے رابطہ رکھنا چاہئے اور ان کو اپنے یہاں نمائندگی دینی چاہئے تاکہ اس کا کوئی اقدام غلط نہ ہو، وہاں کا مسلک حنبلی ہے اور رد شرک و بدعت کے سلسلے میں ان کے لئے سب سے قریب تر حنفی مسلک ہے، اور ہندو پاک کے علماء دیوبند اس کے صحیح ترجمان ہیں۔ اس لئے ان کے مفید علمی و مذہبی مشورہ سے سعودی اعیان و علماء کو مستفید ہونا چاہئے۔ واللہ الموفق۔ اب جزء القرائۃ کی تحقیقات ملاحظہ ہوں:۔

بغیر فاتحہ کے عدمِ جواز صلوٰۃِ مقتدی

امام بخاری نے ابتداء سے ہی یہ ثابت کرنے کی سعی فرمائی کہ بغیر فاتحہ کے کسی کی نماز نہیں ہوتی، جو آج کل غیر مقلد بھی دعوے کے ساتھ کہتے ہیں اور شروع صفحہ میں ہی یہ بھی فرمایا کہ جس حدیث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نماز کے لئے فاتحہ کے ساتھ کچھ اور بھی قرائۃ قرآن مجید میں سے کرنی چاہئے، وہ زیادتی فصاعداً کے لفظ سے ناقابلِ ثبوت ہے، حالانکہ خود ہی سب سے پہلے جو اثر حضرت علیؓ کا پیش کیا ہے اس میں انہوں نے بھی غیر جہری نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ کے ساتھ پہلی دو رکعتوں میں سورت ملانے کو فرمایا ہے، اور بعد کی رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھنے کو فرمایا۔ ظاہر ہے کہ جب حضرت علیؓ نے امام کے پیچھے بھی غیر جہری میں فاتحہ کے ساتھ سورت پڑھنے کو فرمایا تو بغیر امام کے منفرد کے لئے تو بدرجۂ اولی یہ حکم ہوگا، اور حنفیہ تو امام و منفرد کے لئے پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ و سورت دونوں کو واجب مانتے ہیں جبکہ دوسرے سب حضرات شافعیہ وغیرہ دوسری سورت ملانے کو صرف مسنون یا مستحب کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ امام بخاری نے لفظِ فصاعداً کو تو گرایا ہے مگر اگلے ہی صفحہ پر وما زاد اور ما تیسر کی احادیث کو بغیر نقد کے مان لیا ہے، اور اسی طرح اپنے رسالہ میں گیارہ جگہوں میں اس کے مرادف الفاظ کو مان لیا ہے اور مطلب سب کا ایک ہی ہے، لیکن سب کا زور فاتحہ کے اثبات اور زائد کے اسقاط پر ہے، کیونکہ حنفیہ کے سوا ان سب نے سورت ملانے کو واجب ماننے سے انکار کر دیا ہے۔

سری و سکتات میں جوازِ قرأت

یہ بات پہلے بھی واضح کر دی گئی ہے کہ امام کے پیچھے سری نمازوں میں یا جہری نمازوں میں سکتات کے اندر مقتدی فاتحہ پڑھ سکے، تو اس کو حنفیہ بھی منع نہیں کرتے، صرف حالتِ جہرِ امام بالقرائۃ میں خاموش رہ کر اس کی قرائۃ سنے گا، اور یہاں تک امام بخاری و ابن حزم کے سوا ساری امت متحد ہے، نہ کسی کے نزدیک امام کے پیچھے جہری نماز میں قرائۃِ فاتحہ واجب ہے نہ ثابت ہے، اسی لئے امام احمد نے اوپر کا فیصلہ دوٹوک کر دیا ہے، مگر امام بخاری کو نہایت اصرار ہے کہ سب کے اجماعی فیصلہ کے خلاف مقتدی پر فاتحہ پڑھنے کو واجب ضرور ثابت کر کے رہیں گے اور اگرچہ اس بارے میں ساری امت کے اکابر متفق ہیں، مگر شاید انہوں نے اپنے زعم میں سب سے زیادہ کمزور امام اعظمؒ اور ان کے متبعین کو سمجھا تھا، اس لئے نزلہ صرف اسی عضوِ ضعیف پر گرانے کی سعی کی ہے، چنانچہ ص ۴ و ص ۵ پر اعتراضات کی بھرمار کر دی ہے، تفصیل ملاحظہ ہو۔

دعویٰ وجوبِ قرأۃ للمقتدی

ص ۴ میں باب وجوب القرائۃ باندھا جس میں امام و مقتدی پر کم سے کم کتنی قرائۃ فرض ہے، وہ بتلائی ہے، پہلے آیت لائے "فاقروا ما تیسر منه (جتنی قرائۃ آسان ہو وہ پڑھو) پھر دوسری آیت اذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا ذکر کی اور لکھا کہ حضرت ابنِ عباسؓ نے اس کو مکتوبہ و خطبہ کے لئے بتلایا ہے، پھر ابوالدرداء کی حدیث نقل کی کہ ہر نماز میں قرائۃ ضروری ہے، یہاں تک تو نماز کے لئے قرآن و حدیث سے خود امام بخاری کے ہی اقرار سے صرف قرائۃِ قرآن ضروری تھی۔ جو ترجمۃ الباب سے بھی مطابق ہے، آگے امام بخاری

اپنے خصوصی مسلک کی طرف بڑھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خبرِ متواتر سے ثابت ہوا کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی۔ اور امامِ اعظم پر تعریض کی کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ پہلی دو رکعتوں میں فارسی زبان میں صرف ایک ایک آیت کا ترجمہ کافی ہے اور آخر کی دو رکعت میں کچھ نہ پڑھے، حالانکہ ابوقتادہ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ چاروں رکعت میں قرائۃ کرتے تھے، اور بعض لوگ (امام اعظمؒ) یہ کہتے ہیں کہ چاروں میں کچھ بھی نہ پڑھے تو نماز ہو جائے گی، حالانکہ یہ بات ارشادِ نبوی کے خلاف ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی۔

شبہ و جواب: پھر امام بخاری نے فرمایا کہ اگر یہ بعض لوگ اس امر سے استدلال کریں تو نبی کریم ﷺ نے تو لاصلوٰۃ فرمایا ہے، لایجزی تو نہیں فرمایا کہ بالکل صحیح ہوگی ہی نہیں کیونکہ نماز نہیں کا مطلب تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کامل نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی، جیسے حدیث میں ہے کہ مسجد سے قریب رہنے والے کی نماز بغیر مسجد کے نہیں ہوتی، حالانکہ ہو جاتی ہے صرف کمال کی نفی ہے یا حدیث میں ہے کہ کھانا سامنے آجائے تو بغیر کھائے نماز نہیں، حالانکہ ہو جاتی ہے، البتہ کامل جب ہی ہے کہ پہلے کھانا کھا کر پھر اطمینان سے دل جمعی کے ساتھ پڑھے، بھوک کی حالت میں اور وہ بھی کھانا سامنے آجانے پر، اگر نماز پڑھے گا تو دل بجائے نماز کے کھانے میں رہے گا اور اس نوع کی اور بھی احادیث وارد ہیں۔ امام بخاری نے فرمایا کہ اس کا جواب یہ ہے کہ جب کوئی حدیث ثابت ہو جائے تو اس کا حکم اس کے الفاظ اور عموم پر ہی رکھنا چاہئے، الا یہ کہ دوسری حدیث ہی کی وجہ سے دوسرے معنی خاص لئے جائیں اور حضرت جابرؓ نے یہ الفاظ بھی روایت کئے ہیں کہ نماز بغیر فاتحہ کے جائز ہی نہ ہوگی، اور اگر وہ اس سے استدلال کریں کہ (اجماعی مسئلہ ہے) رکوع میں شامل ہونے والے مقتدی کی وہ رکعت ہو جاتی ہے تو جس طرح یہ رکعت بغیر فاتحہ کے جائز ہوگی، باقی رکعتیں بھی ہو جائیں گی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ رکوع میں شامل ہو جانے سے رکعت مل جانے کا مسئلہ بھی صرف ان حضرات نے تسلیم کیا ہے جو قرائۃ خلف الامام کے قائل نہیں ہیں، مثلاً حضرت ابن عمرؓ اور زید بن ثابت وغیرہ، لیکن جو حضرت امام کے پیچھے بھی قرأت کو ضروری سمجھتے ہیں مثلاً ابو ہریرہؓ وہ کہتے ہیں کہ رکعت جب ہی مانی جائے گی کہ وہ مقتدی مذکور اپنے امام کو قیام کی حالت میں پالے (یعنی رکوع میں جھکنے کے بعد امام کے ساتھ ملنا رکعت پالینے کے لئے کافی نہ ہوگا) اور حضرت ابوسعید و حضرت عائشہؓ کا بھی ارشاد ہے کہ فاتحہ پڑھنے سے پہلے رکوع نہ کرنا چاہئے، لہٰذا اول تو جس مسئلہ کو وہ لوگ اجماعی بتلاتے ہیں، وہ اجماعی نہیں ہے، اور اگر ہے بھی تو ہم اس ادراک رکعۃ بادراک الرکوع والی صورت کو حکمِ عام سے مستثنیٰ جزئی کے طور پر مانیں گے۔

استدلالِ امام بخاری کا جواب

رکوع پالینے سے رکعت مل جاتی ہے، یعنی بغیر فاتحہ پڑھنے کے بھی وہ رکعت صحیح مانی گئی ہے اور یہ مسئلہ اجماعی ہے، حضرت ابو ہریرہ کو جہری نماز میں قرائۃِ مقتدی کا قائل سمجھنا یا ادراکِ رکعت والے مسئلہ میں ان کا قرائۃِ فاتحہ نہ کرنے کی وجہ سے مدرکِ رکعت نہ ماننا بھی غلط ہے، کیونکہ وہ تو دوسروں سے صرف اس امر میں مختلف ہیں کہ امام کو رکوع میں جھکنے سے قبل قیام میں پالے، یہ وہ بھی نہیں کہتے کہ اتنا پہلے امام کو قیام میں پائے کہ فاتحہ پڑھ سکے، یا ضرور پڑھے تب مدرکِ رکعت ہوگا۔ یہ سب تفصیل کہیں سے بھی ثابت نہیں کی جاسکتی۔

یہاں امام بخاری نے صرف اپنے الگ مسلک کی بات ظاہر کی ہے کہ ادراک رکوع سے رکعت نہ ملے گی کیونکہ اس کو فاتحہ نہیں ملی، جو ہر رکعت کے لئے خواہ امام کے پیچھے ہو اور خواہ جہری نماز ہو یا سری، ہر حالت میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنی فرض و واجب ہے، اس کے بغیر کوئی رکعت یا نماز صحیح نہ ہوگی، اور اس مسلک کے لئے حضرت ابو ہریرہؓ کو انہوں نے اپنا ہم نوا بنانا چاہا، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات تو خود امام بخاری ہی کے اعتراف سے ثابت ہوگئی کہ حضرت ابو ہریرہؓ کے نزدیک اگر امام کے رکوع میں جھکنے سے قبل مقتدی امام کے ساتھ مل کر رکوع میں بغیر فاتحہ پڑھے چلا گیا تو اس کی وہ رکعت صحیح ہو جاتی ہے اور موطا امام مالک میں حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول بھی مروی ہے کہ جس نے

رکعت (رکوع) کو پالیا اس نے سجدہ کو بھی پالیا، (رکعت پوری ہوگئی) البتہ قراۃِ فاتحہ کے فوت ہونے سے بڑی خیر سے محروم ہوئی۔ (اوجز ص ۱\۱۱۹)
مگر امام بخاری کے نزدیک وہ رکعت صحیح نہیں ہوتی، پھر ایک صورت خاص طور سے امام بخاری کے لئے یہ نکل سکتی تھی کہ مقتدی امام کے پیچھے رکوع میں فاتحہ پڑھ لے تو اس طرح وہ اجماع کے ساتھ ہو جاتے، ان کے یہاں رکوع وسجدے میں قرآن پڑھنا جائز بھی ہے، جبکہ یہ صریح وصحیح احادیثِ ممانعت کے خلاف ہے، اور بقول ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کے امام بخاری نے اس مسئلہ میں مسلم شریف کی احادیثِ صحیح کو ترک کر دیا ہے، (مسلم شریف کے باب النھی عن قرأۃ القرآن فی الرکوع والسجود میں آٹھ احادیث کے اندر صریح ممانعت مروی ہے (فتح الملہم ص ۲\۹۱)

شیخ اکبر نے فرمایا کہ نماز کے اندر صرف قیام کی حالت میں قرائۃ جائز ہے، کیونکہ نمازی کو بوجہ صورتِ مناجاۃ وحاضری دربارِ خداوندی کے حق تعالیٰ کی شانِ قیومت کے ساتھ ایک گونہ نسبت حاصل ہو جاتی ہے، اور رکوع وسجدہ چونکہ تذلل وخضوع اور تسفل کی حالتیں ہیں، اسلئے وہ قرائۃِ کلامِ معظم کیلئے موزوں محل نہیں ہیں، اسی لئے انکے مناسب صرف تسبیح وتقدیس ہوئی۔ (فتح الملہم ص ۲\۹۲)

لیکن امام بخاری کے لئے حضرت ابوسعید وحضرت عائشہؓ کا قول رکاوٹ بن گیا کہ کوئی شخص قرائۃِ فاتحہ سے پہلے رکوع نہ کرے حالانکہ ان کا یہ ارشاد ظاہر ہے کہ مسبوق ومقتدی کے لئے نہیں ہے، تاہم امام بخاری نے ان کا قول اپنی تائید میں پیش کیا ہے۔

فارسی میں قرائۃ کا اعتراض وجواب

امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ پر یہ تعریض بھی کی کہ وہ فارسی زبان میں ایک ایک آیت کی ہر رکعت کے لئے قرائۃ کو کافی اور جائز کہتے ہیں، حالانکہ حسب تصریح کتب فقہ حنفی فارسی وغیرہ زبانوں میں قرائۃ کے جواز سے امام صاحبؒ نے رجوع فرمالیا تھا، اور پھر وہی مذہب اختیار کر لیا تھا جو امام ابو یوسف، امام محمد وامام شافعی وغیرہ کا ہے کہ قرائۃ عربی زبان میں ہی ضروری ہے، اگرچہ امام صاحب کے قول کے بھی نقلی وعقلی دلائل کافی تھے، تاہم رجوع کے بعد طنز وتعریض کا کوئی موقع نہیں تھا، اور یہ امر قرینِ قیاس نہیں کہ امام بخاری کو امام صاحب کے رجوع کی خبر نہ پہنچی ہو۔ اور ایک آیت کا اعتراض اس لئے صحیح نہیں کہ وہ بھی قرآن ہے اور حکم یہی ہے کہ قرآن پڑھو جتنا آسان ہو، اور کم سے کم قرآن کا اطلاق ایک آیت پر ہی ہو سکتا ہے۔

امام صاحب کی طرف مسئلہ کی غلط نسبت

آگے جو امام بخاری نے امام صاحب کی طرف یہ بھی منسوب کیا کہ وہ پہلی دو رکعتوں میں ایک ایک آیت پڑھنے پر دوسری دو رکعتوں میں کچھ بھی نہ پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں، یہ غلط ہے، کیونکہ کتب فقہ حنفی (ہدایہ وغیرہ) میں تفصیل اس طرح ہے:۔

پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ مع دوسری سورت کے وجوباً پڑھے گا، یا دوسری سورت کی جگہ ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی پڑھے گا، پھر دوسری آخری رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھے گا، کیونکہ حضور علیہ السلام سے بھی ایسا ہی ثابت ہے۔ لیکن امام صاحب کے نزدیک دوسری آخری رکعتوں میں بجائے فاتحہ کے تین بار تسبیح بھی کافی ہے، اگرچہ فاتحہ افضل ہے، کیونکہ پہلی دو رکعتوں کی قرائۃِ فاتحہ دوسری دو رکعتوں کے لئے کفایت کرتی ہے کہ فرض نماز کے لئے قرائۃِ فاتحہ واجب وضروری ہے، اور وہ پہلی دو رکعت میں ادا ہوگئی لہٰذا بعد والی میں افضل فاتحہ اور کافی تسبیح ہوگی۔ لیکن اگر فرض کی پہلی دو رکعتوں میں کسی نے صرف سورت پڑھی اور فاتحہ نہ پڑھی تو آخری دو رکعت میں فاتحہ وجوباً پڑھے گا، کیونکہ پوری نماز فاتحہ سے خالی نہ ہونی چاہئے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کی طرف عدمِ قرائۃ فی الاخریین کی نسبت صحیح نہیں، جبکہ وہ اس کو افضل فرماتے ہیں، اور حضور علیہ السلام

لہ بخاری ومسلم میں حضرت ابوقتادہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ کے ساتھ دو سورتیں ملا کر پڑھتے تھے، اور آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھتے تھے۔ کبھی کبھی آپ زور سے پڑھتے تھے، تو ہم نے ایسا ہی سن رکھا ہے۔ ''مولف''

سے جو چاروں رکعت میں قرائۃ کا ثبوت ہوا یہ اس کے بھی منافی نہیں ہے، کیونکہ آپ نے بھی آخری دونوں رکعت میں قرائۃ استحبابا پڑھی ہوگی۔

نماز بلاقرائۃ کا اعتراض

اس کے بعد امام بخاری نے یہ اعتراض کیا کہ حضور علیہ السلام نے تو فرمایا کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی، مگر بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر چاروں رکعتوں میں بھی قرائۃ نہ کرے تو نماز دورست ہو جائے گی۔

جواب: یہ بھی مغالطہ آمیز بات ہے کیونکہ امام صاحب ہی نہیں بلکہ امام احمد و مالک وغیرہ سب ہی یہ کہتے ہیں کہ حدیث مذکور تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے ہے، مقتدی کے لئے نہیں۔

امام احمد کا ارشاد: ترمذی شریف باب ترک قرائۃ خلف الامام میں امام احمد سے نقل کیا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد **لاصلوة لمن لم يقرا بفاتحة الكتاب** منفرد کے لئے ہے، جس کی دلیل دوسری حدیث جابرؓ کی ہے کہ جس نے کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی، اس کی نماز نہ ہوگی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، امام احمد نے فرمایا کہ یہ حضرت جابرؓ صحابی رسول اللہ ﷺ ہیں جنہوں نے مذکورہ بالا حدیث رسول کا یہی مطلب سمجھا کہ وہ تنہا نماز والے کے لئے ہے، اس کے بعد امام ترمذی کا یہ نقل کرنا کہ خود امام احمد کا یہ عمل تھا کہ وہ قرائۃ خلف الامام کے قائل تھے، مطلقاً صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ صرف سری نماز میں اس کو کہتے تھے، وہ بھی وجوباً نہیں، اور یہ کہ جہری میں جہاں تک امام کی آواز مقتدی کو پہنچتی ہو وہ بھی قرأت نہ کرے البتہ جس کو نہ پہنچتی ہو اس کے لئے قرائۃ جائز بتلاتے تھے، واجب اس کے لئے بھی نہیں، کیونکہ خود فرمایا کہ اہل اسلام میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں کہ امام کے پیچھے قرائۃ نہ کرنے والے کی نماز باطل ہوگی۔

عبداللہ بن مبارک کا ارشاد

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول بھی اسی باب میں امام ترمذی نے نقل کیا کہ میرے نزدیک جو شخص امام کے پیچھے قرائۃ نہ کرے اس کی نماز جائز ہوگی، اور بعض لوگوں نے اس بارے میں سختی کی ہے کہ یہ حکم لگا دیا کہ بغیر فاتحہ کے کسی کی نماز نہیں ہوتی خواہ وہ تنہا ہو یا مقتدی ہو۔ حضرت عبداللہ بن مبارک کا ارشاد یہاں ذکر کرنا اس لئے بھی مناسب ہوا کہ ہم امام بخاری کا جواب لکھ رہے ہیں جو عبداللہ بن مبارک کے بڑے مداحین میں ہیں، ان کے اعلم اہلِ زمانہ نے بھی زیرِ بحث مسئلہ میں امام صاحبؒ ہی کی تائید کر دی ہے کہ امام کے پیچھے قرأت کی ضرورت نہیں اور امام اعظم کی رائے ہی درست ہے کہ امام کے پیچھے چاروں رکعتوں میں قرائۃ نہ کرنے سے بھی نماز صحیح رہے گی، اور جو لوگ اس بارے میں تشدد کرتے ہیں، وہی غلطی پر ہیں۔ (یعنی امام بخاری وغیرہ)

ثنا پڑھنے کا اعتراض

امام بخاریؒ نے ص ۳۳ ہی میں ایک اعتراض یہ بھی کیا کہ یہ لوگ ترکِ قرائۃ خلف الامام کے لئے قولِ باری تعالیٰ **فاستمعوا له وانصتوا** سے بھی استدلال کرتے ہیں، حالانکہ خود ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ امام کی قرأت کے وقت ثنا پڑھنی جائز ہے۔ تو انہوں نے ثنا کو جو ان کے نزدیک بھی صرف تطوع ہے، اور اس کے مقابلہ میں قرائۃ واجب ہے، اس کو تو ساقط کر دیا اور ثنا کو ساقط نہ کیا جو کم درجہ کی تھی، اس طرح فرض کا درجہ نفل سے بھی گرا دیا۔

جواب: اس بارے میں حنفیہ کا صحیح قول یہ ہے کہ جہری نماز میں امام کی قرائۃ کے وقت مقتدی کو **سبحانک اللّٰهم** پڑھنا جائز نہیں، بلکہ تکبیر کہہ کر خاموش رہے اور موقع ملے تو سکتات میں ثناء پڑھ لے، اور سکتات میں فاتحہ بھی پڑھ سکتا ہے اگرچہ دشواری یہ ہے کہ امام پر سکتہ طویلہ کرنا جس میں فاتحہ پڑھی جاسکے، کسی بھی دلیلِ شرعی سے اس پر واجب ثابت نہیں ہو سکا ہے اور سری نمازوں میں حنفیہ بھی قرائۃِ فاتحہ کو جائز سمجھتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

سنتِ فجر کا اعتراض: ان لوگوں (حنفیہ) نے یہ بھی کہا کہ جب کوئی مسجد میں جائے اور امام فجر کی نماز پڑھا رہا ہو تو یہ دو رکعت سنت پڑھنے لگے، نہ امام کی قرأۃ سنے نہ اس کی آواز کی طرف کان لگائے، جبکہ یہ بات حدیثِ نبوی "اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ" کے بھی خلاف ہے، اور یہ لوگ جواب میں حدیث "من کان لہ امام فقرائۃ الامام لہ قراءۃ" پیش کرتے ہیں، حالانکہ یہ حدیث حجاز و عراق وغیرہ کے اہلِ علم کو تسلیم بھی نہیں، اور مرسل و منقطع بھی ہے کیونکہ ابن شداد نے براہِ راست (یعنی واسطہ حذف کر کے) حضور علیہ السلام سے روایت کر دی ہے۔

جواب: حافظ ابن ہمامؒ نے لکھا:۔ صحیح مذہب حنفیہ کا یہ ہے کہ مسجد کے علاوہ کوئی جگہ ہو تو وہاں سنت پڑھے، ورنہ جماعتِ صبح ہوتے ہوئے مسجد کے اندر سنتیں پڑھنا جائز نہیں، کیونکہ ترکِ مکروہ، فعلِ سنت پر مقدم ہے، پھر یہ تو بہت ہی شدید طور سے مکروہ ہے کہ جماعت کی صفوں سے قریب پڑھے جیسا کہ بہت سے جاہل پڑھ لیا کرتے ہیں (فتح القدیر ص۱\۳۴۱ طبع مصر) ہم نے اس کی مفصل بحث پہلے بھی کی ہے۔

حدیث ابن خزیمہ: وہاں ہم نے صحیح ابن خزیمہ کی وہ حدیث بھی پیش کر دی ہے، جس کی وجہ سے حنفیہ نے صبح کی دو سنتوں کے مسجد سے باہر ادا کرنے کا فیصلہ ارشادِ نبوی کی روشنی میں حاصل کیا ہے، یہ حدیث چونکہ ایسی صراحت کے ساتھ دوسری کتبِ حدیث کے پورے ذخیرہ میں نہیں ہے، اس لئے بہت سوں کو حنفیہ کا مذکورہ فیصلہ اوپرا معلوم ہوتا رہا ہے، اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کو بھی شک ہی رہا تھا کہ یہ حدیث واقعی صحیح ابن خزیمہ میں موجود ہے یا نہیں۔ بہر حال! امام شافعیؒ وغیرہ کے اس فیصلہ کے مقابلہ میں کہ صبح کے فرضوں کی جماعت شروع ہو جانے کے بعد مسجد یا مسجد سے باہر کہیں بھی دو سنتیں نہ پڑھی جائیں لقولہ علیہ السلام اذا اقیمت الصلوۃ فلا صلوۃ الا المکتوبۃ جس کا حوالہ یہاں امام بخاری نے بھی دیا ہے اور حنفیہ پر اعتراض وارد کر دیا ہے، حنفیہ کا فیصلہ اور صحیح حدیثِ ابن خزیمہ کی وجہ سے مسجد کی قید لگانا نہایت ہی صحیح فیصلہ ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے خود ہی رہنمائی فرما دی کہ صبح کی دو سنتیں جماعت شروع ہونے پر مسجد کے اندر نہ پڑھی جائیں۔

طعن امام بخاری کی وجہ

بظاہر یہ ہے کہ امام بخاریؒ کے سامنے بھی حدیث مذکور نہ ہوگی ورنہ وہ یہ اعتراض نہ کرتے، اور دوسری بات یہ بھی ہے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ امام بخاری کو بہت سے مسائل حنفیہ کے صحیح طریقے سے نہیں پہنچے، یا حمیدی یا ابن مہدی وغیرہ نے ان کو مغالطہ میں ڈال دیا تھا، اگرچہ ان کا دعویٰ تو حنفی مسلک کے جاننے کا ہی ہے اور انہوں نے خود بھی فرمایا کہ پہلے جب میں نے (اپنے وطن ہی میں) حضرت عبداللہ بن مبارک اور امام وکیع کی مصنفات کو ازبر کر لیا اور اہل الرائے کے کلام کو خوب سمجھ چکا تو پھر میں نے حجاز کا سفر کیا۔ تو ایسی صورت میں ان کو واقعی پوری طرح حنفی مسلک سے واقفیت ہو بھی جانی چاہئے تھی۔ مگر ان کے بہت سے اعتراضات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی مذکورہ بالا رائے ان کے بارے میں درست تھی، ورنہ بدگمانی کرنے والے تو یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ جان بوجھ کر حنفی مسلک کو گرانے کی سعی کی ہے، مگر ہمارے نزدیک یہ بات امام عالی مقام کے مرتبہ سے بعید ہے، جس طرح محدثِ کبیر امام ابن ابی شیبہؒ نے بھی بہت سے مسائل غلط طور سے حنفی مسلک کی طرف منسوب سمجھ کر مصنف میں بہت سے اعتراض کر دیئے تھے، اور ہندوستان کے غیر مقلدوں نے ان سے حنفیہ کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں مدد حاصل کی تھی۔

امامِ اعظم رحمہ اللہ امام المحدثین واعلمہم بالناسخ والمنسوخ

بہر حال! جب بات یہاں تک آئی تو یہ بھی عرض کر دوں کہ امام المحدثین امام اعظمؒ نے جو حسب اعتراف غیر حنفی اکابر محدثین بھی سب سے پہلے علم حدیث کی تالیف و تدوینِ فقہ کے بانی تھے، اور سارے محدثین عظام کے اندر ان کا ایک نہایت ممتاز وصف یہ بھی تھا کہ وہ

احادیث کے ناسخ ومنسوخ ہونے کے علم پر بہت بڑی دسترس رکھتے تھے۔

امام صاحب کی مجلس تدوین فقہ

پھر بھی انہوں نے صرف اپنے علم پر اعتماد نہیں کیا بلکہ چالیس محدثین مفسرین وفقہاء کی ایک جماعت قائم کر کے برسہابرس تک حدیثی و فقہی بحثیں کیں اور کرائیں، اور لاکھوں مسائل کے فیصلے کتاب وسنت نہ تعاملِ صحابہ وتابعین کی روشنی میں طے کرا کر اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان کی کسی تحقیق کو بھی اتنی آسانی سے نہیں گرایا جاسکتا، جس طرح امام بخاری اور ان کے اتباع نے خیال کیا تھا۔ واللّٰہ علےٰ ما نقول وکیل. ان شاء اللّٰہ وبہ نستعین.

امام بخاری کا دعویٰ

امام بخاری کا یہ ارشاد موجب حیرت ہے کہ حدیث من کان لہٗ امام کو حجاز وعراق کے اہلِ علم نے تسلیم نہیں کیا۔ جبکہ اس کی روایت امام محمد نے موطأ میں امام مالک سے بھی کی ہے، اگر چہ الفاظ کا کچھ فرق ہے اس طرح کہ حضرت ابن عمرؓ سے جب پوچھا جاتا تھا کہ کیا کوئی امام کے پیچھے قرأت کرے؟ وہ جواب میں فرماتے تھے کہ جب تم میں سے کوئی امام کے ساتھ نماز پڑھے تو اس امام کی قرأتہ کافی ہے۔ اور حضرت ابن عمر خود بھی امام کے پیچھے قرأتہ نہیں کرتے تھے (نصب الرایہ ص۱۲\۲) اور امام احمدؒ کی مسند ص۳۳۹\۳ میں بعینہٖ الفاظ بھی یہی ہیں جو امام اعظمؒ وغیرہ کی روایت میں ہیں، کیا بغیر تسلیم کئے ہی امام مالک نے حدیثِ مذکور روایت کر دی تھی اور اپنا عمل بھی ترکِ قرأتہ خلف الامام کا بنالیا تھا، یا وہ حجازی نہ تھے یا حجاز میں ان کا شمار اہلِ علم میں سے نہیں تھا؟ اور کیا امام احمد عراق کے اہلِ علم میں سے نہ تھے، اور انہوں نے بھی بغیر تسلیم ہی حدیثِ مذکور کی روایت کر دی تھی اور اپنا مسلک بھی ترکِ قرأتہ بنالیا تھا؟ افسوس ہے کہ امام بخاری ایسے دینی نازک مواقع میں بھی مبالغوں سے کام لیتے رہے، اس کے بعد حدیثِ مذکور پر مرسل ومنقطع ہونے کا بھی نقد کیا ہے۔

مرسل ومنقطع کی بحث

اول تو جمہور کے نزدیک مرسل حجت ہے، خاص طور سے جبکہ ارسال کرنے والا راوی صحابی ہو، اور یہاں بھی ایسا ہی ہے کیونکہ عبداللہ بن شداد صغیر السن صحابی ہیں۔ اور جلیل القدر تابعین میں سے ہیں، پھر ایسی مرسل جو فتاوی صحابہ سے مؤید ہو سارے محدثین کے یہاں حجت ہوتی ہے اور ترکِ قرأتہ خلف الامام کے بارے میں بہ کثرت صحابہ کے فتاوے منقول ہیں، ملاحظہ ہو مصنف ابن ابی شیبہ ومعارف السنن ص۲۷\۳۰۹ واعلاء السنن وغیرہ۔

مرسل کی مقبولیت

امام شافعیؒ بھی کبارِ تابعین کے مراسیل قبول کرتے تھے جبکہ وہ کسی مسند سے مؤید ہوں، یا کسی صحابی کے قول یا فتویٰ اہل علم سے مؤید ہوں۔ اور انقطاع کی بات بھی درست نہیں، جس کی تفصیل معارف السنن واعلاء السنن میں ہے۔

فتاویٰ ابن تیمیہ میں ہے کہ اس مرسل کی تائید ظاہرِ قرآن وسنت سے ہو رہی ہے اور اس کو جمہور اہلِ علم صحابہ وتابعین نے قبول کرلیا ہے اور اس کا ارسال کرنے والا راوی اکابرِ تابعین میں سے ہے، اس قسم کا مرسل باتفاق ائمۂ اربعہ وغیرہم حجت وقابلِ استدلال ہے۔ (فصل الخطاب ص۹۷)

ناظرین نے ملاحظہ کیا کہ حدیث من کان لہ امام چونکہ امام بخاری کے مسلک کے خلاف تھی، اس کو گرانے کی کتنی سعی فرمائی، لیکن ان کے برعکس حافظ ابن تیمیہ نے بھی اسی مرسل کو اونچا اٹھانے کی پوری کوشش کر دی ہے۔

امام احمد بھی وجوب کے قائل نہ تھے

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل ص ۹۷ میں فتاوی ابن تیمیہ کے حوالہ سے یہ بھی نقل کیا کہ امام احمدؒ کا مشہور مذہب سریہ میں بھی امام کے پیچھے صرف استحباب قرائۃ فاتحہ تھا، وجوب نہیں تھا، جبکہ امام بخاری نے جمہور سلف و خلف سے الگ ہو کر اپنا یہ مسلک بنایا کہ نہ صرف سری میں بلکہ جہری نماز میں بھی امام کے پیچھے قرأت فاتحہ فرض وواجب ہے، اس کے بغیر نماز نہ ہوگی حتی کہ رکوع میں ملنے سے اجماع امت کے خلاف یہ فیصلہ دے دیا کہ رکعت نہ ملے گی، کیونکہ اس سے فاتحہ رہ گئی جو ہر رکعت میں امام کے پیچھے بھی ضروری ہے۔

غیر مقلدوں کا تشدد

اسی رائے مذکور کا اتباع غیر مقلدین نے بھی کیا ہے، اسی لئے وہ ساری امتِ مسلمہ متبعینِ ائمہ اربعہ کی نمازوں کو باطل وکالعدم بتلاتے ہیں جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے، سوال یہ ہے کہ جب کسی مذہب ائمۂ مجتہدین میں بھی قرائۃ خلف الامام واجب وضروری نہیں ہے نہ سری میں نہ جہری میں، تو وہ اس کا التزام واجب وفرض کی طرح کیوں کریں گے۔ اور جب امام احمدؒ نے یہ تصریح کردی کہ حضور علیہ السلام کے زمانے سے اب تک اہلِ اسلام میں سے کوئی بھی اس امر کا قائل نہیں ہوا کہ امام کے پیچھے قرائۃ فاتحہ نہ کرنے سے نماز درست نہ ہوگی، تو اول فالاول کا فیصلہ نہ امام بخاری کی تائید میں ہے اور نہ اس زمانے کے غیر مقلدوں کی حمایت میں۔ امام بخاری تو فرما چکے کہ پہلوں کے مقابلہ میں بعد والوں کا فیصلہ قابلِ رد ہے، معلوم نہیں غیر مقلدین کیا ارشاد فرمائیں گے؟ آخر میں یہ بھی عرض ہے کہ حدیث من کان لہ امام طرق کثیرہ سے مروی ہے اور وہ معنی ومضمون کے لحاظ سے نہایت قوی وصحیح ہے۔ افسوس ہے کہ یہاں زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

تکبیر تحریمہ کا اعتراضِ بخاری

امام بخاری نے ایک اعتراض حنفیہ پر یہ بھی کیا ہے کہ یہ لوگ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ امام کی قرائۃ کے وقت خاموش رہو مگر حال یہ ہے کہ جب امام کے پیچھے نماز شروع کرتے ہیں تو بتلاتے ہیں کہ تکبیر کہہ کر نماز شروع کی جائے اور امام کی قرائۃ کی طرف توجہ نہ کرے کیونکہ تکبیر کہنا فرض ہے بغیر اس کے نماز نہ ہوگی مگر یہ نہیں سوچتے کہ جتنی دیر میں اس نے تکبیر کہی امام کی قرأت تو نہیں سنی کیا یہ اجتماع مامور کے خلاف نہ ہوا؟ اگرچہ یہ اعتراض جزءالقرائۃ کے ص ۱۹ میں ہے مگر یہاں کے لئے زیادہ مناسب ہے، اس لئے اس کا جواب بھی ہم اسی جگہ لکھتے ہیں۔

جواب: یہی اعتراض اور دوسرے بھی امام بخاری کے اتباع میں اس زمانہ کے غیر مقلدین نے بھی کئے ہیں، کیونکہ ان کو امام بخاری جیسا جلیل القدر وکیل امت میں سے دوسرا کہاں میسر ہو سکتا تھا، اور غیر مقلدین کے کسی اعتراض میں بھی اگر کچھ تھوڑی بہت جان یا وزن ہے تو صرف اس ہی میں ہے جو امام بخاری وغیرہ اکابر امت کر گئے ہیں، اور ان کے جوابات بھی ہمیشہ دیئے گئے ہیں کتابیں بھری ہوئی ہیں، مگر وہ عربی میں ہیں، آج کل جیسے پڑھنے پڑھانے والے محروم المطالعہ اور کم استعداد لوگ ہیں، ان کو اور عوام کو گمراہ کرنے اور مذاہب اربعہ سے بدظن کرنے کا جو بھی طریقہ ان کو ملتا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر غیر مقلدی کے لئے فضا بناتے رہتے ہیں۔ اور اردو زبان میں چونکہ تحقیقی حدیثی مباحث بہت کم آئے ہیں، اس لئے ہندوپاک کے غیر مقلدین اردو زبان میں اپنا پروپیگنڈہ زیادہ کامیابی سے کر لیتے ہیں۔ اور اب بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ گیا ہے کہ سعودی حکومت کو اپنے فیور میں لینے کے لئے یہ باور کراتے ہیں کہ سارے ہندوپاک میں مسلمان نام کے مشرک آباد ہیں، اور یہ سارے قبر پرست ہیں حتیٰ کہ دیوبندی مشرب کے مسلمانوں کے بارے میں بھی یہ باور کرایا گیا ہے کہ یہ بھی قبوری ہیں کیونکہ یہ لوگ قبرِ معظم نبوی علی صاحبہا الف الف تحیات کی زیارت کے لئے سفر کو جائز بتلاتے ہیں اور حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کے ساتھ

توسل کو جائز کہتے ہیں تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی شریف میں علامہ مبارک پوریؒ نے بھی سب ہی کو قبوری لکھا ہے فلیراجع الیہ اور صرف یہ دونوں مسئلے ہی ان کو ایسے مل گئے ہیں کہ موجودہ سعودی حکومت کے اعیان و علماء کو ہم سے بدظن کرانے کے لئے کافی ووافی ہیں۔ کیونکہ غیر مقلدیت کی بات کا اثر ان پر اتنا زیادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ خود بھی حنبلی مسلک کے ہیں اور ہندوپاک کے غیر مقلدوں کے مسلک سے بمراحل دور ہیں۔

امام احمد اور نجدی علماء

دوسری بات ان غیر مقلدوں کی ہی خوئی قسمت سے یہ بھی ہوگئی کہ نجدی علماء نے کئی بڑے مسائل میں امام احمدؒ کا مسلک ترک کر کے حافظ ابن تیمیہ وابن قیمؒ کے تفردات کو اپنا لیا ہے، اور انہوں نے ان ہی تفردات پر امام احمد اور اکابر حنابلہ کے فیصلوں کے خلاف جمود کرلیا ہے، پھر بڑی تکلیف دہ بات یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے بعد اکابرِ دیوبند میں سے کسی نے بھی نجدی علماء سے قریب ہو کر تبادلۂ خیالات کر کے احقاقِ حق کی سعی نہیں کی، الا یہ کہ حضرت مولانا عثمانی نے فتح الملہم میں یا مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے معارف السنن میں کچھ لکھا، یا حضرت شاہ صاحبؒ کے امالی درس میں کچھ آیا ہے، ہمارے استاذِ محترم حضرت مولانا مدنیؒ بھی درسِ بخاری شریف میں بہت کچھ فرمایا کرتے تھے، مگر ان کے علوم وتحقیقات بھی پوری طرح سامنے نہ آسکیں۔ اور آج کل کے حضرات جن کا رابطہ سعودی عرب سے ہے، وہ بظاہر کچھ کمی وسعتِ مطالعہ کے سبب سے اور کچھ اپنی مصالح کی وجہ سے خاموش معلوم ہوتے ہیں واللہ اعلم۔

الزامی اعتراض کی حقیقت

امام بخاریؒ کا مذکورہ بالا الزامی اعتراض جتنا بے وزن ہے وہ ظاہر ہے، اول تو یہ کہ تکبیر تحریمہ شرطِ دخولِ صلوٰۃ ہے اور شرطِ شیٔ اس سے خارج ہوتی ہے، لہٰذا ابھی مقتدی امام کے ساتھ شریک بھی نہیں ہوا تو اس پر امام کی قرائۃ سننے کا فریضہ کیسے لاگو ہوگیا؟ دوسرے وہ ایک لمحہ کا کام ہے۔ اس کی وجہ سے قرائۃ نہ سننے کا بڑا چارج اس پر کیسے لگ سکتا ہے۔ پھر اس پر تو سب ہی علماءِ امت متفق ہیں کہ امام کی قرائۃ سنتے ہوئے بھی تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں شریک ہونا درست ہے، خاص طور سے حنفیہ کو مطعون نہیں کیا جاسکتا۔ اور قرائۃِ امام کے وقت خاموش رہنے کا مسئلہ بھی سب کا اتفاقی واجماعی ہے اوپر بتلایا گیا کہ امام شافعی جن کو بعض لوگوں نے بڑے شد ومد کے ساتھ موجبینِ قرائۃ خلف الامام میں سمجھا تھا وہ بھی دوسرے سب ائمہ ہی کے ساتھ ہیں اور وہ قرائۃ خلف الامام کو نہ واجب کہتے ہیں نہ انہوں نے یا کسی بھی امام نے یہ کہا کہ امام کی قرائۃِ جہری کے وقت تکبیر کہہ کر نماز میں شرکت نہ کرو۔

تکمیل البرہان کا ذکر

پاکستان کے کسی غیر مقلد عالم نے ''تکمیل البرہان فی قرأۃ ام القرآن'' لکھی ہے، جس میں قرأتِ فاتحہ خلف الامام کو فرض ولازم ثابت کرنے کی سعی ناکام کی ہے اور اس کو اجماعی مسئلہ بتلایا ہے، اس کے جواب ورد میں مولانا ظفر احمد صاحب تھانویؒ نے رسالہ فاتحۃ الکلام لکھ کر شائع کیا ہے۔ اس میں ص ۱۱۹ میں مذکورہ مسئلہ کے رد وجواب کے بعد لکھا کہ ''صاحب تکمیل کو اپنی فہم ودانش کا ماتم کرنا چاہئے'' مگر یہ اعتراض بھی تو سب سے پہلے اب سے گیارہ سو سال قبل امام بخاری کر چکے ہیں۔ اس کی طرف مولانا مرحوم کا ذہن نہیں گیا۔ البتہ مولاناؒ نے اسی موقع پر ایک دوسرا اعتراض امام بخاری کا جزء القرائۃ سے نقل کیا ہے کہ مدارس ومکاتب میں استاد ایک بچہ کو سبق دیتا ہے اور باقی بچے بھی قرائۃ کرتے ہیں وہاں آیت واذا قری القرآن فاستمعوا له وانصتوا کی بناء پر بچوں کو خاموش نہیں کیا جاتا۔ پھر مولانا نے لکھا کہ اس کا ایک جواب تو وہی ہے جو اوپر ذکر ہوا کہ یہ آیت مقتدی کے حق میں ہے، غیر مقتدی کے بارے میں نہیں ہے، دوسرے بچوں کو بڑوں پر قیاس

کرنا بھی غلط ہے، بچے تو بے وضو بھی قرآن مجید پڑھتے ہیں اور ان کو مرفوع القلم قرار دیا گیا ہے۔

غیر مقلدین کے فتنے

دوسری ایک کتاب کراچی سے "فصل الخطاب فی قرائۃ ام الکتاب" کے نام سے مفتی صاحب کلانوری نے شائع کی تھی، جو بارہ ہزار کی تعداد میں طبع کرا کر علماء و جہلاء کے ہاتھوں میں پہنچائی۔ اس میں بھی یہ دعویٰ کیا کہ جو شخص امام کے پیچھے ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز ناقص ہے، کالعدم ہے اور بیکار و باطل ہے۔ اس کا مکمل و مدلل جواب مولانا ابو الزاہد محمد سرفراز خان صاحب صفدر عم فیضہم نے دو جلدوں میں لکھ کر گجرانوالہ سے شائع کیا وہ اس وقت ہمارے سامنے ہے، اس میں بھی ص ۱/۱۰۶ میں جزء القرائۃ امام بخاری، تحقیق الکلام علامہ مبارکپوری اور فصل الخطاب مفتی کلانوری صاحب یہی اعتراض والزام نقل کر کے جواب دیا کہ آیت کا مخاطب مقتدی ہے اور امام المفسرین ابن جریر طبری شافعی کا قول نقل کیا کہ جو آدمی امام کی اقتدا کر چکا ہے، اس کو امام کی قراءت سننے کے لئے خاموش رہنا واجب ہے (دوسرے اس کے مکلف نہیں ہیں) اور تکبیر تحریمہ حنفیہ کے نزدیک شرط صلوٰۃ ہے رکن نہیں (قانیہ ص ۱/۴۰، سراجیہ ص ۱۰ و ہدایہ ص ۱/۸۲ و شرح وقایہ ص ۱/۱۶۰ وغیرہ) لہٰذا اقتدا سے قبل مقتدی بھی مکلف نہیں، البتہ اقتدا کے بعد اس کا قراءت کرنا ضرور ممنوع ہوگا۔ (احسن الکلام ص ۱/۱۰۶) کیونکہ آیت **فاستمعوا له و انصتوا** کا شان نزول قراءت خلف الامام ہی ہے۔ خطبہ وغیرہ پر اس کا اجراء عموم حکم کے تحت ثانوی درجہ میں ہوتا ہے، ایسا نہیں کہ وہ خطبہ کے بارے میں اتری تھی، تا کہ قراءت خلف الامام سے اس کا تعلق ہی نہ ہو یا ہو تو ثانوی درجہ میں۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے دعاوی و مبالغات

جس طرح مسئلہ رفع یدین میں مبالغات کا ذکر ہوا ہے، یہاں قراءت خلف الامام کے مسئلہ میں ایسا جگہ جگہ اور بار بار رسالہ جزء القراءۃ میں ہوا ہے، مثلاً ص ۵ پر پہلے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کی حدیث ذکر کی کہ بغیر فاتحہ کے نماز ناقص ہوتی ہے، اور اس سے کسی کو انکار بھی نہیں اگر چہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ امام ترمذی نے امام احمد کا قول نقل کیا کہ یہ حدیث منفرد کے لئے ہے امام کے لئے نہیں، پھر اس کو یہاں بار بار مختلف طرق و متون سے پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ مقصد امام کے پیچھے قراءۃ فاتحہ کا اثبات ہے۔

پھر حضرت عمرؓ کا ارشاد ذکر کیا کہ امام کے پیچھے قراءت کی جائے، اس میں جہری نماز کا ذکر نہیں ہے، اور سری میں کوئی منکر نہیں ہے اور جس اثر میں جہری کا ذکر ہے وہ نہایت ضعیف ہے اور غالباً اسی لئے امام بخاری نے اس جملہ والی روایت کو اختیار نہیں کیا۔ واللہ اعلم۔

پھر لکھا کہ حضرت ابی بن کعب، حذیفہ اور عبادۃؓ اور ایسے ہی حضرت علی، عبداللہ بن عمرو ابو سعید خدریؓ اور کئی دوسرے صحابہ سے بھی قراءۃ خلف الامام روایت کی گئی ہے، یہاں بھی جہری کی صراحت نہیں ہے،

پھر لکھا کہ قاسم بن محمد نے کہا کہ رجال ائمہ قراءت خلف الامام کرتے تھے، یہاں بھی جہری کی تصریح نہیں ہے، پھر ابو مریم کا قول نقل کیا کہ میں نے سنا ہے حضرت ابن مسعودؓ قراءت خلف الامام کرتے تھے۔ یہاں بھی جہری کا ذکر نہیں ہے آگے لکھا کہ ابو وائل نے حضرت ابن مسعودؓ کا ارشاد نقل کیا کہ "امام کے لئے خاموش رہو"، اور ابن مبارک نے کہا کہ اس سے مراد جہری نماز معلوم ہوتی ہے اور حضرت ابن مسعودؓ امام کے پیچھے صرف سکوت امام کی حالت میں قراءت کرتے تھے۔ یہاں خود امام بخاریؒ کے ممدوح اعظم نے ہی ان کے خلاف فیصلہ دے دیا ہے، ہم کیا کہیں؟ آگے امام بخاریؒ نے لکھا کہ حسن، سعید بن جبیر، میمون بن مہران اور تابعین و اہل علم میں سے اتنے لوگ جن کا میں شمار بھی نہیں کر سکتا، وہ سب یہی کہتے تھے کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی قراءت کی جائے۔ اور حضرت عائشہؓ بھی قراءت خلف الامام کا حکم کیا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ و حضرت ابو ہریرہؓ جہری میں قائل قراءۃ نہ تھے: امام بخاریؒ نے یہاں حضرت عائشہؓ کا ذکر کیا اور ص ۴ و ص ۱/۷ میں

حضرت ابو ہریرہؓ کے بارے میں بھی لکھا کہ وہ دوسرے صحابہ حضرت ابن مسعود وزید بن ثابت وابن عمر وغیرہ کے خلاف قراءت خلف الامام کے قائل تھے اور ان دونوں کا ذکر امام بخاری ایسے مواقع پر لائے ہیں کہ جیسے وہ دونوں جہری میں قراءت خلف الامام کے قائل تھے، حالانکہ اس کے خلاف سنن کبری بیہقی ص ۱۷۱/۲ میں صراحت موجود ہے کہ ابو ہریرہؓ وحضرت عائشہؓ دونوں غیر جہریہ یعنی سری نماز میں قراءت کا حکم کرتے تھے، دوسری جگہ سنن بیہقی کے اسی صفحہ پر ہے کہ وہ دونوں امام کے پیچھے ظہر وعصر کی پہلی دو رکعت میں فاتحہ اور کچھ قرآن پڑھنے کو فرماتے تھے، اور حضرت عائشہؓ آخری دو رکعت میں صرف فاتحہ پڑھا کرتی تھیں۔ ان دونوں روایتوں سے واضح ہوا کہ حضرت عائشہؓ وحضرت ابو ہریرہؓ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت کے قائل نہ تھے اور وہ دونوں فاتحہ کے ساتھ اور کچھ بھی قرآن پڑھنے کا حکم کرتے تھے۔ جس پر صرف حنفیہ کا عمل ہے، ورنہ سارے ہی دوسرے حضرات نے فاتحہ کا ساتھ سورت ملانے کو صرف سنت کا درجہ دے دیا ہے، کتنی ہی احادیث میں فاتحہ کے ساتھ مازاد اور ماتیسر وغیرہ آیا ہے۔ خود امام بخاری نے بھی اپنے اسی رسالے جزء القراءۃ میں گیارہ جگہ یہ کلمات روایت کئے ہیں مگر سب ہی نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ صرف سورۂ فاتحہ تو فرض ورکن کے درجے میں ہے اور سورۃ ملانا یا کچھ اور قرآن مجید سے پڑھنا صرف سنت یا مستحب ہے۔

مسئلہ قراءت: امام اعظمؒ اور حنفیہ نے قرآن مجید سے نفس قراءت کو تو فرض ورکن قرار دیا اور پورے ذخیرہ احادیث وآثار اور تعامل صحابہ و تابعین پر نظر کر کے فاتحہ وسورت دونوں کو واجب قرار دیا ہے، حیرت ہے کہ نہ صرف حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عائشہؓ کے مذکورہ بالا ارشاد کو بلکہ اس بارے میں دوسری احادیث وآثار کو بھی اپنی منشا پر اتار لیا گیا ہے۔ اور بدنام حنفیہ ہوئے کہ یہ احادیث وآثار کو نظر انداز کو کے اپنی رائے اور منشا پر عمل کرتے ہیں، ؎ خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

سنن کی اوپر کی نقل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ ظہر وعصر کی آخری دو رکعت میں امام کے پیچھے قراءۃ فاتحہ کے قائل نہ تھے، کیونکہ صرف حضرت عائشہؓ کا عمل ذکر کیا گیا ہے۔

امام بخاری کے اعتراض کا جواب

اس سے امام بخاری کے ص ۲۰ والے اس اعتراض کا جواب بھی ہو گیا کہ بعض الناس (امام اعظمؒ) پہلی دو رکعتوں میں تو ایک ایک آیت پڑھنے کو کافی بتلاتے ہیں۔ اور دوسری بعد کی دو رکعتوں میں کچھ نہ پڑھے تو حرج نہیں ہے، یہ صورت ظاہر ہے کہ امام صاحب کی طرف صرف امام کے پیچھے بن سکتی ہے جیسا کہ ہم پہلے عرض بھی کر چکے ہیں (منفرد یا امام کی نماز کے لئے حنفیہ کے نزدیک بھی پہلی دو میں فاتحہ وسورت دونوں واجب ہیں اور آخر دو میں بھی امام صاحب کے ایک قول سے فاتحہ واجب ہے، دوسری میں مستحب ہے) تو اگر سری نماز خلف الامام (ظہر وعصر) میں مقتدی پہلی دو میں کچھ پڑھ لے اور دوسری آخر میں کچھ نہ پڑھے تو اس سے کیا قباحت ہوئی، جبکہ یہی طریقہ حضرت ابو ہریرہؓ ایسے صحابی جلیل القدر کا بھی تھا، جو نماز وغیرہ کے احکام بیشتر صحابہ سے زیادہ جانتے تھے۔

صحابہ وتابعین کا مسلک

اس کے بعد ہم یہاں مزید وضاحت اس امر کی کرتے ہیں کہ صحابہ وتابعین یا سلف وخلف کی رائیں قراءت خلف الامام کے لیے کیا تھیں؟ حافظ ابن تیمیہؒ نے ''تنوع العبادات'' ص ۸۵/۸۶ میں لکھا:۔

امام کے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد سکوت کو (تاکہ مقتدی فاتحہ پڑھ لیں) امام احمدؒ پسند نہیں کرتے تھے، اور نہ امام مالک وابو حنیفہ نے اس کو مستحب سمجھا ہے، اور جمہور نے اس امر کو مستحب نہیں قرار دیا کہ امام سورۂ فاتحہ کے بعد سکوت کرے تاکہ مقتدی قراءت کر لے، اس لئے کہ ان کے نزدیک مقتدی کی قراءت جہری نماز میں نہ واجب ہے نہ مستحب ہے، بلکہ وہ ممنوع ہے، بلکہ امام احمد کے مذہب میں ایک قول پر

اس کی قراءت مبطل صلوٰۃ بھی ہے''۔

نیز لکھا کہ ''جمہور سلف نے جہری نماز میں قراءت خلف الامام کو مکروہ قرار دیا ہے اور اکثر ائمہ فاتحہ کے بعد امام کے سکوت طویل کے قائل نہ تھے اور جو حالت جہر میں قراءت کرتے تھے وہ کم تعداد میں تھے اور یہ کتاب و سنت سے ممنوع بھی ہے، اور اسی نہی و ممانعت کے قائل جمہور سلف و خلف تھے۔

پھر اس کی وجہ سے نماز باطل ہو جاتی ہے یا نہیں، اس میں اختلاف ہوا ہے اور بعض علماء اس طرف بھی گئے ہیں کہ حالت جہر میں مقتدی فاتحہ پڑھے، اور اگر نہ پڑھے گا تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی یا باطل ہوگی، اس میں ان کا اختلاف ہوا ہے غرض نزاع طرفین سے ہے، لیکن جو حضرات قراءت مع الامام سے منع کرتے ہیں وہ جمہور سلف و خلف ہیں اور ان کے ساتھ کتاب و سنت صحیحہ ہے، اور جنھوں نے مقتدی پر قراءت کو واجب کہا ہے ان کے پاس ابوداؤد کی حدیث ضعیف ہے جس کو ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، اور حدیث ابی موسیٰ میں (جو جمہور کا مستدل ہے) جملہ و اذا قرا فانصتوا کو امام احمد و اسحاق و امام مسلم وغیرہم نے صحیح قرار دیا ہے، امام بخاری نے اس کی تعلیل کی ہے مگر ان کی تعلیل سے اس کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بخلاف حدیث ابی عبادہ کے (جس میں لا تفعلوا الا بام القرآن ہے) کہ وہ صحیح میں شامل نہیں کی گئی ہے اور اس کا ضعیف ہونا چند وجوہ سے ثابت ہو چکا ہے اور در حقیقت وہ حضرت ابو عبادہؓ کا قول ہے''۔ (یعنی رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہے) بحوالہ اعلاء السنن ص ۱۱۵/۴)

افادۂ انور: معارف السنن ص ۱۹۱/۳ میں عنوان ''بیان مذاہب الصحابۃ والتابعین'' کے تحت تفصیل و تحقیق بھی قابل مطالعہ ہے، جس میں اسی (۸۰) صحابہ کبار سے قراءۃ خلف الامام کی ممانعت نقل ہے، اور صحابہ عشرہ مبشرہ سے بھی اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ سلف میں سے اقل قلیل وجوب کی طرف گئے ہیں، ہیں، جیسے مکحول۔ اور امام کے پیچھے قراءت کرنے والے بھی اقل قلیل ہی تھے، البتہ سکتات میں پڑھنے والے ان سے زیادہ تھے اور صرف سریہ میں قراءت کرنے والے ان سے زیادہ تھے، اور ان میں ہی وہ بھی تھے کہ کبھی سریہ میں پڑھ لیتے اور کبھی ترک کرتے تھے، پھر فرمایا کہ یہ سب تفصیل سارے آثار صحابہ و تابعین کی تلاش و مراجعت کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یوں ہی (امام بخاری کی طرح سے) ایک جانب اختیار کر کے اور ایک ذہن بنا کر اپنے موافق آثار نکال لینے سے کچھ نہیں ہوتا، اور حافظ علاؤ الدین ماردینیؒ نے ''الجواہر النقی'' میں اسانید صحاح سے حضرت جابر، حضرت ابن مسعود، زید بن ثابت اور حضرت ابن عمرؓ کا تعامل عدم قراءت خلف الامام کا محدث کبیر ابن ابی شیبہ، محدث شہیر عبدالرزاق اور حافظ حدیث بزار سے نقل کر دیا ہے۔ ص ۱۹۵/۳ تک تفصیل قابل مطالعہ ہے، پھر حضرت شاہ صاحب کا ارشاد نقل کیا کہ امام بخاریؒ نے بہت سے تابعین کے نام لکھ دیئے ہیں کہ وہ سب بھی قراءت کے قائل تھے، مگر اجمال کر گئے، یہ نہ بتلایا کہ ان میں سے کون جہریہ میں قراءۃ کا قائل تھا اور کون سریہ میں؟ اور علامہ ماردینی نے حضرت اسود علقمہ اور ابراہیم نخعی سے قراءت خلف الامام کے لئے جو نہی اور نکیر شدید مصنف عبدالرزاق و مصنف ابن ابی شیبہ سے بہ اسانید قویہ نقل کی ہے، ان اسانید قویہ و اقوال کے بارے میں چونکہ امام بخاری کوئی طعن بھی نہیں کر سکے اس لئے طعن کا دوسرا طریقہ اختیار کیا کہ یہ مضامین جو ان آثار میں ذکر ہوئے ہیں یہ اہل علم کے شایان شان نہیں ہیں، کیونکہ حدیث میں ہے کہ کسی پر لعنت نہ بھیجو، کسی کو آگ کا عذاب مت دو، اور کسی کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اصحاب نبی کریم ﷺ کے لئے اس طرح کہے کہ اگر وہ امام کے پیچھے قراءت کرے گا تو اس کے منہ میں خاک بھر جانا اس سے بہتر ہے وغیرہ اور یہ بھی کہ حدیث نبوی (بابۃ قراءۃ فاتحہ خلف الامام) ثابت ہو جانے کے بعد اسود وغیرہ کے اقوال سے استدلال کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ (جزء القراءۃ بخاری ص ۷)

افادۂ بنوری: اس پر علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ عمل اور ڈرانے میں تو بڑا فرق ہے، لہٰذا ممانعت تو آگ سے جلانے کی ہے یا کسی کے منہ میں مٹی بھرنا تو ضرور برا ہے مگر اس سے ڈرانا بھی اسی درجہ میں کیسے ہو جائے گا؟ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ حضرت علقمہ، حضرت اسود اور حضرت ابراہیم نخعی ایسے جلیل القدر اکابر امت رسول اکرم ﷺ کے ارشادات کا مطلب بعد کے لوگوں سے زیادہ جانتے اور سمجھتے تھے۔ اور وہ احوال صحابہ کرام سے بھی زیادہ واقف تھے۔

ائمہ وتابعین کا مسلک: نیز محقق ابن قدامہؒ نے "المغنی" ص۶۰۴/۱ میں لکھا کہ جب مقتدی قراءۃ امام سن رہا ہو تو اس پر قراءت واجب نہیں ہے نہ مستحب ہے، یہی قول مندرجہ ذیل حضرات کا ہے:۔ امام احمد، زہری، ثوری، امام مالک، ابن عیینہ، ابن مبارک، اسحٰق، سعید بن المسیب، عروۃ بن الزبیر، ابوسلمہ بن عبدالرحمٰن، سعید بن جبیر اور جماعت سلف کا نیز دوسرا قول امام شافعی کا بھی یہی ہے۔ الخ مذکورہ تفصیل سے امام بخاری کے مبالغات کی نوعیت واضح ہوگئی ہے۔

تفریق مجموع وجمع مفرق کا اعتراض

امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ ص۶ میں پھر اپنے سابقہ اعتراض کو دہرایا کہ امام ابوحنیفہؒ نے فرض وواجب کو نفل سے بھی کم درجہ کا کر دیا کہ مقتدی کو ثنا کی تو اجازت دیدی جو بدرجہ نفل تھی بلکہ بعض حضرات (مالکیہ) کے نزدیک تو نہ وہ امام پر ہے نہ مقتدی کے لئے بلکہ تکبیر تحریمہ کے بعد وہ فوراً قراءت کے قائل ہیں، اور قراءت فاتحہ جو مقتدی پر بھی فرض تھی اس سے روک دیا گیا، اس طرح گویا ان حضرات نے دو الگ الگ چیزوں کو جوڑ دیا یعنی نفل وفرض کو یکساں کر دیا۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ظہر، عصر وعشا کی کسی دو رکعت میں قراءت کرے اور باقی دو میں نہ کرے تو نماز ہو جائے گی، لیکن اگر چار رکعت نفل کی نماز میں کسی ایک رکعت میں بھی قراءت نہ کرے گا تو وہ نماز درست نہ ہوگی، اسی طرح اگر فرض مغرب کی تیسری رکعت میں قراءت نہ کرے تو نماز درست رہے گی اور وتر کی تیسری میں نہ پڑھے تو نماز نہ ہوگی، حالانکہ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ کوئی رکعت بھی بغیر فاتحہ کے درست نہ ہوگی، آپ نے ہر نماز نفل وفرض کی رکعات کا حکم ایک کیا تھا، امام ابوحنیفہؒ نے الگ الگ کر دیا۔ گویا امام ابوحنیفہؒ اس بات پر بڑے ہی حریص اور "مولع" تھے کہ جن چیزوں کا حکم شارع نے ایک کیا ہے، ان کو الگ الگ کر دیں، اور جن کا حکم الگ الگ تھا ان کا حکم ایک کر دیں۔

جواب: ہدایہ وغیرہ تمام کتب فقہ حنفی کی تفصیلات ودلائل سے جو حضرات واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے اوپر کے سارے مسائل کا فیصلہ صرف شارع علیہ السلام ہی کی ہدایات کے تحت کیا ہے، اپنی رائے سے کچھ نہیں کیا، اور اگر خدانخواستہ وہ ایسے ہی مخالفت شریعت کے حریص ومشتاق ہوتے جیسا امام بخاریؒ نے خیال کر لیا تھا، تو کیا ہزار ہا اکابر امت محمدیہ ان کے علم وتفقہ کے مداح ہوتے اور ہمیشہ ہر دور میں دو تہائی امت محمدی کے افراد ان کے پیرو ہو سکتے تھے؟

افسوس ہے کہ عبدالرحمٰن بن مہدی اور حمیدی ونعیم خزاعی جیسے حضرات اساتذۂ امام بخاری نے ان کو امام صاحبؒ سے سخت بدظن کر دیا تھا، اور نعیم خزاعی تو جھوٹ باتیں گھڑ کر بھی امام صاحب کی طرف منسوب کیا کرتے تھے، عبدالرحمٰن بن مہدی کا واقعہ بھی ہم نے نقل کیا تھا کہ امام صاحب کے فقہ کا نقشہ اس طرح کھینچا کرتے تھے کہ گویا ساری امت کے فقہاء ایک وادی میں ہیں اور امام صاحب سب سے الگ اور تن تنہا اپنا اونٹ چرا رہے ہیں۔ اس سے بڑا افتراء امام صاحب پر کیا ہو سکتا ہے؟

فقہ حنفی شوروی واجتماعی ہے

جس امام اعظمؒ کی فقہ شوروی واجتماعی تھی اور چالیس اکابر محدثین وفقہاء کی تدوین کردہ۔ اس کی پوری تفصیل ہم نے مقدمہ انوار الباری حصہ اول میں کی ہے اور اس کا بہترین خاکہ مولانا المرحوم بنوریؒ نے معارف السنن ص۲۶۴/۳ تا ص۲۶۸/۳ میں پیش کیا ہے، اس کی فقہ کو مطعون کیا جائے، بڑا ظلم ہے، اور جس مسئلہ کی بحث اس وقت ہمارے سامنے ہے، یعنی جہری نمازوں میں فاتحہ خلف الامام اس کو ہی دیکھ لیا جائے کہ امام اعظمؒ نے جو فیصلہ کیا تھا اسی کو امام مالک، امام شافعی وامام احمد اور دوسرے سارے اکابر امت نے بھی اختیار کیا، اور ان سب سے الگ رہنے والے صرف امام بخاری وابن حزم یا اس دور کے غیر مقلد اہل حدیث ہیں جو امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی قراءت فاتحہ کو

واجب وفرض بتلاتے ہیں اور اس کے بغیر نماز مقتدی کو کالعدم اور باطل محض قرار دیتے ہیں۔ پھر جس طرح امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ جزء القراءۃ میں امام اعظم کے خلاف سخت غضب وغصہ کا اظہار کیا ہے اور طرح طرح سے مطعون کیا ہے، وہی طریقہ غیر مقلدوں کا بھی ہے، آگے امام بخاری ۱۳ صفحہ کے بعد ص۱۹ میں یہ بھی لکھیں گے کہ امام اعظمؒ خنزیر بری کو حلال کہتے تھے، اور امت مسلمہ میں باہم قتل وخونریزی کو جائز بتلاتے تھے، اور نماز کو ذمہ مسلم پر لازم نہیں سمجھتے تھے، اور برخلاف نص کلام اللہ مدت رضاعت ڈھائی سال قرار دیتے تھے۔

سبب طعن وتشنیع: ان سب مطاعن کا جواب بھی آگے آئے گا، اور پہلے بھی بارہا دیا گیا ہے، غرض یہ ہے کہ امام بخاریؒ معاندین امام اعظمؒ کے غلط پروپیگنڈے سے اس درجہ متاثر ہو گئے تھے کہ بقول حضرت شاہ صاحبؒ صحیح بخاری میں تو احتیاط کی ہے، اس کے علاوہ اپنی دوسری تالیفات میں سخت کلامی اختیار کی ہے، اور غیر معمولی برہمی کا اظہار کیا ہے، اسی طریقہ کو غیر مقلدوں نے بھی اپنایا اور یہ نہ دیکھا کہ امام بخاری وغیرہ چند حضرات کے علاوہ ساری امت کے اکابر سلف وخلف نے کیسی کیسی مدح سرائی امام صاحب کی شان میں کی ہے، پھر جن مسائل میں امام صاحب کے ساتھ دوسرے ائمہ مجتہدین اور اکابر امت بھی ہیں ان میں بھی صرف امام صاحب اور حنفیہ ہی کو مطعون بنانا کہاں کا انصاف ہے؟!

ائمہ اربعہ کا اتفاق: ہم پہلے لکھا تھا کہ پوری فقہ اسلامی کے تین چوتھائی مسائل میں سارے ائمہ فقہ کا اتفاق ہے اور باقی چوتھائی میں بھی بڑا اختلاف حلال وحرام یا ممنوع وواجب کا بہت ہی تھوڑے مسائل میں ہے۔ اور عقائد واصول میں تو کسی ایک مسئلہ میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے، واللہ تعالےٰ اعلم۔

مطاعن مذکورہ امام بخاریؒ کا جواب

ہم نے مقدمہ انوار الباری میں امام بخاریؒ کے متعدد بڑے مطاعن کا ذکر کر کے جوابات لکھے تھے، وہاں دیکھے جائیں، مثلاً امام صاحب کو مرجی قرار دینا، حالانکہ امام صاحب کا مسلک وہی ارجاء اہل سنت تھا، جو تمام اکابر امت اور سلف وخلف کا ہے، وہ اس بارے میں جمہور اہل سنت کے ساتھ ہیں، مگر چونکہ مرجۂ کی ایک قسم اہل بدعت بھی تھے، اس لئے مطلقاً مرجی نام دھر کر قدر گرائی گئی۔

دوسری بڑی منقصت امام بخاریؒ نے امام صاحب کے حالات بیان کرتے ہوئے یہ لکھی کہ ان کی رائے اور حدیث سے لوگوں نے سکوت کیا، صاحب ذب ذبابات الدراسات علامہ محدث محمد ہاشم سندیؒ (م ۱۱۸۹ھ) نے یہ جملہ دیکھا تو بڑے تذبذب میں پڑ گئے، انھوں نے لکھا کہ خاتمۃ المحدثین نے اپنی "عقود" میں اور دوسرے حضرات نے اپنی مصنفات میں جو امام اعظمؒ کی محدثانہ شان واضح کی ہے، اس سے یہ بات بہ صراحت ثابت ہوتی ہے کہ دوسرے اکابر محدثین نے امام صاحب کی حدیث اور رائے دونوں کو قبول کیا ہے، لہٰذا امام بخاری کے حکم بالسکوت کو اگر طعن کے طور پر تسلیم کرلیں تو امام بخاری پر کذب صریح کی بات آتی ہے، جو ان کے شایان شان نہیں، لہٰذا میرے نزدیک ان کے جملہ مذکورہ بالا کا مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ لوگوں نے ان کی حدیث ورائے میں جرح نہیں کی اور اس سے سکوت اختیار کیا ہے۔ اس کے سوا دوسرا مطلب امام بخاری کی طرف منسوب کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ہم ان کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ (ذب ص ۳۰/۲)

اس پر ہمارے مولانا المحقق نعمانی دام فیضہم نے حاشیہ میں استدراک کیا کہ یہ توجیہ درست نہیں ہوسکتی، کیونکہ امام بخاری کا ان جملوں سے جو مقصد ہوتا ہے وہ سب کو معلوم ہے، حافظ ابن کثیرؒ نے الباعث الحثیث ص ۳۴ میں لکھا کہ خاص لوگوں کی خاص اصطلاحات ہیں ان سے واقفیت ضروری ہے، مثلاً امام بخاری جب کسی کے لئے "سکتوا عنہ" لکھیں گے یا "فیہ نظر" تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ان کے نزدیک کم تر اور ادنی مرتبہ کا ہے، چونکہ وہ جرح میں اپنا ایک خاص لطیف مزاج رکھتے ہیں، اس لئے یہ پیرایہ اختیار کرتے ہیں، اور اس کو جاننا چاہیے،

علامہ محدث سیوطیؒ نے تدریب الراوی ص ۱۲۷ میں لکھا کہ امام بخاری فیہ نظر یا سکتوا عنہ ان لوگوں کے لئے کہتے ہیں جن کی حدیث کو لوگ قبول نہیں کرتے۔

پھر علامہ نعمانی نے لکھا: جولوگ امام بخاری کی تصانیف میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ مطالعہ کریں گے، مثلاً آپ کی تینوں تاریخوں میں یا الضعفا والمتروکین میں اوران تعریضات سے بھی واقف ہوگا جوانھوں نے جامع صحیح اور جزء القراءۃ خلف الامام اور جزء رفع الیدین میں امام صاحب پر کی ہیں، تو وہ ان کے امام صاحب کے لئے شدت تعصب اور سخت حملوں پر تعجب وحیرت کئے بغیر نہ رہے گا۔ اللہ تعالےٰ ان کی مغفرت فرمائے اور مسامحت کا معاملہ کرے۔

حضرت علامہ محمد انورشاہ کشمیریؒ نے بسط الیدین میں لکھا:۔ امام ابوحنیفہؒ کے مناقب اور مثالب دونوں ہی لوگوں کی زبانوں پر تھے مگر امام بخاریؒ نے سارے مناقب کو تو نظرانداز کردیا اور مثالب جمع کردئے۔

علامہ حافظ ابن رشیدؒ نے لکھا:۔ امام بخاریؒ حنفیہ کی بہ کثرت مخالفت کرنے والے تھے (اتحاف شرح احیاء الغزالی ص۹۴/۴) علامہ زیلعیؒ (صاحب نصب الرایہ) جن کے بارے میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اتحاف النبلاء ص۳۶ میں حافظ ابن حجرؒ سے نقل کیا کہ وہ کثیر الانصاف تھے، انھوں نے نصب الرایہ میں جہر بسم اللہ کی بحث کرتے ہوئے دارقطنی کی پیش کردہ احادیث موضوعہ وضعیفہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:۔ اپنے مختار مسلک کو ثابت کرنے کے لئے ضعیف کو صحیح قرار دینا یا صحیح کو ضعیف ومعلول دکھانے کی سعی کرنا اہل علم وانصاف کے لئے کسی طرح بھی موزوں نہیں ہے، بلکہ اہل علم ودین کی شان تو یہ ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کا بھی تعصب اور بےانصافی روانہ رکھیں پھر لکھا:

''احادیث جہر کے ضعیف اور ناقابل عمل ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ ان کی روایت سے اصحاب صحاح وسنن ومسانید مشہورہ نے اعراض کیا ہے، اور امام بخاریؒ بھی جن کا مسلک امام ابوحنیفہ کے خلاف شدید تعصب اور فرط تحمل (جارحیت) سب کو معلوم ہے کوئی ایک حدیث بھی جہر بسم اللہ کی اپنی صحیح میں نہیں لائے، اور امام مسلم بھی کوئی حدیث نہیں لائے، بلکہ حدیث انسؓ لائے جو اخفاء پر دال ہے، اگر کہا جائے کہ ان دونوں نے ساری احادیث صحاح لانے کا التزام ہی کب کیا ہے؟ اور ممکن ہے کہ متروکہ احادیث صحاح میں احادیث جہر بھی ہوں، لیکن یہ بات ایسے موقع پر کوئی کٹ حجتی ہی کہہ سکتا ہے کیونکہ جہر بسم اللہ کا مسئلہ اعلام مسائل اور مشکلات فقہ میں سے ہے، جن پر مناظرے اور مباحثے جاری رہے ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے خاص طور سے امام ابوحنیفہؒ کے رد میں بڑا تتبع وریسرچ کی ہے، چنانچہ ایک حدیث ذکر کریں گے، پھر امام صاحب پر تعریض کریں گے کہ رسول اکرم ﷺ کا تو یہ ارشاد ہے اور بعض الناس (امام صاحب) ایسا ایسا کہتے ہیں۔ (یعنی حدیث مذکور کے خلاف) اس طرح امام صاحب پر مخالفت حدیث کا طعن اور تشنیع وملامت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کوئی حدیث بھی جہر بسم اللہ کی ان کی نظر میں صحیح ہوتی تو وہ ضرور اپنی صحیح بخاری میں لاتے۔

امام بخاریؒ نے شروع بخاری میں باب الصلوٰۃ من الایمان قائم کیا پھر احادیث الباب لائے اور ان کا ارادہ امام صاحب کے قول ''ان الاعمال لیست من الایمان کا رد تھا، حالانکہ یہ مسئلہ تو دقیق تھا اور صرف فقہاء کے سمجھنے کا تھا، جبکہ جہر بسم اللہ کے مسئلہ کو عوام وجہال بھی جانتے تھے، لہٰذا یہ بات تو میرے نزدیک واللہ باللہ ناممکن بلکہ محال ہے کہ امام بخاری کے نزدیک کوئی بھی صحیح حدیث جہر بسم اللہ کی ان کی شرط کے موافق یا اس سے کچھ قریب بھی ہوتی اور وہ اس کو بخاری میں نہ لاتے'' (نصب الرایہ ص۳۵۵/۱)

علامہ محدث سخاوی شافعیؒ نے الاعلان بالتوبیخ میں لکھا کہ شیخ ابوحیان نے کتاب السنہ میں جو کلام بعض ائمہ مجتہدین (امام ابوحنیفہؒ) پر کیا ہے، اور ایسے ہی ابن عدی نے اپنی کامل میں اور خطیب نے اپنی تاریخ میں اور دوسروں نے اس سے پہلے جیسے ابن ابی شیبہ نے اپنے مصنف میں اور بخاری ونسائی نے بھی جن کو ایسی باتوں سے دور رہنا ہی زیادہ بہتر تھا، میرے نزدیک اس بارے میں ایسے حضرات کا اتباع ہرگز نہ کیا جائے۔ (ذب ص۲۹۸/۲)

حافظ حدیث علامہ صالحی شافعیؒ مؤلف ''السیرۃ الکبری الشامیہ'' نے عقود الجمان فی مناقب ابی حنیفۃ النعمان'' میں لکھا:۔ میرے عزیز

بھائی! ہرگز ہرگز ان کتابوں کا مطالعہ نہ کرنا جو بعض لوگوں نے کسی امام مجتہد کے مثالب اور برائیوں میں لکھی ہیں، کہ اس سے تمہارے دلوں میں سے ان اکابر کی عظمت نکل جائے گی، اور تمہارا قدم ہدایت کے راستے پر مستقیم ہو جانے کے بعد پھر سے پھسل جائے گا، اور تم خطیب بغدادی کی ان نقول پر بھی بھروسہ نہ کرنا جو امام ابوحنیفہ کی شان رفیع کے خلاف درج کردی ہیں، انھوں نے اگرچہ مادحین کے اقوال بھی ذکر کئے ہیں مگر اس کے بعد مذمت کرنے والوں کے ہفوات بھی نقل کر دیئے ہیں جن سے ان کی کتاب کو بڑا بٹہ لگ گیا ہے اور ہر ایک بڑے چھوٹے کو ان کی تاریخ پر اعتراض کا موقع مل گیا ہے۔ درحقیقت انھوں نے یہ مثالب کا باب درج کتاب کر کے ایسی گندگی پیدا کردی ہے کہ وہ سات سمندروں کے پانی سے بھی نہیں دھل سکتی (۔۔ص ۲۹۹/۲)

علامہ ابن حجر مکی شافعیؒ نے "الخیرات الحسان فی مناقب النعمان" میں مستقل فصل قائم کر کے خطیب کی چیزوں کا رد کیا ہے اور ان کی اسانید ساقطہ وضعیفہ کی پول کھول دی ہے۔ اور پھر یہ بھی لکھا کہ اجماعی واتفاقی مسئلہ ہے کہ اس طرح کسی معمولی مسلم کی آبرو ریزی بھی جائز نہیں تو ائمہ مسلمین میں سے کسی امام کی توہین وتحقیر کیونکر جائز ہو سکتی ہے؟! الخ (۔۔ص ۳۰۰/۲)

علامہ محمد ہاشم سندیؒ نے لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں دار قطنی وخطیب کی جرح متعصب کی جرح کہلائے گی، اور وہ اس میں تعصب کی وجہ سے متہم ہو گئے۔ لہٰذا وہ مقبول نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کچھ لوگوں نے امام بخاری پر بھی جرح کی ہے، جس طرح متہمین بالتعصب کی جرح کو ہم ان کے حق میں قبول نہیں کرتے، امام صاحبؒ کے بارے میں بھی متہمین بالتعصب کی جرح کو قبول نہیں کریں گے (ص ۲۸۴/۲)

اس کے بعد ہم جزء القراءۃ کے مطاعن کا مختصر جواب بھی عرض کرتے ہیں:۔

خنزیر بری کی حلت: علامہ کوثریؒ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے امام اعظمؒ پر ارجاء کا طعن اور خنزیر بری کی حلت کا الزام غسان مرجئی اور شمری معتزلی کے اتباع میں لگایا ہے، حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط اور بے اصل ہیں:۔

ارجاء کی بحث تو کئی جگہ اور تفصیل سے آچکی ہے، خنزیر بری کی حلت کے بہتان پر حافظ ابن تیمیہؒ نے لکھا:۔

اگرچہ امام ابوحنیفہؒ کی لوگوں نے کچھ مسائل میں مخالفت کی ہے، مگر ان کے علم وفہم اور فقہ سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، اور بعض لوگوں نے ان کی طرف ایسی باتیں بھی منسوب کردی ہیں جن سے مقصود ان پر تشنیع ہے، حالانکہ وہ قطعاً جھوٹ اور ان پر بہتان ہیں مثلاً خنزیر بری کی حلت وغیرہ (منہاج السنۃ ص ۲۵۹/۱)

شمزی وابن عبید کا ذکر

عمرو بن ابی عثمان الشمزی بقول سمعانی معتزلہ کا سردار تھا، جس نے عمرو بن عبید اور واصل ابن عطا سے روایت کی ہے، علامہ نعمانی نے لکھا کہ تعصب کا بھی عجیب معاملہ ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی یہ بھی نہیں دیکھتا کہ جو بات کسی بڑے شخص کی طرف منسوب کی جارہی ہے، اس میں انقطاع، عدم ضبط، تہمتِ کذب، جہالۃ، بدعت، حسد، بغض، عصبیت وغیرہ میں سے تو کوئی نقص یا علت نہیں ہے۔ جبکہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی روایت کو گرانے کے لئے کافی ہے، مگر ایسی کوئی روایت جو امام ابوحنیفہؒ کے مثالب میں ہاتھ آجائے تو اس کو ضرور معتبر ومعتمد روایت کی طرح بے تامل نقل کردیا جاتا ہے۔

کیا اتنے بڑے امام اعظمؒ کے حق میں یہی بات موزوں تھی؟ جس کو ہمیشہ سے امت کے دو ثلث افراد نے اپنے دین اور عقائد واعمال کے لئے مقتدا اور رہبر تجویز کیا ہے؟ ان کے بارے میں ہر گری پڑی روایت خواہ وہ کسی کذاب، مرجئی اہل بدعت یا افتراء پرداز معتزلی ہی نے گھڑ کر چلائی ہو، قبول کرنا اور اس کو نقل کر کے آگے بڑھانا علم وانصاف کی شان سے بہت بعید ہے۔

یہ رئیس المعتزلین شمزی عمرو بن عبید (عابد شیوخ الاعتزال) کا شاگرد تھا، اس کا بہتان وافتراء قبول کرلیا گیا حالانکہ خود اس کے استاذ

مذکور کی حیثیت بھی امام اعظم کی وجاہت و جلالتِ قدر کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی، علامہ آجری نے امام حدیث ابوداؤد سے نقل کیا کہ "ابوحنیفہ ہزار عمرو بن عبید جیسوں سے افضل و بہتر ہیں۔ (تہذیب ص ۷۰/۸ ترجمہ عمرو بن عبید)

قابلِ غور و فکر ہے یہ بات کہ امام بخاری تعصب کی وجہ سے کہاں تک پہنچ گئے کہ شمری کی بات پر امام اعظمؒ کے خلاف اعتماد کر لیا، اور امام ابوداؤد صاحب سنن ابی داؤد امام اعظمؒ کا کتنا بڑا مرتبہ و عظمت مانتے ہیں کہ ہزاروں عمرو بن عبید کو بھی ان کے مقابلہ میں نظر انداز کرتے ہیں، جو شمری کے استاذ تھے، اور وزیر یمانی جیسے بابصیرت نے پھر بھی دھوکہ کھایا کہ ایک جگہ "تنقیح الانظار" میں یہ لکھ دیا کہ عمرو بن عبید حفظ و اتقان میں امام ابوحنیفہؒ سے کم نہ تھے۔ بہر حال! اگر انہوں نے اس بات کو صحیح سمجھ کر ہی کہا تب بھی امام ہمام ابوداؤد کے مقابلہ میں ان کی رائے کا کیا وزن ہو سکتا ہے؟!

امام بخاری و ابوداؤد کا فرق

امام ابوداؤد سے یہ بھی نقل ہے کہ امام ابوحنیفہ کے ذکر پر فرماتے تھے رحم اللہ ابا حنیفۃ کان اماما (اللہ تعالیٰ امام ابوحنیفہ پر رحمتیں نازل فرمائے کہ وہ امامت کے مرتبہ پر سرفراز تھے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ صحیح فرماتے تھے کہ اصحابِ صحاح میں سے امام ابوداؤد امام صاحب کی منہ بھر کر تعریف کرتے تھے، نہایت افسوس و رنج ہوتا ہے کہ ان کے مقابلہ میں امام بخاری کذابین و وضاعین کی جھوٹی خبروں پر بھروسہ کر کے ان کی طرف غلط باتیں منسوب کر گئے۔

امام بخاری نے شمری معتزلی کی بات پر یقین کر لیا، اور یہ نہ دیکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے معتزلہ کے عقاید باطلہ کا رد کیا تھا، اور ان کو اہل اہواء میں قرار دیا تھا اس لئے وہ لوگ عناد و حسد کی وجہ سے امام صاحب کے دشمن تھے اور جھوٹے الزامات امام صاحب پر لگایا کرتے تھے، یہ بھی انہوں نے ہی مشہور کیا تھا کہ امام صاحب اور عمر بن عثمان شمری مکہ معظمہ میں ایک جگہ ملے اور ان کے مابین ایمان کے بارے میں مناظرہ ہوا یہ بھی سراسر جھوٹی روایت امام صاحب کو بدنام کرنے کے لئے گھڑی گئی تھی، جس کا ذکر علامہ زبیدیؒ نے اتحاف السادہ میں کیا ہے۔

علامہ زبیدیؒ نے اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ امام صاحب پر ایسے لوگوں کا جھوٹ کیسے چل سکتا ہے جبکہ ان کے معاصر امام مالک، سفیان، اوزاعی وغیرہ اور پھر امام شافعی، امام احمد، اور ابراہیم بن ادہمؒ جیسے بڑوں نے امام صاحب کی مدح و ثنا کی ہے، اور ان کے معتقد، ان کی فقہ، ورع و زہد، علوم شریعت میں مہارت اور اجتہاد و احتیاطِ امور دین کے بارے میں بہت کچھ تعریف کی ہے جو کتابوں میں ثابت ہے۔

مناظرہ امام صاحب و جہم بن صفوان

امام صاحب نے جو مناظرہ جہم بن صفوان سے کیا تھا وہ بھی مشہور و مسطور فی الکتب ہے، وہ صرف تصدیق قلبی کو ایمان کہتا تھا، امام صاحب نے اس کے ساتھ اقرار باللسان کا ضروری ہونا ثابت کیا تھا، لہٰذا جن حضرات نے امام صاحب یا امام ابو یوسف کو جہمی سمجھا یا امام بخاری نے امام محمد کو جہمی کہا، یہ سب ان حضرات پر افتراء ہے، ائمہ اربعہ اور ان کے متبعین سب کے عقائد ایک تھے، اس بارے میں ان کے اندر کوئی اختلاف نہیں تھا۔ (حاشیہ ذب ص ۵۲/۲۷)

مسئلہ خلق قرآن اور امام بخاری کا جواب

امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ ص ۱۹ میں الزام قائم کیا کہ امام صاحب کا عقیدہ امر اللہ من قبل و من بعد کے مخلوق ہونے کا تھا، اس کے بارے میں محشی علام نے لکھا:۔ امام اعظم کی شانِ رفیع اور ان کا علم و فہمِ عظیم اس سے کہیں ارفع ہے کہ وہ کلامِ نفسی باری تعالیٰ کو مخلوق کہیں یا حروف و اصوات اور حافظوں کے دماغوں میں حادث ہونے والے حروف کو غیر مخلوق قرار دیں، اور یہ قرآن مجید تو خدائے تعالیٰ کے اوامر،

نواہی کا ہی مجموعہ ہے، امام بیہقی نے اپنی کتاب ''الاسماء والصفات'' میں امام محمدؒ سے نقل کیا کہ وہ فرماتے تھے ''جو قرآن کو مخلوق کہے اس کے پیچھے نماز مت پڑھو'' اور محمد بن سابق نے امام ابو یوسفؒ سے سوال کیا کہ کیا امام ابو حنیفہ قرآن مجید کو مخلوق کہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا:۔ معاذ اللہ! نہ وہ یہ بات کہتے تھے اور نہ میں کہتا ہوں، دوسرا سوال کیا کہ کیا امام صاحب کی رائے جہم کے موافق تھا؟ جواب دیا:۔

معاذ اللہ! اور نہ میری رائے یہ ہے، اس کے سب راوی ثقہ ہیں۔

اسکے بعد دوسری روایت ذکر کی کہ امام ابو یوسفؒ نے فرمایا میں نے ایک دفعہ امام صاحب سے قرآن مجید کے مخلوق و غیر مخلوق ہونے کے بارے میں گفتگو کی تو ہم دونوں کی رائے اس امر پر متفق ہوگئی کہ جو قرآن کو مخلوق کہے وہ کافر ہے (کتاب الاسماء والصفات ص۲۵۰\۲۵۱ طبع مصر)

امام ابو حنیفہ کے بارے میں حافظ ابن تیمیہ حنبلی کی رائے

حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الایمان میں لکھا:۔ خدا کی بڑی رحمت و فضل ہے اپنے مسلمان بندوں پر کہ سارے وہ ائمہ جن پر امتِ مسلمہ کا مکمل اعتماد واطمینان ہے اور ان کی بات مانی جاتی ہے، ائمہ اربعہ وغیرہم جیسے امام مالک، ثوری، اوزاعی، لیث ابن سعد، اور جیسے امام شافعی، امام احمد، اسحاق، ابو عبید، امام ابو حنیفہ، ابو یوسف و محمد، یہ سب ہی فرقۂ جہمیہ کے اہلِ کلام پر نکیر و رد کرتے رہے ہیں، ان کے عقیدۂ خلقِ قرآن کے بارے میں بھی اور ایمان وصفاتِ باری کے متعلق بھی۔ اور یہ سب ہی حضرات ان امور پر متفق تھے جو سلف سے منقول تھے۔ (ص۱۶۳\۱۶۴ طبع مصر)

امام ابو حنیفہ اور امام احمدؒ

پھر خود امام احمدؒ جو مسئلہ خلق قرآن کے فتنہ میں مبتلا ہوئے اور حکومتِ وقت سے سخت تکالیف بھی اٹھائیں، ان کے حالات سب کو معلوم ہیں اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ جو قرآن کو مخلوق کہتا تھا امام احمدؒ اس کے شدید مخالف تھے، لیکن وہ بھی امام ابو حنیفہ کو امام بخاری والے اوپر کے اتہام سے بری سمجھتے تھے اور یوں بھی امام صاحبؒ کی نہایت تعظیم کرتے تھے افسوس ہے کہ امام بخاری نے اپنے استاذ معظم امام احمدؒ کا بھی اس بارے میں کچھ خیال نہیں کیا۔ علامہ طوفی حنبلی نے شرح مختصر الروضہ میں اصولِ حنابلہ کے ذکر میں لکھا:۔

امام ابو حنیفہ کے لئے علامہ طوفی حنبلی کا خراجِ عقیدت

''امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں جو کچھ لوگوں نے کہا اور ان کو بہت سے امور کے ساتھ متہم کیا، واللہ میں ان کو ایسی تمام باتوں سے بری اور منزہ سمجھتا ہوں، اور امام صاحب کے بارے میں میری قطعی رائے یہ ہے کہ انہوں نے کسی مسئلہ میں بھی جان بوجھ کر یا عناداً سنتِ نبویہ کی مخالفت نہیں کی ہے، اگر کہیں مخالفت ہوئی ہے تو وہ اجتہادی مسائل میں اور وہ بھی واضح حجتوں اور صالح و روشن دلائل کے ساتھ ہوئی ہے، اور ان کی حجج و دلائل سب لوگوں کے سامنے موجود ہیں، لیکن ان کے مخالفین میں کم ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے انصاف سے کام لیا ہو، جبکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہ صورتِ خطا بھی امام صاحب کے لئے ایک اجر ہے اور صواب میں دو اجر ہیں، ان کے بارے میں طعن کرنے والے یا تو حاسد ہیں یا ان کے مواقعِ اجتہاد سے ناواقف و جاہل ہیں، پھر لکھا کہ امام احمدؒ سے جو آخری رائے اور فیصلہ امام صاحبؒ کے بارے میں ہمیں پہنچا ہے وہ ان کی شان میں بہتر اور مدح و ثنا ہی کا ہے جس کو ہمارے اصحاب میں سے ابو الورد نے کتاب اصول الدین میں ذکر کیا ہے۔ (حاشیۂ ذب ص۷۵\۲)

علامہ کوثریؒ نے بھی تانیب ص۱۴۴ میں اس کو نقل کیا ہے اور یہ بھی لکھا کہ امام احمدؒ نے مسائل کتب ابی حنیفہ میں سے صرف چند مسائل سے اختلاف کیا ہے جو امام شافعیؒ وغیرہ کے اختلاف سے بہت کم ہے۔ اور لکھا کہ شواہد اس پر دال ہیں کہ امام احمدؒ نے امہاتِ مسائل خلافیہ میں امام ابو حنیفہؒ کی متابعت کی، علامہ خوارزمیؒ نے جامع المسانید ص۶۷\۱ میں یہ بھی لکھا کہ اصول المسائل میں سے میں نے ایک سو پچیس

مسئلے ایسے جمع کئے ہیں، جن میں امام احمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کی موافقت کی ہے اور امام شافعیؒ نے ان میں مخالفت کی ہے (اس کے باوجود دور حاضر کے حنابلہ کا مخالفین امام احمد (غیر مقلدین) سے قرب اور ہم سے بُعد موجب حیرت ہے)

علامہ کوثریؒ نے لکھا کہ مغنی ابن قدامہ بھی اس کے لئے کافی دلیل وشاہد ہے اور الانصاح لابن ہبیرہ وزیر حنبلی بھی باوجود مختصر ہونے کے اس کا اچھا ثبوت ہے۔ پھر علامہ کوثریؒ نے یہ بھی حوالہ دیا کہ میں نے بلوغ الامانی میں امام احمد سے امام صاحب کے بارے میں مختلف روایات کے اسباب و وجوہ پر بحث کردی ہے اور الاختلاف فی اللفظ کے حاشیہ میں بھی ان کو واضح کیا ہے۔

علامہ محمد ہاشم سندیؒ نے ابوبکر مروزی سے نقل پیش کی کہ میں نے امام احمدؒ سے سنا وہ فرماتے تھے کہ ہمارے نزدیک یہ بات صحت کو نہیں پہنچی کہ امام ابوحنیفہؒ قرآن کو مخلوق کہتے تھے۔ اس پر میں نے کہا کہ ایسا ہے تو خدا کا بڑا شکر ہے۔ وہ (امام ابوحنیفہؒ) علم کے بھی بڑے مرتبہ پر فائز تھے، امام احمدؒ نے فرمایا سبحان اللہ! کیا کہنا، وہ تو علم وورع، زہد وایثار دار آخرت، کے اعتبار سے ایسے مقام پر تھے، جس کو دوسرا کوئی نہیں پہنچ سکتا، ان کو کوڑوں سے مارا گیا تا کہ خلیفہ ابوجعفر منصور کی طرف سے پیش کی ہوئی قضا کو قبول کرلیں مگر انھوں نے اس کو رد کردیا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اور رضوان ان کو حاصل ہوں (ذب ص۶۰/۲)

علامہ سندیؒ نے یہ بھی لکھا کہ یوں تو امام بخاری کی کتاب الایمان کے طور وطریق کے ظاہر سے متاثر ہوکر ان کو بھی بعض لوگوں نے اہل اعتزال میں شمار کردیا ہے، حالانکہ وہ ان سے اور ان کے مسلک سے قطعاً بری و بعید تھے، اور ایمان وغیرہ کسی مسئلہ میں بھی معتزلہ کے ہمنوا وہم عقیدہ نہیں تھے۔

اسی طرح ہم اہل سنت والجماعت کی تعداد کثیر کے سردار وامام ابوحنیفہؒ کے بارے میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ ان کے کسی کلام سے اگر کسی نے غلط فہمی کی وجہ سے، بلا تحقیق کے کوئی بات منسوب کردی ہے، مثلاً ارجاء وغیرہ، تو امام صاحب بھی یقیناً امام بخاری کی طرح بری ہیں۔

حنفی و حنبلی مسالک کا تقارب

آگے بڑھنے سے قبل ہم چاہتے ہیں کہ ناظرین انوار الباری کے ذہنوں میں یہ بات تازہ کردیں کہ جیسا اوپر بھی اشارہ ہوا حنفی مسلک امام احمدؒ کے مسلک سے قریب تر ہے، اور رد بدعت وشرک کے بارے میں تو شافعی و مالکی مسالک کے اعتبار سے بھی زیادہ موافقت ومرافقت حنبلی مذہب کے لئے حنفی مسلک کو حاصل ہے، اور حنبلی مسلک کے بعد مالکی ہم سے زیادہ قریب ہیں، پھر شافعی کہ وہ فروع میں کچھ زیادہ ہم سے الگ ہوئے ہیں، لیکن اصول وعقائد کے باب میں چاروں مسالک متحد ومتفق ہیں، اور اس وقت جو علماء نجد نے باوجود حنبلی المسلک ہونے کے علامہ ابن تیمیہؒ کے تفردات اصول وفروع کو اختیار کر کے امام احمدؒ کے مسلک اور ارشادات سے اعتراض کی صورت اختیار کرلی ہے وہ نہ صرف ہمارے لئے بلکہ پوری دنیائے اسلام کے باحساس اور متیقظ علمائے اسلام وعوام کے لئے سخت تکلیف وتشویش کا موجب بن گئی ہے۔ **ولعل الله يحدث بعد ذلك امرا. و بيده ازمة الامور. عليه نتوكل و اليه نينب. وما توفيقنا الا بالله العلى العظيم. هو حسبنا و نعم الوكيل.**

امام صاحب کی مدت رضاعت پر اعتراض کا جواب

امام بخاریؒ نے جزء القراءت ص۱۹ میں لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نے مدت رضاعت ڈھائی سال قرار دے کر نص قرآنی کا خلاف کیا ہے۔

امام مجتہد ابوبکر جصاص نے اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' میں اس کا جواب یوں دیا کہ لفظ اتمام مانع زیادت نہیں ہے کیونکہ نص قرآنی نے ایک آیت میں **و حمله و فصاله ثلاثون شهرا** بتلایا اور دوسری میں **وفصاله فى عامين** ارشاد کیا، دونوں نے صراحت کردی کہ مدت حمل ۶ ماہ ہے، حالانکہ زیادہ بھی ہوتی ہے اور ۶ ماہ کم سے کم مدت بتلائی ہے، تو جس طرح یہاں ۶ ماہ کی نص قرآنی پر زیادتی جائز ہے۔ اسی طرح مدت رضاعت کی زیادتی بھی ممنوع ہوگی۔

دوسرے یہ کہ یہاں مقصود اجرت رضاعت کا بیان ہے کہ دو سال سے زیادہ پر شوہر کو مجبور نہیں کر سکتے، لیکن وہ خود دونوں زیادتی پر فیصلہ کرلیں تو وہ بھی جائز ہوگی جو آیت فان ارادا فصالا اور دوسری آیت وان اردتم ان تسترضعوا سے ثابت ہوئی لہٰذا مدت رضاعت وہی شرعاً ثابت ہوگی، جس پر زیادہ کی حد تک متفق ہوں، اور وہ ڈھائی سال ہے اس سے زیادہ کسی کے یہاں بھی نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ حق تعالٰے نے فان ارادا فصالا فرمایا، اگر فصال کی مدت دو سال تک محدود ہوتی تو وہ متعین تھی، دو سال کے بعد ان کے ارادہ پر کیوں رکھا جاتا، اور فصال کو نکرہ لائے، الفصال نہیں فرمایا، جس دو سال پر فصال معہود شرعی مراد ہوتا، اس سے بھی ظاہر ہوا کہ دو سال رضاع کی مدت مقررہ شرعیہ نہیں ہے۔ اس سے آگے ڈھائی سال تک جا کر شرعی مدت ختم ہوگی۔

امت پر تلوار کا اعتراض و جواب

امام بخاریؒ نے فرمایا کہ امام ابوحنیفہ امت میں قتل و قتال اور خون ریزی کرانے کا قائل تھے۔ جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا مسلک یہ ضرور تھا کہ اہل حق کو اہل باطل کے خلاف تلوار ضرور اٹھانی چاہیئے تا کہ باطل پر جمود کرنے والے حق کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہوں، علامہ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں لکھا کہ "امام صاحب کا مذہب ظالموں اور ائمہ جور سے قتال کرنے کا مشہور تھا"۔

اسی لئے امام اوزاعی نے کہا کہ ہم کو امام ابوحنیفہ نے ہر بات پر آمادہ کر لیا تھا، تا آنکہ وہ تلوار تک بھی آ گئے، یعنی ظالم حاکموں سے قتال کے لئے حکم دیا تو ہم اس کا تحمل نہ کر سکے۔ وہ فرماتے تھے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اولاً زبان سے فرض ہے، پھر اگر وہ لوگ نہ مانیں تو تلوار سے ان کو درست کیا جائے، جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے مروی ہے۔

امام صاحب نے جو معاملہ حضرت زید بن علیؓ کے ساتھ کیا وہ بھی مشہور ہے کہ ان کی خفیہ طور سے نصرت کی اور ان کی مالی امداد بھی کی، اور ایسے ہی حضرت عبداللہ بن حسن کے صاحبزادے حضرت محمد و ابراہیمؓ کی بھی نصرت کی تھی۔

ابواسحٰق فرازی کا بیان ہے کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے کہا آپ نے میرے بھائی کو ابراہیم کے ساتھ نکلنے کا مشورہ کیوں دیا کہ وہ قتل کیا گیا؟! امام صاحب نے فرمایا کہ تمہارے بھائی کا ان کے ساتھ نکلنا تمہارے نکلنے سے مجھے زیادہ محبوب ہے۔ کیونکہ یہ ابواسحٰق قتال ظلمہ سے بچنے کے لئے بصرہ چلے گئے تھے۔

اس کے سوا بھی امام صاحب کی تلقین قتال ظلمہ و اہل جور کے واقعات نقل کر کے آخر میں لکھا کہ در حقیقت اس دور میں امام صاحب کے خلاف "یری السیف علی الامۃ" کا اعتراض ان بھولے بھالے غیر سیاسی شعور والے اہل حدیث نے چلایا تھا، جنھوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی معاملات پر ظالموں نے غلبہ حاصل کر لیا۔ کیونکہ ان کی مقاومت و مقابلہ مفقود ہو گیا تھا۔ (۔۔۔ص ۱/۸۱)

(۱) ادراک رکوع سے رکعت نہ ملے گی:۔ امام بخاریؒ نے ص ۱۹ میں لکھا کہ ایسے لوگ جو مدت رضاعت کا تعین نص قرآنی کے خلاف کرتے ہیں اور خنزیر بری کو حلال کہتے ہیں اور امت مسلمہ کے درمیان قتل و قتال اور خوں ریزی کو محبوب رکھتے ہیں اور خلق قرآن کے قائل ہیں اور ان سب چیزوں کو اجماعی و اتفاقی مسائل بتلاتے ہیں، اور اپنے مقابلہ میں قول رسول اللہ ﷺ پر اعتماد کر کے قراءت فاتحہ کو ضروری و فرض قرار دینے والوں کو غلطی پر بتلاتے ہیں کیا واقعی ایسے لوگوں کی باتوں پر اعتماد کرنا صحیح ہو سکتا ہے، خاص طور سے جبکہ وہ لوگ مسلمانوں کی عزت و جان و مال وغیرہ کے ضائع کرنے کو بھی مباح جانتے ہیں؟! اور یہ لوگ اس مسئلہ کو بھی اجماعی و اتفاقی بتاتے ہیں کہ بغیر قراءت کے امام کے ساتھ رکوع میں شامل ہونے سے وہ رکعت مل جاتی ہے، اور جو یہ کہتا ہے کہ رکوع کا اعتبار جب ہی ہے کہ قراءت کے بعد امام کے رکوع میں شریک ہو،

ورنہ وہ رکوع رکعت نہ بنائے گا تو اس کو کہتے ہیں کہ وہ اہل نظر میں سے نہیں ہے، حالانکہ حضرت ابو ہریرہ اور ابو سعید بتلاتے ہیں کہ کوئی رکوع نہ کرے جب تک فاتحہ نہ پڑھ لے، اور سب اہل صلوٰۃ کا سارے اسلامی شہروں میں بسنے والوں کا اجماعی فیصلہ ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی، اور قرآن مجید میں بھی صراحت ہے کہ جتنا آسان ہو وہ ضرور پڑھو، ہر منصف کا فرض ہے کہ وہ انصاف سے فیصلہ کرے کہ اٹکل سے باتیں کرنے والے جو اپنے کو اہل علم سمجھتے ہیں، صحیح راستے پر ہیں، یا یہ جو قرآن وحدیث اور سارے مسلمانوں کے نزدیک تسلیم شدہ حقیقت پر عامل ہیں؟!

(۲) خطبہ کے وقت نماز کا جواز:۔ اس کے بعد امام بخاری نے ص۱۹ میں ہی لکھا کہ وہ کہتے ہیں کہ آیتِ قرآن مجید **"فاستمعوا له** کی وجہ سے امام کے پیچھے قرأۃ جائز نہیں، پھر یہ سکتات امام کی بھی نفی کرتے ہیں، تو ان سے ہم کہیں گے کہ حضرت ابن عباس وسعید بن جبیر سے تو یہ نقل ہوا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے جبکہ جمعہ کے دن امام خطبہ دے رہا ہو، دوسری طرف حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی ہے کہ کوئی نماز بغیر قرأۃ کے صحیح نہ ہوگی، پھر یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام نے خطبہ کی حالت میں کلام کرنے سے بھی روک دیا اور فرمایا کہ امام کے خطبہ کی حالت میں تم اگر دوسرے کو یہ بھی کہو گے کہ چپ رہو تو یہ بھی لغو ہوگا لیکن ان سب کے باوجود حضور علیہ السلام نے خطبہ کی حالت میں مسجد آنے والے کو دو رکعت پڑھنے کا بھی حکم فرمایا ہے۔ جب ایسا ہی ہے تو ہم بھی قرأۃ خلف الامام کو نہیں روک سکتے۔ اور حضور علیہ السلام نے اپنے عمل سے بھی بتلا دیا کہ خطبہ کی حالت میں نماز جائز ہے کیونکہ سلیک غطفانی کو دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا تھا۔

(۳) احادیث اتمام سے وجوب قرأۃ خلف الامام کا ثبوت

امام بخاریؒ نے ص۲۰ میں لکھا کہ متعدد اہل علم کا قول ہے کہ ہر مقتدی اپنے فرائض ادا کرے گا، اور قیام، قرأۃ، رکوع وسجود سب فرض ہیں اسی لئے ان کے نزدیک بھی رکوع وسجود مقتدی سے کسی حال میں ساقط نہ ہوگا لہٰذا قرأۃ کا بھی یہی حکم ہونا چاہئے کہ وہ کسی حال میں بھی مقتدی سے ساقط نہ ہو الا یہ کہ کتاب وسنت ہی سے اس کا ساقط ہونا ثابت ہو، اور حدیثِ نبوی سے یہ ثابت ہوا کہ جب تم نماز کو پہنچو تو جتنی امام کے ساتھ پالو وہ پڑھ لو اور جو رہ جائے اس کو خود پورا کر لو۔ لہٰذا جب کسی سے قرأۃ یا قیام کا فرض رہ جائے تو اس کو بھی خود پورا کرے گا، جیسا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

اسکے بعد امام بخاری نے ص۲۳ تک احادیث وآثار ذکر کئے ہیں، جن میں سے کسی میں یہ ہے کہ جو امام کے ساتھ رہ گیا اس کو پورا کرے اور کسی میں ہے کہ جو رہ گیا اسے بعد کو ادا کرلے۔

امام بخاری ان آثار سے اپنا خاص مسلک یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی رکوع میں ملا تو اس کی رکعت نہیں ہوئی، کیونکہ اس سے قیام وقرأت رہ گئی، لہٰذا اس رکعت کے لئے قیام وقرأۃ بعد کو کرے گا، تب رکعات پوری ہوں گی، اس کے لئے انہوں نے کئی جگہ حضرت ابو ہریرہؓ کو بھی ہمنوا ثابت کیا ہے، حالانکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ رکوع امام سے قبل اس کے قیام میں ملنے سے رکعت ملے گی خواہ قرأۃ نہ بھی کر سکے۔ ان کے سوا سب کے نزدیک بالاتفاق بغیر قیام کے شمول کے بھی صرف رکوع میں شامل ہونے سے رکعت مل جاتی ہے۔

(۴) من ادرک رکعۃ سے استدلال بخاری

ص۲۴ میں امام بخاریؒ نے حدیثِ ابی ہریرہ **من ادرک رکعۃ من الصلوٰۃ فقد ادرک الصلوٰۃ** سے استدلال کیا اور اس کو مختلف طرق ومتون کے ساتھ نقل کیا اور اس ضمن میں دوسری چیزیں بھی ثابت کیں مثلاً یہ کہ حضرت ابو ہریرہ کی مراد رکعت سے رکوع نہ تھی، اور جس روایت میں ایسا کوئی جملہ نقل ہوا ہے وہ بے وجہ وبے معنی ہے، یہ بھی لکھا کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کی بہت سی روایات اس لئے نقل کی ہیں کہ بقول خلیل بار بار اور زیادہ کلام سے بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے، اور کسی بات کی اگر غرض وغایت بھی بیان کردی جائے تو وہ

بات خوب یاد رہتی ہے، پھر یہ کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد تو رکعت کے لئے ہے رکوع کے لئے نہیں ہے۔ نہ آپ نے رکوع، سجود و تشہد کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ جس نے ان کو پالیا اس نے رکعت پالی، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے نبی کی زبان سے نماز خوف کی ایک رکعت فرض کی ہے، اور حضور علیہ السلام نے کچھ لوگوں کو نماز خوف کی ایک رکعت پڑھائی، پھر دوسروں کو دوسری رکعت پڑھائی پس جو شخص امام کے ساتھ نماز خوف کے صرف رکوع و سجود کو پائے گا اور وہ رکعت ہوگی تو اس نے اپنی نماز میں پوری طرح قیام نہیں کیا اور نہ اس نے قرأۃ کا کچھ حصہ پایا، حالانکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد تو یہ ہے کہ جس نماز میں فاتحہ نہ پڑھی جائے وہ ''خِداج'' ہے۔ اور آپ نے کسی ایک نماز کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں فرمایا۔ اور ابوعبید نے کہا کہ "اخرجت الناقة" کہا جاتا ہے جبکہ وہ اونٹنی بچہ ڈال دے، اور ڈالا ہوا بچہ مردہ کسی کام کا نہیں۔ (یعنی اسی) طرح بغیر فاتحہ کے نماز باطل و بے سود ہوگی (جیسا کہ اس زمانہ کے غیر مقلدین بھی امام بخاری کی زبان میں باطل وکالعدم کہتے ہیں)۔

آگے لکھا کہ وتر میں بھی ایک ہی رکعت ہے، جیسا کہ اہل مدینہ کے فعل سے ثابت ہے، لہٰذا جس کو وتر کی رکعت کا قیام وقرأۃ نہ ملے گی اس کی نماز بھی بلا قرأۃ کے ہوگی اور وہ بھی حضور علیہ السلام کے ارشاد ''لاصلوٰة الا بفاتحة الكتاب'' کی وجہ سے صحیح نہ ہوگی۔ الخ تا ص ۲۸ آگے نمبر وار جواب ملاحظہ ہوں:۔

(۱) ادراک رکوع سے ادراکِ رکعت کا مسئلہ اور امام بخاری کا جواب

تمام حضرات صحابہ و تابعین، ائمہ اربعہ مجتہدین اور جمہور محدثین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ امام کے ساتھ رکوع ملنے سے وہ رکعت مل جاتی ہے لیکن امام بخاریؒ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہئے، لہٰذا سارے رسالے قرأت خلف الامام میں جگہ جگہ اس کی چکی پیسی ہے، اور طرح طرح سے نقلی و عقلی استدلال کر کے اپنی بات منوانے کی سعی کی ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی مرویہ احادیث من ادرک رکعة سے بھی استدلال کیا، اور ایک روایت ان سے ص ۳۰ میں قبل باب القراءة فی الاربع کلها یہ بھی لائے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا جب تم قوم کو رکوع میں پاؤ تو تمہاری یہ رکعت محسوب نہ ہوگی، لیکن یہ روایت قابل استدلال نہیں، اولاً:۔ اس روایت میں ایک راوی معقل بن مالک ہیں، جس کو علامہ ابوالفتح ازدیؒ نے متروک قرار دیا (میزان ص ۳/۱۸۵ و تہذیب ص ۱/۲۳۴) ثانیاً:۔ اس کی سند میں محمد بن اسحٰق ہے، جس پر علماء رجال نے سخت نقد و جرح کی ہے۔ اور حدیثِ عبادہ بھی اسی راوی ضعیف کی وجہ سے گری ہے۔

جس کی بحث بہت مشہور ہے اور خود امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس کی حدیث لا کر استدلال نہیں کیا، حالانکہ جیسا طویل و عریض دعویٰ امام بخاری نے خاص طور سے جہری نماز کے لئے بھی وجوب قرأۃ خلف الامام کا کیا ہے، اس دعوے کے ثبوت میں امام بخاری کو یہ حدیث ضرور لانی تھی، مگر انہوں نے صحیح کا معیار قائم رکھا کہ ایسے ضعیف راویوں سے احادیث نہیں لائے، یہ امام بخاریؒ کی بہت ہی بڑی منقبت و مزیت ہے، اگرچہ ان جیسے امام المحدثین اور عظیم و جلیل شخصیت سے صحیح بخاری سے باہر بھی دوسرے رسالوں میں گری پڑی اور ضعیف و ساقط روایات سے اپنی الگ مجتہدانہ رائے ثابت کرنا اور امام اعظم و اکابر حنفیہ پر تعریضات کرنا اور غلط باتیں بھی بے سندِ صحیح وقوی ان کی طرف منسوب کر دینا کسی طرح بھی ان کے شایانِ شان نہ تھا۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا معمول تھا کہ غیر حنفی اکابر پر بھی نقل مذہب حنفی میں اعتماد فرما لیتے تھے، اب اگر کوئی شخص امام بخاریؒ کی عظیم و جلیل شخصیت پر اعتماد کر کے یہ باور کرے کہ واقعی امامِ اعظم ابوحنیفہؒ نے خنزیر بری کے لئے لا باس به کہہ دیا ہوگا، جیسا کہ امام بخاری نے بلا تحقیق اس کو اپنے رسالہ جزء القرأۃ میں نقل کر دیا، تو اس کا کتنا بڑا ضرر امتِ مسلمہ کو پہنچ سکتا ہے جبکہ اس بات کو ایک معتزلی عقیدہ والے

چھوٹے مفتری نے امام اعظم کو بدنام ورسوا کرنے کے لئے گھڑا تھا۔

ثالثاً: محمد بن اسحق مدلس ہیں اور مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا، یہاں امام بخاری کی پیش کردہ روایت میں ان سے عنعنہ بھی موجود ہے۔

رابعاً: یہ روایت حضرت ابو ہریرہؓ پر موقوف ہے، اور موقوف صحابی جب کسی مرفوع حدیث کے خلاف ہو تو وہ بھی نا قابلِ عمل ہوتی ہے۔

حدیث ابی بکرہ بخاری

اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکرہؓ کی مرفوع روایت خود صحیح بخاری کی موجود ہے، جس کو دوسرے محدثین نے بھی روایت کیا ہے اور بخاری میں اسی زیرِ بحث باب سے دو ورق بعد ص ۱۰۸ میں حدیث نمبر ۷۴۲ حضرت ابو بکرہ ہی کی ہے، اور خود امام بخاری نے اس کا باب اذا رکع دون الصف باندھا ہے۔ یعنی کوئی صف تک پہنچنے سے پہلے ہی رکوع کر کے جماعت میں شامل ہو تو اس کا کیا حکم ہے۔

اس میں ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ مسجد نبوی میں پہنچے، حضور علیہ السلام رکوع میں جا چکے تھے (حضرت ابو بکرہؓ نے سوچا ہوگا کہ صف تک پہنچنے میں حضور رکوع سے سر مبارک اٹھالیں گے لہٰذا) صف سے پہلے ہی رکوع کر لیا، حضور علیہ السلام نے نماز کے بعد ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ایسی نیکی پر حریص کرے۔ مگر پھر ایسا نہ کرنا۔ (کیونکہ نماز کا ادب یہی ہے کہ اطمینان سے صف تک پہنچ کر امام کے ساتھ جس حالت میں بھی وہ ہو اس کے ساتھ شامل ہو جائے)۔

ظاہر ہے کہ حضرت ابو بکرہؓ بغیر سورۂ فاتحہ پڑھے، رکوع میں شامل ہوئے تھے اور ان کے رکوع کو رکعت کے لئے صحیح مان لیا گیا، اگر وہ صحیح نہ ہوتا اور امام بخاری کی بات درست ہوتی تو حضور علیہ السلام حضرت ابو بکرہ سے اس رکعت کا اعادہ کراتے۔

اس حدیث میں جو حضور علیہ السلام نے آخری کلمہ لا تعد ہے، (کہ پھر ایسا نہ کرنا کہ نماز جماعت کے لئے تاخیر سے آؤ، اور صف سے پہلے ہی رکوع کر لو) یہ کلمہ لا تعد بھی نقل ہوا ہے جیسا کہ امام نووی اور حافظ ابن حجر نے ذکر کیا (حاشیہ مشکوٰۃ نووی وفتح الباری ص ۱\۲۱۴) اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز صحیح ہو گئی، اعادہ کی ضرورت نہیں۔ تیسری روایت لا تعدی کی ہے کہ نماز کے لئے دوڑ کر نہ آیا کرو۔

اکابر صحابہ کا مسلک

امام بیہقی نے لکھا کہ حضرت ابن عمرؓ حضرت ابن مسعودؓ حضرت ابو بکرؓ، حضرت زید بن ثابتؓ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ وغیرہ بڑی محنت ومشقت سے رکوع ملنے کی کوشش کیا کرتے تھے، یہ بھی اس کی واضح دلیل ہے کہ رکوع میں شامل ہونے سے رکعت مل جاتی ہے۔

دوسری مرفوع حدیث

امام بیہقی نے ایک مرفوع روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ہی یہ نقل کی ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے رکعت پالی۔ (سنن کبری ص ۲\۹۰) نیز اسی مضمون کی ایک اور حدیثِ مرفوع بھی امام موصوف نے نقل کی ہے اور حضرت ابنِ مسعودؓ اور ان کے اصحاب کا بھی اسی پر عمل تھا (الادب المفرد ص ۱۵۳)

مذکورہ بالا حدیثِ ابی بکرہؓ سے ثابت ہوا کہ مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ کی قرأۃ واجب وضروری نہیں ہے، اور اسی حدیث سے جمہور اہلِ اسلام اور ائمۂ اربعہ نے مدرکِ رکوع کے مدرکِ رکعت ہونے پر استدلال واحتجاج کیا ہے۔

ابن حزم کی تائید

علامہ ابن حزم نے ایک موقع پر حضرت ابو بکرہ کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ یہ فعل اور عمل آں ﷺ کا

آخری عمل ہے، کیونکہ اس میں ابوبکرہ موجود تھے، اور وہ فتح مکہ اور حنین کے بعد طائف کے دن مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ (محلی ص۲۲۷\۴)

دوسرا استدلال حضور علیہ السلام کے مرضِ وفات والی حدیث سے بھی بہت قوی ہے کہ وہ بھی حضور علیہ السلام کا آخری عمل تھا، جس میں آپ حجرۂ مبارک سے مسجد نبوی میں تشریف لائے اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے، وہ پیچھے ہٹ آئے اور حضور علیہ السلام نے وہیں سے قرائۃ شروع فرمادی جہاں تک حضرت ابوبکر پڑھ چکے تھے۔ (ابن ماجہ ص۸۸)

اور مسندِ احمد ص۲۰۹\۱ میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے سورت کے اسی مقام سے قرائۃ شروع کی جس تک حضرت ابوبکر پڑھ چکے تھے۔
سنن کبری ص۳/۸۱ میں ہے کہ آپ نے قرآن مجید کے اس حصہ سے قرائۃ شروع کی جس تک حضرت ابوبکرؓ قرائۃ کر چکے تھے۔

حافظ ابن حجر نے لکھا کہ مسندِ احمد وابن ماجہ کی سند قوی ہے (فتح ص۶۲۹\۵) ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ فاتحہ پوری پڑھ چکے تھے اور آگے سورت پڑھ رہے تھے کہ حضور تشریف لے آئے، اور بالفرض اگر تھوڑی ہی فاتحہ پڑھ چکے تھے، تب بھی جن کے نزدیک پوری فاتحہ کے بغیر رکعت نہیں ہوتی، حضور علیہ السلام سے پوری فاتحہ یا کچھ رہ گئی، تو وہ اس نماز کے لئے کیا کہیں گے؟ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ حضور علیہ السلام کی نماز بھی خدانہ کردہ کالعدم اور باطل ہوگئی تھی، لہٰذا ان کو بھی مان لینا چاہئے کہ امام کے پیچھے قرائۃِ فاتحہ ضروری یا واجب نہیں ہے۔ پھر متبعینِ امام بخاری کو تو اوپر کی دونوں حدیثوں کی وجہ سے فاتحہ خلف الامام کے وجوب سے رجوع کرلینا ہی چاہئے، کیونکہ امام بخاری صحیح بخاری کے **باب انما جعل الامام لیؤتم به** کے آخر میں ص۹۶ پر فرما چکے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے الآخر فالآخر فعل پر ہی عمل کرنا چاہئے۔

غرض جمہور سلف وخلف کا مسلک جس طرح احادیث نبویہ اور آثارِ صحابہ وتابعین سے ثابت ہوا، حضور علیہ السلام کے آخری فعل وعمل سے بھی مؤید ہوگیا۔ (احسن الکلام ص۱۵۲)

امام بخاری کے دوسرے دلائل

امام ہمام نے کئی جگہ حضرت ابوہریرہؓ کے موقوف آثار اس بارے میں بھی پیش کئے ہیں کہ ان کے نزدیک رکوع جب ہی رکعت بنائے گا جبکہ امام کے ساتھ رکوع سے قبل قیام کے اندر ہی مل جائے، لیکن ان کی سند میں بھی محمد بن اسحٰق ہے اور عنعنہ بھی ہے، دوسرے یہ کہ خود حضرت ابوہریرہؓ ہی سنن بیہقی ص۹۰\۲ میں حدیث مرفوع کے راوی ہیں کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے وہ رکعت پالی، تو وہ اپنی روایت کردہ حدیثِ مرفوع کے خلاف کیوں کرتے اور قیام میں ملنے کی قید اپنی طرف سے بڑھادیتے، یہ بات بہت مستبعد ہے، البتہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے رکوع پانے کے لئے قیام کی حالت میں ملنے کی قید کو بطور احتیاط کے فرمادیا ہو، پھر یہ کہ امام بخاری کا مقصد تو ان کی قیدِ مذکور سے بھی حاصل نہیں ہوتا کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ سے کوئی قول ایسا کہیں مروی نہیں ہوا کہ رکوع سے پہلے مقتدی امام کے ساتھ اتنا پہلے مل جائے کہ فاتحہ بھی پڑھ لے۔ اور جب یہ نہیں تو بار بار ان کی روایت لانے سے کیا فائدہ ہوا؟ علامہ خلیل نے یہ کب کہا تھا کہ آدھی بات کو بار بار دہراتے رہو تو اس سے تمہارے دل کی ساری بات کسی کے دل میں اتر جائے گی، بغیر اس کے کہ اس پوری کا ثبوت خارج میں موجود ہو۔

امام بخاریؒ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کا قول بھی اپنی تائید میں پیش کیا کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے سے پہلے کسی کو رکوع نہیں کرنا چاہئے، مگر اس سے بھی امام کو کچھ فائدہ نہ ہوا، کیونکہ اس میں راوی متکلم فیہ ہیں، اور یہ بھی موقوف اثر ہے، پھر اس میں مقتدی وامام کا کچھ ذکر نہیں، اور اس سے کس کو انکار ہے کہ منفرد پر تو بہرحال یہ لازم ہے کہ وہ پہلے سورۂ فاتحہ پڑھے اس کے بعد رکوع کرے۔

امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ میں حضرت مجاہد کا بھی ایک موقوف اثر پیش کیا کہ کوئی شخص سورۂ فاتحہ پڑھنا بھول جائے تو اس رکعت کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، مگر اس روایت میں لیث ہے جو ضعیف ہے۔ (دارقطنی ص۱۲۶\۱)

الغرض کتب حدیث میں کوئی صحیح صریح مرفوع روایت ایسی موجود نہیں ہے، جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ رکوع میں امام کے ساتھ شامل ہونے والے کی وہ رکعت قابلِ اعتبار نہیں ہے، اور اس کے برخلاف صحیح مرفوع احادیث سے اور جمہور سلف وخلف کے متفقہ فیصلہ سے بھی مدرک رکوع کا مدرکِ رکعت ہونا ثابت ومحقق ہے اور اس طرح بغیر فاتحہ کے رکعت درست ہوگئی، لہٰذا امام کے پیچھے اور جہری نماز میں وجوبِ قرائۃ کا قول اور یہ دعوٰے بھی کہ وہ رکعت نہیں شمار ہوگی، جس میں قرائۃ فاتحہ نہیں ہو سکی، قابلِ قبول نہیں ہے۔ (احسن الکلام ص۳۴\۲)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فصل الخطاب ص۸۲ میں مستقل فصل قائم کر کے لکھا کہ صحابۂ کرام میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو یہ کہتا ہو کہ مدرکِ رکوع بلا قرائۃ کے مدرکِ رکعت نہ ہوگا، آپ نے فتح الباری اور زرقانی شرح موطأ وغیرہ سے بھی اپنی تائید میں اقوال پیش کئے، پھر لکھا کہ یہ گویا سب کے نزدیک بطور بدیہی حکم شریعت کے معلوم تھا کہ ادراک رکوع سے ادراکِ رکعت ہوتا ہے اور جب سارے صحابہؓ دیکھتے تھے کہ رکوع تک امام کے ساتھ مل جانے میں رکعت مل جاتی ہے، تو ان کو اس بارے میں بھی کوئی تردد نہیں تھا کہ مقتدی پر قرائۃِ فاتحہ واجب نہیں ہے، اور اس میں تردد وہی کر سکتا ہے جو ایک بداہت اور کھلی ہوئی حقیقت کو لغو قرار دے، اور صرف الفاظ کو پکڑ کر بیٹھ جائے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس موقع پر صلوٰۃِ خوف کو پیش کرنا بھی مفید نہیں (جیسا کہ امام بخاری نے کیا، کیونکہ اس کی صورت سب نمازوں سے الگ ہے، کہ تحریمہ میں سب شریک باوجود آگے پیچھے آنے کے، رکعات وسجدات میں تقسیم ہوگئی، لیکن رکوع میں تعاقب واقع نہیں ہوا، کیونکہ اس سے رکعت رکعت بنتی ہے اور جس نے رکعت پالی اس نے امام کے ساتھ جماعت کو پالیا، یہاں بھی سارا معاملہ عدم وجوب قرائۃ خلف الامام پر ہی مبنی قرار پائے گا۔ لہٰذا اپنے بے سود زبانی احتمالات کو ترک کر دو جن کو تمہارا دل بھی اندر سے تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہم بے کار و بے مقصد باتوں میں الجھنے کے لئے فارغ نہیں بیٹھے ہیں۔

نماز بوقت خطبہ کی بحث

امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد میں پہنچے اور خطبہ شروع ہو چکا ہو تو کوئی نماز نہ پڑھے، بلکہ خاموش بیٹھ کر خطبہ سنے، امام کی آوازِ خطبہ نہ آ رہی ہو تب بھی خاموش بیٹھا رہے امام شافعی واحمد کہتے ہیں کہ اس حالت میں بھی تحیۃ المسجد پڑھے، امام صاحب اور امام مالک کے ساتھ جمہور صحابہ وتابعین بھی ہیں، اور حضرت عمر، حضرت عثمان وحضرت علیؓ سے بھی ایسا ہی مروی ہے اور لیث وثوری سے بھی (کمافی النووی شرح مسلم ص۲۸۷\۱) ابن قدامہؒ نے "المغنی" ص۱۶۵\۱ میں حضرت شریح، ابن سیرین، نخعی اور قتادہ سے بھی یہی نقل کیا ہے، محدث ابن ابی شیبہ نے حضرت علی، ابن عمر وابن عباس، ابن المسیب، مجاہد، عطاء اور عروہ سے بھی امام صاحب وامام مالک کے موافق نقل کیا ہے۔ (شرح التقریب ص۱۸۳\۳)

حضرت قاضی عیاضؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے نقل کیا کہ وہ بھی بوقتِ خطبہ نماز پڑھنے سے منع فرماتے تھے (معارف السنن ص۳۶۷\۴)
پھر علامہ بنوریؒ نے لکھا: ۔ جب کہ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ وتابعین وفقہائے بلاد کا وہی مذہب ہے جو امام ابوحنیفہؒ کا ہے تو پھر اس میں کیا شک رہا کہ وہی مذہب تعامل وتوارث کے لحاظ سے سب سے زیادہ قوی ہے، اور وہی سنتِ سلف رہی ہے اور ایسے معرکۃ الآرا مسائل میں تعاملِ سلف ہی سے فیصلہ ہو بھی سکتا ہے نہ کہ اخبارِ آحاد سے۔ پھر یہ کہ تعامل کا استناد بھی اخبارِ قولیہ پر ہوتا ہے جو مقصود پر صراحت کے ساتھ دلالت کرتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں کے دلائل سے زیادہ اقوی ہوتے ہیں جیسا کہ ہم آگے اس کی تفصیل کریں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا تعجب خیز رویہ

علامہ بنوریؒ نے اس موقع پر لکھا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں یہ قول بہت ہی عجیب اور موحش ہے کہ "تم اپنے اہلِ بلد کے تعامل وطریقہ سے دھوکہ نہ کھانا، کیونکہ حدیث صحیح ہے اور اس کا اتباع واجب ہے"۔ اس لئے کہ اہلِ بلد کا اتباع دوسرے اہلِ بلاد نے کیا اور ان سب کو خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ وتابعین کے تعامل کو اپنے لئے اسوہ بنانا ہی چاہئے، اور وہی فقیہ الملت امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اور عالمِ مدینہ طیبہ امام مالکؒ نے بھی علی وجہ البصیرت تعامل وتوارثِ اہلِ بلد کی روشنی میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

علامہ بنوری نے مزید لکھا کہ باوجود جلالتِ قدر حضرت شاہ ولی اللہؒ کے ان کی تالیفات میں ایسی آراء وافکار ملتے ہیں جن کے ساتھ موافقت وہمنوائی کرنا مشکل ودشوار ہے۔

دو بڑوں کا فرق: مولانا بنوریؒ نے جو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے بعض افکار سے ناموافقت کی جانب اشارہ کیا ہے اور فیض الباری نیز معارف السنن میں کئی جگہ اس اجمال کی تفصیل بھی ملے گی، اسی لئے راقم الحروف نے بھی پہلے عرض کیا تھا کہ مکتبِ دیوبند کے ذہنی وفکری امام بکل معنی الکلمہ حضرت شاہ ولی اللہ نہیں بلکہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ ہیں کیونکہ حضرت شاہ صاحبؒ علامہ کردی شافعیؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ کے نظریات سے متاثر ہوگئے تھے، اور ان کے یہاں کچھ شطحیات وتفردات بھی ملتے ہیں۔ اور محترم مولانا محمد عبدالحلیم چشتی دام فیضہم نے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے رسالہ عجالۂ نافعہ پر جو فوائد جامعہ لکھے ہیں وہ نہایت مفید علمی تحقیقاتی سرمایہ ہیں۔ اس میں آپ نے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے حالات بھی ۴۴ صفحات میں بڑی عمدہ تحقیق سے تحریر کئے ہیں۔ اس کا ایک نمونہ برائے ملاحظہ پیش ہے۔

ص ۲۶ پر انہوں نے لکھا: ۔ شیخ علی متقیؒ کی مذکورہ بالا ہدایات اور شیخ موصوف کی تصریحات پر غور کیا جائے تو شیخ عبدالحقؒ اور شاہ ولی اللہؒ کے طریقِ کار، اندازِ فکر اور طرزِ تالیف میں جو بنیادی فرق ہے وہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتا ہے، بالفاظِ دیگر وہ باتیں حسب ذیل ہیں: ۔

(۱) شیخ محدث دہلوی کو تصوف کی زبان میں گفتگو کی اجازت نہیں اور شاہ ولی اللہ پر اس باب میں کوئی قدغن نہیں۔

(۲) شیخ عبدالحقؒ جمہور امت کے مسلک سے سرِ مو انحراف نہیں رکھتے، شاہ ولی اللہؒ اپنے افکار میں کہیں کہیں منفرد بھی نظر آتے ہیں۔

(۳) شیخ موصوف وسعتِ نظر میں فائق ہیں تو شاہ ولی اللہ دقتِ نظر میں ممتاز ہیں۔

(۴) شیخ عبدالحقؒ محقق ہیں، اور شاہ ولی اللہ مفکر ہیں، شاہ صاحب موصوف کی نظر ہمہ گیر اور افکار کا دائرہ نہایت وسیع ہے بایں ہمہ فضل وکمال شاہ ولی اللہؒ نے طبقاتِ کتبِ حدیث کی بحث میں بالغ نظری کا ثبوت نہیں دیا، ان کا دائرۂ فکر اس باب میں محدود ہوگیا ہے، کیونکہ وہ طبقاتِ کتبِ حدیث کی بحث میں شیخ ابن الصلاح جیسے خوش عقیدہ تنگ نظر، متعصب مقلد کے تابع نظر آتے ہیں، کیونکہ دونوں نے رجالِ سند اور اصولِ نقد کو نظر انداز کر کے مدارِ صحت کتابوں کو قرار دیا ہے، اور تعارض کے وقت ان ہی کتابوں کی حدیثوں کو قابلِ ترجیح ٹھہرایا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی شانِ تحقیق

یہ بات متقدمین ومتاخرین محدثین کے مسلک ہی کے خلاف نہیں بلکہ مسلمہ اصولِ روایت ودرایت کے بھی خلاف ہے۔ اس کے برعکس شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی روش اس باب میں مقلدانہ نہیں، محققانہ ہے، کیونکہ انہوں نے محقق ابن ہمام کی طرح مدارِ صحت کتابوں کو قرار نہیں دیا بلکہ صحتِ حدیث کا مدار رجالِ سند اور اصولِ نقد پر رکھا ہے، چنانچہ شیخ موصوف "المنہج القدیم فی شرح الصراط المستقیم" میں فرماتے ہیں: ۔

"ترتیب جو محدثین نے صحتِ احادیث اور صحیح بخاری ومسلم کے مقدم رکھنے میں ملحوظ رکھی ہے، زبردستی کی بات ہے۔ اس میں کسی کی پیروی جائز نہیں، کیونکہ صحیح اور صحیح تر ہونے کا دارومدار راویوں کا ان شروط پر پورا اترنا ہے جن کا بخاری ومسلم نے بھی اعتبار کیا ہے (اور امام اعظم

کے یہاں تو شرطِ روایت میں ان دونوں سے بھی زیادہ سختی تھی جیسا کہ سب جانتے ہیں، اور جب وہی شروط ان دونوں کتابوں کے علاوہ کسی اور حدیث کے راویوں میں بھی پائی جائیں تو پھر ان ہی دو کتابوں کی حدیث کو صحیح تر کہنا زبردستی نہیں اور نا قابلِ قبول بات منوانا نہیں تو کیا ہے؟

اور اس امر میں کوئی شک نہیں کہ بخاری و مسلم کے کسی مخصوص راوی میں ان شروط کے جمع ہو جانے کا حکم کرنے سے اس پر جزم و یقین نہیں کیا جا سکتا کہ یہ حکم واقع اور حقیقت کے مطابق ہی ہے کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ واقع اس کے خلاف ہو۔

لہٰذا ان کے حکمِ صحت پر دلیلِ قطعی کا پایا جانا اور اس پر جزم و یقین کرنا محلِ نظر ہے، یہ بات تحقیق سے معلوم ہے کہ مسلم نے اپنی کتاب میں بہت سے ایسے راویوں سے روایت کی ہے جو جرح و قدح سے نہیں بچ سکے ہیں۔ اور اسی طرح بخاری میں بھی راویوں کی ایک جماعت ایسی ہے جس پر کلام ہوا ہے، پس راویوں کے معاملہ میں مدار کار علماء کے اجتہاد اور ان کے صوابدید پر ہوگا۔ اور اسی طرح شروطِ صحت حسن و ضعف کا حال ہے الخ"۔

پھر آگے لکھتے ہیں: "صحیح حدیثیں صحیح بخاری و مسلم میں منحصر نہیں ہیں، کیونکہ بخاری و مسلم نے ان ساری صحیح حدیثوں کا جو ان کے پاس ان کی شرط کے مطابق تھیں احاطہ نہیں کیا ہے، اور ان میں سے ہر ایک نے تمام صحاح کے احاطہ واستیعاب نہ کرنے کا خود بھی صاف صاف اقرار کیا ہے"۔

اسکے بعد بھی علامہ محقق شیخ محدث دہلویؒ کے افاداتِ قیمہ نقل کئے گئے ہیں جو قابلِ مطالعہ ہیں، ہم ان کو بوجہِ خوفِ طوالت نقل نہیں کر سکے۔

شرح سفر السعادہ کا ذکر

واضح ہو کہ علامہ مجد الدین فیروز آبادی م ۸۱۷ھ (صاحب القاموس) نے ایک کتاب "سفر السعادہ فی تاریخ الرسول قبل نزول الوحی و بعدہ" لکھی تھی جو "صراط مستقیم" کے نام سے بھی مشہور ہے، علامہ موصوف چونکہ ظاہری المشرب تھے، اس لئے انہوں نے اکثر مواقع میں ان حدیثوں کو بیان کرنے سے گریز کیا ہے جس پر مجتہدین امت کا عمل ہے، اور زیادہ تر ایسی احادیث نقل کر دی ہیں جو ائمۂ مجتہدین کے یہاں معمول بہا نہیں ہیں، اور آخر میں احادیث موضوعہ کے عنوان سے ایک باب کا اضافہ کر کے ابنِ جوزی وغیرہ ایسے متشدد محدثین کی طرح صحیح حدیثوں کو بھی موضوع کہہ دیا جس سے عوام کے دلوں میں شبہات پیدا ہونے کا قوی احتمال تھا۔

ان امور کی اہمیت کا احساس فرما کر شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ نے کتابِ مذکور کی شرح لکھی، جس میں مصنف مذکور کے پیدا کردہ تمام شبہات کا ازالہ کر دیا اور احقاقِ حق کا فریضہ کامل تحقیق و تدقیق کے ساتھ ادا فرما دیا۔ چونکہ اصل کتاب کے دو نام تھے اس لئے شیخ موصوف نے بھی اس کی شرح کے دو نام رکھے ایک "المنہج القویم فی شرح الصراط المستقیم"۔ دوسرا "طریق الافادہ فی شرح سفر السعادہ" اور موصوف نے اس کا ایک نہایت محققانہ مبسوط مقدمہ بھی لکھا، جو در حقیقت اس شرح کی جان ہے، اس کے ایک باب میں مصطلحاتِ حدیث بتائیں، اور اربابِ صحاح ستہ کا تذکرہ کیا تحقیق و تنقید کے اصول واضح کئے اور مذہب حنفی پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کی حقیقت واضح کی، نیز اصول مطابقت کو سمجھایا ہے، دوسرے باب میں ائمۂ مجتہدین کا تذکرہ کیا ہے۔

شیخ موصوف نے یہ شرح اور مقدمہ لکھ کر یہ ثابت کر دیا کہ ائمۂ مجتہدین کا مسلک احادیثِ صحیح کے خلاف ہرگز نہیں ہے اور خاص طور سے حنفی مسلک پر احادیث سے بُعد کا الزام واتہام سراسر غلط ہے۔

یہ کتاب سنہ ۱۲ھ میں کلکتہ افضل المطابع سے ٹائپ کے ذریعہ بڑی تقطیع کے ساتھ سات سو بیس صفحات پر چھپی تھی پھر نول کشور لکھنؤ سے تین بار شائع ہوئی۔ مگر افسوس کہ اب نایاب و نادر ہے، اور ہم جیسے ضرورت مند بھی اس کی دید کو ترستے ہیں۔ کیونکہ اب تو غیر مقلدیت پھیلانے والی کتابوں کی اشاعت کا دور دورہ ہے، جس کے لئے بعض سرمایہ دار مسلمان حکومتیں لاکھوں روپے سالانہ صرف کر رہی ہیں۔

اشعۃ اللمعات اور لمعات التنقیح کا ذکر

شیخ محدث دہلوی کا دوسرا حدیثی کارنامہ کہ وہ بھی آب زر سے لکھنے کا مستحق ہے، مشکوۃ شریف کی شرح ''اشعۃ اللمعات'' بزبان فارسی ہے، یہ بھی پہلے کلکتہ سے چار ضخیم جلدوں میں چھپی تھی، پھر بمبئی سے، پھر نول کشور سے آٹھ مرتبہ شائع ہوئی۔ مگر افسوس صد افسوس کہ اب وہ بھی نایاب ہے۔

شیخ موصوف نے مشکوۃ شریف کی دوسری شرح عربی میں ''لمعات التنقیح ''لکھی تھی، یہ شرح اگرچہ حجم میں ملا علی قاریؒ کی مرقاۃ شرح مشکوۃ سے کم ہے مگر افادیت وحسنِ انتخاب میں اس سے بڑھ کر ہے، علامہ قاری کے پاس کتابوں کا ذخیرہ کافی زیادہ تھا مگر انتخاب اتنا بہتر نہ ہوسکا، شیخ محدث دہلوی کے پاس کتابوں کا ذخیرہ زیادہ نہ تھا، مگر جن کتابوں سے جو غرر نقول اخذ کی ہیں وہ ان کے سلیقۂ انتخاب اور حسنِ اختیار کی بہترین مثال ہیں۔ پھر کہنے کو تو یہ مشکوۃ کی شرح ہے۔ لیکن اس شرح نے صحاح ستہ کی شروح سے مستغنی کردیا ہے۔ ہم نے مقدمہ انوارالباری ص۱۸۲\۲ میں بھی اس کتاب کا تعارف کرایا تھا اور خود مولفِ علام کا یہ جملہ مکرر قابلِ ذکر ہے کہ ''اس شرح کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوگی کہ حضرت امام اعظمؒ اپنے مسائل میں احادیث وآثار کا تتبع اس قدر کرتے ہیں کہ ان کو اصحاب الظواہر میں شمار کرنے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے اور ان کے مقابلہ میں امام شافعیؒ کو اصحاب الرائے میں شمار کرنا پڑے گا''۔ اس کا مقدمہ بھی نہایت نافع ہے اور وہ شائع بھی ہوا تھا، مگر شرح مذکور عربی آج تک شائع نہ ہوسکی۔

ہمارے دارالعلوم دیوبند کا سب سے پہلا فرض تھا کہ ایسی اہم کتابوں کو شائع کرتا، جس کا سالانہ بجٹ ۲۵-۲۶ لاکھ سالانہ کا بنتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہاں تو جدید مطبوعات مصر وشام وغیرہ منگانے کا بھی اہتمام نہیں'' والی اللہ المشتکی۔

حدیث وحنفیت اور تقلید ائمہ کا ذکر

جب بات یہاں تک پہنچی تو اتنا اور بھی عرض کردوں کہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے جو حدیث وحنفیت کی نہایت گراں قدر خدمات انجام دی تھیں، ان کے مقابلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی دوسری عظیم القدر علمی خدمات کے ساتھ تقلید وحنفیت کو ضرر بھی پہنچا ہے، آپ نے تو یہاں تک بھی حجۃ اللہ میں لکھ دیا کہ تقلید چوتھی صدی کے بعد کی پیداوار ہے، جس کا جواب نہایت تحقیق وتفصیل سے حضرت المحدث العلام مولانا المفتی سید مہدی حسن صاحب شاہجہانپوریؒ۔ صدر مفتی دارالعلوم دیوبند نے مقدمۂ شرح کتاب الآثار امام محمدؒ ص۴ میں تحریر کیا ہے اور کچھ تاویل کرکے ان کی بات کو سنبھالا بھی دیا ہے، علامہ کوثریؒ نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے علوم وتحقیقاتِ عالیہ کے اعتراف کے ساتھ جو نقد کیا ہے، وہ ہم نے حضرتؒ کے حالات میں نقل کردیا تھا، ملاحظہ ہو مقدمہ انوارالباری ص۱۹۶\۲۔ اور فوائد جامعہ ص ۲۸۶ میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم کے اتحاف النبلاء کے اس جملہ پر نقد بھی قابلِ مطالعہ ہے کہ'' حجۃ اللہ جیسی کتاب بارہ سو سال کے اندر عرب وعجم کے علماء میں سے کسی ایک نے بھی تصنیف نہیں کی ہے'' آپ نے لکھا کہ شاہ صاحبؒ سے بہت عرصہ پہلے حضرت شیخ علی بن احمد المہایمی م ۸۳۵ھ صاحب تفسیر تبصیر الرحمان (مطبوعہ مصر ۲ جلد) نے'' انعام المالک العلام'' علم اسرار شریعت میں لکھی تھی، جس کا ذکر علامہ بنوریؒ نے بھی یتیمۃ البیان مقدمہ مشکلات القرآن میں کیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم.

نماز بوقت خطبہ

بحث یہاں سے چلی تھی، شافعیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ بوقتِ خطبہ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھی جائیں، اور حدیث سلیک سے استدلال کرتے ہیں، حنفیہ ومالکیہ کی طرف سے یہ جواب ہے کہ سلیک کا ایک خاص واقعہ تھا اور اس میں حضور علیہ السلام نے خطبہ جاری بھی نہ رکھا تھا بلکہ ان کی غربت ومسکنت اور ان کا پھٹا پرانا حال لوگوں کو دکھلانے کے لئے ان کو نماز پڑھنے کا حکم دے کر لوگوں سے چندہ جمع کرایا تھا، پھر

دوسرے جمعہ کو بھی ایسا ہی کیا، تیسرے جمعہ کی روایت ضعیف و مشکوک ہے، مگر شافعیہ و حنابلہ کو اصرار ہے کہ قصۂ سلیک کی وجہ سے بوقتِ خطبہ بھی نماز تحیۃ المسجد درست ہے۔ ابنِ ماجہ میں جو حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام نے خطبہ کے لئے منبر پر بیٹھے ہوئے ایک آنے والے شخص سے دریافت کیا کہ کیا تم مسجد میں آنے سے پہلے نماز (سنتِ جمعہ) پڑھ کر آئے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں، تو آپ نے فرمایا کہ دو رکعت پڑھ لو۔ تو اس پر جو ابن تیمیہ ابوالبرکات مجد بن تیمیہؒ نے اپنی کتاب ''منتقی الاخبار'' میں لکھا کہ قبل ان تجیء سے ثابت ہوا کہ جن دو رکعت پڑھنے کا حکم حضور علیہ السلام نے فرمایا وہ سنتِ جمعہ تھیں، تحیۃ المسجد نہ تھیں، مگر حافظ ابن تیمیہؒ نے اپنے جدِ امجد کے خلاف یہ فیصلہ دیا کہ نہیں وہ تحیۃ المسجد ہی تھیں اور ابن ماجہ سے غلطی ہوگئی کہ بجائے قبل ان تجلس کے قبل ان تجیء روایت کر دیا۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری نے جزء القراءۃ (ص ۱۹) میں حضرت جابرؓ کا قول جو نقل کیا ہے کہ ان کو یہ پسند تھا کہ جمعہ کے دن دو رکعت مسجد میں جا کر پڑھا کریں، اس سے بھی سنتِ جمعہ ہی معلوم ہوتی ہیں، نہ کہ تحیۃ المسجد۔ (کیونکہ تحیۃ المسجد تو صرف مسجد ہی میں ہوتی ہیں، ان کو مسجد میں پسند کرنے کا کیا مطلب؟)

اور مسند احمد ص ۳۱۳\۳۶۳ میں تو جابر کا قول اس طرح مروی ہے کہ اگر وہ اپنے گھر میں بھی پڑھ لیا کرتے تھے، تب بھی مسجد میں پہنچ کر پڑھنے کو زیادہ پسند کرتے تھے، ظاہر ہے کہ تحیۃ المسجد تو گھر پر نہیں ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کا ارشاد سنت جمعہ ہی کے لئے تھا اور اسی لئے حضرت جابر اس بات کو پسند کرتے تھے کہ گھر پر پڑھنے کے باوجود بھی مسجد پہنچ کر سنتِ جمعہ پڑھا کریں تا کہ حضور علیہ السلام کے ارشاد کی تعمیل ہو اور یہ بھی حضور علیہ السلام کے ہی ارشاد کی تعمیل تھی کہ نوافل و سنن گھروں میں پڑھے جائیں لیکن حضرت جابر کے عمل مذکور سے امام بخاری وغیرہ کا یہ خیال کرنا کہ حضرت جابر خطبہ کے وقت بھی دو رکعت پڑھتے تھے یا اس کو پسند کرتے تھے، کسی طرح صحیح نہیں، اور اسی طرح امام بخاریؒ اور شافعیہ و حنابلہ کا حدیثِ شعبہ بخاری و مسلم سے استدلال کرنا بھی مرجوح ہے، جس میں ہے کہ "جب تم میں سے کوئی آئے اور امام خطبۂ جمعہ دے رہا ہو تو دو رکعت ضرور پڑھ لے''۔

امام دار قطنی کا نقد

محدث دار قطنی نے ایک رسالہ لکھا تھا بنام ''کتاب التتبع علی الصحیحین'' جس میں تقریباً ایک سو احادیثِ شیخین پر نقد کیا ہے اور وہ سب انتقادات اسانید سے متعلق ہیں بجز حدیث مذکور شعبہ والی کے، کہ اس کے متن کو بھی معلول قرار دیا ہے اور لکھا کہ اس کے راوی شعبہ نے دوسرے اسی حدیث کے چھ راویوں کی مخالفت کی ہے، جو ابن جریج، ابن عیینہ، حماد بن زید، ایوب۔ ورقاء اور حبیب بن یحییٰ ہیں، یہ سب عمرو بن دینار سے اس طرح سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص مسجد میں آیا، حضور علیہ السلام نے دریافت کیا کہ تم نے نماز پڑھ لی ہے، پھر آپ نے اس کو دو رکعت پڑھنے کا حکم دیا۔ یہ ایک خاص واقعہ تھا، مگر شعبہ نے اس کو حضور علیہ السلام کا عام حکم سمجھ کر اس طرح روایت کر دیا کہ جب بھی کوئی مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو دو رکعت ضرور پڑھ لے۔

نطق انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کی عادت ہے کہ جب ان کو کسی حدیث سے استدلال میں تردد ہوتا ہے تو وہ اس کو اس مسئلہ کے باب میں نہیں لاتے، بلکہ کسی دوسری جگہ دوسرے باب میں ذکر کرتے ہیں، اور غالباً ایسا ہی یہاں بھی ہوا ہے کہ وہ جمعہ کے ذیل میں مذکورہ قولی حدیثِ شعبہ کو نہیں لائے حالانکہ ان کا مسلک اس بارے میں وہی ہے جو شافعیہ کا ہے۔ بلکہ اس کو "باب ما جاء فی التطوع مثنی مثنی" میں لائے ہیں، اس لئے خیال ہے کہ اس حدیث سے استدلال کو کمزور سمجھا ہوگا۔ دوسرے یہ کہ عمرو بن دینار کی روایات میں ابن عیینہ سب سے زیادہ اثبت و اقوی ہیں (کما ذکرہ فی الفتح فی مسئلۃ اقتداء المفترض خلف المتنفل) لہٰذا

ابن عیینہ کی روایت سب سے زیادہ قوی ہوئی، خاص کر جبکہ اس کی متابعت و تائید کرنے والے بھی سارے ثقہ ہیں۔ جیسے ابن جریج، حماد ایوب وغیرہم۔ اور ابن جریج تو عمرو بن دینار کے اجلِ اصحاب میں سے ہیں۔ غرض عمرو بن دینار کے دوسرے سارے ہی چھ راوی بہت بڑے ثقہ ہیں، تو کیا ان سب کی متفقہ روایت معیارِ ترجیح نہ ہوگی۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ امام بخاری کی روایت کے لفظ "**اذا جاء احدکم والامام یخطب او قد خرج**" میں شک والی بات بھی ہے یا اس کو قربِ وقتِ خطبہ پر محمول کریں گے، تب بھی وہ ان کے موافق اور ہمارے مخالف نہ ہوگی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ہماری تائید میں ایک بات بطور معارضہ یہ بھی ہے کہ متعدد احادیثِ صحیحہ میں ایسا وارد ہے کہ حضور علیہ السلام کے خطبۂ جمعہ کے وقت کوئی مسجد میں آیا تو آپ نے اس کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا مثلاً:۔

بوقت خطبہ عدم امر بالصلوٰۃ کے واقعات:

(۱) صحیح بخاری "**باب الاستسقاء فی المسجد الجامع**" وغیرہ میں کئی جگہ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن منبر نبوی کے سامنے والے دروازہ سے مسجد میں داخل ہوا، حضور علیہ السلام اس وقت خطبہ دے رہے تھے، وہ حضور کے سامنے کھڑے ہو کر کہنے لگا کہ یارسول اللہ! اموال میں ہلاکت آگئی ہے، راستے منقطع ہوگئے، بارش کے لئے دعا فرمائیے! آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی اور اس شخص کو دو رکعت پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

(۲) اسی حدیث کا آگے یہ ٹکڑا بھی ہے کہ اگلے جمعہ کو بھی ایک شخص اسی دروازے سے مسجد میں داخل ہوا اور حضور علیہ السلام خطبہ دے رہے وہ سامنے آکر کھڑا ہوا اور عرض کرنے لگا:۔ یارسول اللہ ﷺ! اب دوسری قسم کی ہلاکت و تباہی آگئی ہے دعا فرمائیں کہ بارش رک جائے، آپ نے ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی، یہ دوسرا واقعہ ہے کہ آپ نے اس آنے والے کو بھی دو رکعت خطبہ کے وقت پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

(۳) نسائی وابوداؤد "**باب النھی عن تخطی رقاب الناس**" میں حدیث ہے کہ ایک شخص جمعہ کے دن مسجد میں لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آگے آیا، جبکہ حضور علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے، تو آپ نے اس کو فرمایا:۔ بیٹھ جاؤ! تم نے لوگوں کو ایذا دی، لیکن اس کو نماز پڑھنے کے لئے نہیں فرمایا۔

(۴) ابوداؤد، "**باب الامام یکلم الرجل فی خطبۃ**" خطبہ میں ہے کہ آپ جمعہ کے دن منبر پر تشریف لائے، لوگوں سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، حضرت ابن مسعودؓ نے مسجد میں آتے ہوئے آپ کا ارشاد سنا تو اس وقت مسجد کے دروازے میں تھے، وہیں بیٹھ گئے، حضور علیہ السلام نے ان کو دیکھا تو فرمایا عبداللہ! تم یہاں آجاؤ۔ لیکن ان کو بھی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کو نہیں فرمایا۔

آگے علامہ بنوری کا اضافہ ہے:۔

(۵) امام احمد، نسائی، ابن خزیمہ و بیہقی نے روایت کی کہ ایک شخص جمعہ کے دن حضور علیہ السلام کے خطبہ دینے کی حالت میں مسجد نبوی حاضر ہوا اور حضور سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ تم نے اس کے لئے کیا تیاری کی ہے؟ کہنے لگا اللہ اور اس کے رسول کی محبت، آپ نے فرمایا، اچھا تم آخرت میں اسی کے ساتھ ہوگے، جس سے محبت کی ہے۔ آپ نے اس شخص کو بھی دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

(۶) احادیث میں جو باب غسل الجمعہ میں حضرت عمر و عثمانؓ کا قصہ آتا ہے وہ بھی یہاں پیش ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کے صرف وضو کر کے اور دیر سے آنے پر تنبیہ فرمائی، مگر تحیۃ المسجد کے لئے حکم نہیں فرمایا اور نہ اس کے بارے میں سوال کیا۔

(۷) مسند ۷۵/۵ میں عطاء خراسانی کی حدیث ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: مسلم جب جمعہ کے دن غسل کرتا ہے، پھر مسجد کی طرف چلتا ہے اور کسی کو ایذا نہیں دیتا۔ پھر اگر دیکھتا ہے کہ ابھی امام خطبہ ونماز کے لئے نہیں نکلا تو جتنی جی چاہتا ہے نماز پڑھتا ہے، اور اگر دیکھتا ہے کہ امام نکل آیا ہے تو بیٹھ جاتا ہے، خطبہ سنتا ہے اور خاموش بیٹھا رہتا ہے، تا آنکہ امام خطبہ وجمعہ سے فارغ ہو جاتا ہے تو اگر اس کے سارے گناہ اس جمعہ سے اگلے تک کے معاف نہ بھی ہوں تو امید ہے کہ سابق جمعہ تک کا تو گناہوں سے کفارہ ہو ہی جائے گا۔

(الفتح الربانی ص ۷۵/۶ باب التنفل قبل الجمعۃ مالم یصعد الخطیب المنبر)

(۸) اضافہ از راقم الحروف: حضرت قیس بن ابی حازم اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اس وقت مسجد نبوی میں پہنچے کہ حضور علیہ السلام خطبہ دے رہے تھے تو دھوپ میں ہی بیٹھ گئے، حضور نے ان کی طرف اشارہ کر کے سایہ میں بیٹھنے کو فرمایا، ان کو بھی آپ نے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا (الفتح الربانی ص ۷۲/۶)

الفتح الربانی ص ۷۸/۶ میں حنفیہ و مالکیہ اور جمہور سلف صحابہ وتابعین کے مسلک کی دلیل طبرانی کی مرفوع حدیث ابن عمرؓ ذکر کی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی مسجد میں ایسی حالت میں آئے کہ امام منبر پر ہو تو اس وقت وہ نہ نماز پڑھے اور نہ کلام کرے حتی کہ امام فارغ ہو جائے۔

(۹) اضافہ از مولانا عبداللہ خاں صاحب عم فیضہم: سنن بیہقی میں ہے کہ اسلام دشمن ابن ابی الحقیق کو قتل کر کے صحابہ کی ایک جماعت حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ اس وقت جمعہ کے خطبہ کے لئے منبر پر تشریف فرما تھے، آپ نے ان کو دعا دی اور قتل والی تلوار کا معائنہ بھی فرمایا، مگر ان لوگوں کو تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔

(۱۰) مسلم، بیہقی، حاکم نے ابواب الجمعہ میں روایت پیش کی کہ حضور علیہ السلام کے خطبہ دیتے ہوئے حضرت ابورفاعہؓ آپ کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ میں ایک پردیسی مسلمان ہوں، اپنے دین کی باتیں پوچھنے آیا ہوں، حضور علیہ السلام نے خطبہ چھوڑ کر ان کو دین کی باتیں سکھائیں، پھر خطبہ کو پورا فرمایا، یہاں بھی آپ نے ان کو تحیۃ المسجد پڑھنے کو نہیں فرمایا، اگر ضروری ہوتی تو سب سے پہلے اسی کی تلقین فرماتے۔

یہ سب واقعات حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ کے زمانہ میں پیش آئے ہیں، جن سے صحابہ وتابعین نے خطبہ کے وقت نماز نہ پڑھنے کو ترجیح دی ہے، مگر اس کے باوجود امام شافعی، امام احمد، اور امام بخاری کو اصرار ہے کہ امام کے خطبہ پڑھنے کی حالت میں بھی تحیۃ المسجد پڑھنا نہ صرف جائز بلکہ مستحب ہے اور بغیر اس کے بیٹھ جانا مکروہ ہے۔ صرف یہ تاکید ہے کہ مختصر جلدی پڑھ کر پھر خطبہ سننے لگے۔

انوار المحمود ص ۳۶۹/۱ تا ص ۳۷۳/۱۱ اور فتح الملہم ومعارف السنن واعلاء السنن وغیرہ میں پورے دلائل اور حدیثی ابحاث درج ہوئے ہیں اور ہمارے مولانا عبداللہ خاں صاحب کرتپوری (فاضل دیوبند، تلمیذ رشید علامہ کشمیریؒ) نے مستقل رسالہ بنام "نماز بوقت خطبہ" میں مکمل ومدلل بحث اس مسئلہ کی کر دی ہے۔ جو اہل علم کے لئے خاصہ کی چیز ہے، اس میں رجال حدیث اور متون واسناد کی تفصیل خوب کر دی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نیز دوسرے مجوزین تحیۃ المسجد عند الخطبہ غیر مقلدین زمانہ کے دلائل کا جواب اچھی طرح دیا ہے۔

دو بڑوں کا فرق: یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ امام بخاریؒ نے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا شعبہ کی عمرو بن دینار سے روایت کو ابواب الجمعہ سے ہٹا کر باب التطوع میں ذکر کیا ہے اور عمرو بن دینار سے جو دوسرے شیوخ حدیث نے دوسری طرح روایت کی ہے، اس کو صحیح بخاری میں کہیں نہیں لائے، برخلاف اس کے امام مسلم نے اپنی صحیح کے ابواب الجمعہ (ص ۴۱۴/۲ فتح الملہم) میں بواسطہ حماد بن زید وایوب وسفیان وابن جریج، عمرو بن دینار سے جو روایات درج کی ہیں، ان میں صرف سلیک کا قصہ اور فعلی حدیث کا ذکر ہے، شعبہ والی حدیث کے قولی الفاظ نہیں ہیں۔ جبکہ عمرو بن دینار ہی ان سب روایات میں حضرت جابر سے حدیث روایت کرنے والے ہیں، اور ص ۴۱۸/۲ میں حضرت ابوالزبیر بھی

حضرت جابر سے صرف سلیک کا واقعہ نقل کر رہے ہیں، اس روایت میں بھی شعبہ والے الفاظ نہیں ہیں۔ یہ سب قرائن اس بات کے ہیں کہ عام قاعدہ کے الفاظ شعبہ نے سلیک کے قصہ سے خود سمجھ کر روایت کر دیئے ہیں اور دوسری سب روایات مسلم میں ان کا نہ ہونا اسی وہم کو قوت دیتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دوسرے یہ بھی ممکن ہے کہ شعبہ کے ذہن میں دوسری حدیث "اذا جاء احدکم المسجد فلا یجلس حتی یصلی رکعتین" رہی ہو، جو تحیۃ المسجد کے بارے میں الگ سے مروی و مشہور ہے، اور اس کو یہاں قصہ سلیک کے ساتھ لگا دیا ہو، اور اس میں خطبہ کے وقت بھی سلیک کے خاص واقعہ کی وجہ سے نماز پڑھنے کا حکم عام سمجھ کر روایت میں داخل کر دیا ہو، واللہ تعالیٰ اعلم

حضرت علامہ عثمانیؒ کے رجحان کا جواب

مولانا عبداللہ خان صاحب دام فیضہم نے حضرت الاستاذ مولانا شبیر احمد صاحبؒ کے رجحان خاص کا جواب بھی دے دیا ہے، جو انھوں نے اس بحث کے سلسلہ میں ص ۲/۴۱۸ پر ظاہر فرمایا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ نے ابوداؤد کی اس حدیث پر بحث فرماتے ہوئے جس کا ذکر حضرت علامہ عثمانیؒ نے اوپر کے رجحان میں کیا ہے، بذل المجہود کے جواب کو پسند فرمایا ہے لہٰذا ہم اسی کو ذکر کرتے ہیں:۔

صاحب بذل قدس سرہ نے لکھا: یہ حدیث مبیح صلوٰۃ عندالخطبہ ہوسکتی ہے اور حدیثِ انصات عندالخطبہ محرِّم ہے، لہٰذا محرم کو ترجیح ہونی چاہئے، دوسرے یہ کہ یہ حدیث شافعیہ کے بھی خلاف ہے، کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آخر خطبہ میں مسجد پہنچے اور خطرہ ہو کہ تحیۃ المسجد پڑھنے سے نماز جمعہ کی تکبیر تحریمہ فوت ہو جائے گی تو وہ تحیۃ المسجد نہ پڑھے، (کمافی الاقناع) حالانکہ یہ حدیث ابی داؤد عام ہے، جس کا اقتضا بھی عام ہے کہ خواہ کسی حالت میں بھی خطبہ کے وقت آئے تو تحیۃ المسجد ضرور پڑھے۔ ضرور کا لفظ ہم اس لئے لائے کہ شافعیہ وحنابلہ اس کو مستحب اور ترک کو مکروہ بھی بتلاتے ہیں۔ (بذل ص ۲/۱۹۴)

علامہ نوویؒ نے اس حدیث ابی داؤد کو پیش کر کے لکھا کہ یہ ایسی نص صریح ہے جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں اور اس حدیث کے عام اور صریح الفاظ کے بعد بھی اس کی مخالفت یا تاویل کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہوسکتا، اس کے جواب میں صاحب بذل نے لکھا کہ تاویل وتخصیص میں بڑا فرق ہے، مانعین نے احکام انصات للخطبہ کی وجہ سے تخصیص کی ہے کہ خطبہ کے وقت صلوٰۃ وکلام وغیرہ کچھ نہ ہو، جس کے لئے دوسرے آثار وتعامل جمہور سلف وخلف بھی مؤید ہے، اور خود شافعی نے بھی تخصیص کا عمل جاری کیا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ آخر خطبہ میں وہ بھی تحیۃ المسجد سے مانع ہیں۔ اس کے لئے انھوں نے کیا تاویل کی ہے، علامہ نووی کے متبعین بتلائیں گے۔

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے صاحب بذل کا جواب مذکور نقل کر کے پھر خود ارشاد فرمایا کہ لفظ مذکور جس کو امام نووی صریح فرما رہے ہیں، وہ تو حسب تحقیق دار قطنی وہم راوی ہے کہ اس نے حدیث فعلی کو قولی سمجھ کر اور عام حکم خیال کر کے ایسی تعبیر کر دی، چنانچہ دار قطنی نے سارے طرق ومتون کا تتبع کر کے یہی فیصلہ دیا کہ یہ جملہ مدرج راوی ہے، اسی لئے دوسرے راویوں نے اس کو ذکر نہیں کیا ہے۔ میرے نزدیک دار قطنی کی یہ تحقیق درست اور صواب ہے اور شاید اسی لئے امام بخاریؒ نے بھی تردد کیا ہے اور اس حدیث کو دوسری جگہ لانے، اور اس میں اوخرج سے شک راوی بھی بتلا گئے، جبکہ ابوداؤد میں یہ بھی نہیں ہے۔ (انوار المحمود ص ۱/۳۷۲)

غرض اس لفظ کے مطابق نہ تو شافعیہ ہی نے پوری طرح عمل کیا ہے اور نہ اس کے مطابق حضور علیہ السلام اور صحابہ وتابعین کے زمانہ میں عمل ہوا ہے، پھر یہ کہ اوپر دس احادیث بیان ہوئیں جن میں حضور علیہ السلام نے کسی میں بھی خطبہ کے وقت آنے والوں کو تحیۃ المسجد پڑھنے کے لئے نہیں فرمایا اور صرف سلیک کو وہ بھی دوسری ضرورت سے اور خطبہ کے قبل یا خطبہ روک کر دو رکعت پڑھنے کو فرمایا، ان حالات میں خاص

طور سے حنفیہ پر طعن وتشنیع کرنا اور ان ہی کو ہدف ملامت بنانا کہ وہ تحیۃ المسجد سے روکتے ہیں مناسب وموزوں نہیں ہے۔

احادیث ممانعت صلوٰۃ بوقت خطبہ

محترم مولانا عبداللہ خان صاحب عم فیضہم نے اپنے رسالہ میں سب سے پہلی حدیث عطاء خراسانی کی روایت سے مسند احمد کی پیش کی ہے جس میں ہے کہ مسجد میں نماز جمعہ کے لئے آنے والا امام کے آنے سے پہلے جتنی چاہے نماز پڑھے لیکن اس کے خطبہ کے واسطے نکلنے پر بیٹھ کر صرف خطبہ کی طرف متوجہ ہو اور اس کو خاموش ہو کر سنے۔ اس سے اس کے گناہوں کا آئندہ جمعہ تک کے لئے کفارہ ہو جائے گا۔

مولانا فرماتے ہیں کہ عطاء خراسانی کو سب ہی اکابر نے ثقہ کہا ہے، مگر بڑوں میں سے امام بخاری نے اس کی تضعیف فرمادی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے تلمیذ رشید امام ترمذی نے آپ سے بحث بھی کی، اور پھر یہاں تک بھی کہہ دیا کہ میری معلومات میں تو کسی نے بھی متقدمین میں سے عطاء خراسانی کی تضعیف نہیں کی ہے۔ (میزان وتہذیب وغیرہ) اس سلسلہ میں مولانا نے جم کر نقد رجال کی بحث کا حق ادا کر دیا ہے۔ جو اس رسالہ کی خاص چیز اور قابل مطالعہ ہے۔ (۲) حدیث طبرانی مجمع الزوائد بحوالہ فتح الباری ارشاد نبوی کہ امام منبر پر آجائے تو پھر نہ نماز پڑھی جائے نہ کلام کیا جائے (۳) حدیث بیہقی کہ امام کا خطبہ جمعہ کے لئے نکلنا نماز کو قطع کر دیتا ہے۔ اور اس کا کلام (خطبہ) بات چیت کو قطع کر دیتا ہے۔

(۴) حدیث طحاوی شریف کہ امام منبر پر آجائے تو نماز پڑھنا گناہ ہے۔

(۵) حدیث مسلم شریف کہ جو شخص اچھی طرح وضو کر کے مسجد گیا پھر خطبہ کی طرف کان لگائے۔ اور خاموش رہا تو اس کے گناہ اس جمعہ سے دوسرے جمعہ اور مزید تین دن تک کے معاف ہو جاتے ہیں،

(۶) حدیث بخاری شریف کہ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے پھر تیل وخوشبو لگائے اور دو شخصوں کے درمیان تفریق نہ کرے اور نماز پڑھے پھر جب امام (نماز وخطبہ کے لئے) نکلے تو خاموشی اختیار کرے تو اس کے گناہ اس جمعہ سے اگلے جمعہ تک کے معاف ہو جائیں گے۔

مولانا نے مزید ۱۴ احادیث وآثار پیش کر کے لکھا کہ ان سب سے حضور علیہ السلام کا خطبہ کے وقت نماز کو پسند نہ فرمانا اور خلفاء راشدین وجمہور صحابہ وتابعین وائمہ دین کا بحالت خطبہ نماز کو اختیار نہ کرنا پوری طرح واضح ہو گیا ہے۔ (نماز بوقت خطبہ ص ۵۵) مولانا نے اس موقع پر مسند امام احمد کی حدیث بھی پیش کی کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا'' جو شخص جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے وقت کلام کرے وہ مثل گدھے کے ہے، جس پر کتابیں لادی گئی ہوں''۔

علامہ ابن تیمیہ کا ارشاد

علامہ ابن تیمیہ نے فتاوی ص ۲/۱۷۳ میں قراءۃ خلف الامام فی جہریہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا:۔ جہر سے مقصود لوگوں کا استماع ہے کہ وہ کان لگا کر قراءۃ امام کو سنیں۔ اور اسی لئے ولا الضالین پر آمین بھی کہتے ہیں، پس اگر امام کی قراءت کے وقت مقتدی بھی قراءت میں مشغول ہو جائیں تو گویا حق تعالیٰ نے امام کو ایسے لوگوں کو قراءت سنانے کا حکم دیا جو اسکو نہیں سنتے اور ایسا ہی ہوا کہ کوئی شخص دوسرے سے بات کرے، جس کو وہ نہ سنتا ہو یا امام خطبہ دے ایسے لوگوں کے سامنے جو اس کا خطبہ نہ سنیں، ایسا حکم اول درجے کی حماقت ہے جس سے شریعت مقدسہ منزہ ہے اور اسی لئے حدیث میں وارد ہوا کہ جو امام کے خطبہ کے وقت کلام کرے وہ مثل گدھے کے ہے۔ لہٰذا اسی طرح وہ بھی ہوگا جو امام کی قرائۃ کے وقت قرائۃ کرے (معلوم نہیں خطبہ کے وقت لوگوں کا نماز میں مشغول ہو جانا بھی اس کے تحت آتا ہے یا نہیں؟)

بقیہ دو بڑوں کا فرق: ہم نے اوپر اشارہ دیا ہے کہ امام بخاریؒ اپنے مسلک کی رعایت اس حد تک بھی کرتے ہیں کہ ایک ہی حدیث کے کچھ طرق کو لاتے ہیں اور دوسروں کو نظر انداز کر دیتے ہیں جیسا کہ مسئلہ زیر بحث میں حدیث جابر کے لئے، حالانکہ دوسرے سب رواۃ کے

متون، متن روایت شعبہ سے بالکل مختلف ہیں، اور امام مسلم نے ان کو ایک جگہ ذکر کر دیا ہے،

اور ایسا تو امام بخاریؒ بہت کرتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث متعدد رواۃ سے ہو اور الفاظ روایت بھی الگ الگ ہوں تو معنی واحد ہونے کی صورت میں وہ صرف کسی ایک راوی کے لفظ نقل کرتے ہیں، پھر یہ بہتر ہوتا کہ اس لفظ والے کی تعیین ہی کر دیتے، تو امام بخاریؒ یہ بھی نہیں کرتے، البتہ امام مسلم اس کا التزام کرتے ہیں اور یہی بہتر بھی ہے۔

حضرت علامہ عثمانیؒ نے ترجیح کتاب مسلم علی کتاب البخاری کے عنوان سے مقدمۂ فتح الملہم ص ۹۸ میں مذکور بالا کے علاوہ دوسری وجوہ بھی ذکر کی ہیں مثلاً:۔

(۳) کسی حدیث کو مسلم سے نکال لینا بہت آسان ہے، کیونکہ امام مسلم نے ہر حدیث کے لئے ایک موزوں ومناسب باب اور مقام تجویز کیا ہے، اور اسی جگہ وہ اس کے سارے طرق واسانید اور الفاظ مختلفہ واردہ جمع کر دیتے ہیں، جن سے طرق متعددہ اور الفاظ مختلفہ کی معرفت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور کسی حدیث کا نکالنا بھی سہل ہوتا ہے بخلاف امام بخاریؒ کے کہ وہ ان وجوہ مختلفہ کو متفرق ابواب میں لاتے ہیں اور بہت سی احادیث تو غیر مظان ابواب میں لاتے ہیں جس کی وجہ سے طرق متعددہ والفاظ مختلفہ کی معرفت تو در کنار حدیث کو تلاش کر کے نکالنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ حتی کہ بہت سے حفاظ متاخرین کو تو اتنا دھوکہ ہوا کہ انھوں نے صحیح بخاری میں کسی حدیث کے وجود سے انکار بھی کر دیا جبکہ وہ اس میں موجود تھی اور ان کو مظان میں نہ مل سکی تھی۔

(۴) امام مسلم نے اپنی کتاب کو اپنے شہر میں تمام اصول مرجوعہ کو سامنے رکھ کر اپنے بیشتر مشائخ کی زندگی میں لکھ لیا تھا، اسی لئے الفاظ وسیاق میں وہ پوری احتیاط برتتے ہیں بخلاف امام بخاری کے کہ انھوں نے بسا اوقات احادیث کو اپنے حافظہ سے ذکر کیا ہے۔ اور الفاظ رواۃ کو بھی ممیّز نہ کر سکے۔ اسی لئے ان کو شکوک بھی پیش آئے ہیں اور خود بھی فرمایا کہ بہت سی احادیث میں نے بصرہ میں سنی تھیں اور ان کو لکھا شام میں، پھر انھوں نے احادیث سے استنباط احکام کی فکر بھی ساتھ ساتھ رکھی۔ اور ان کے لئے اپنے اجتہاد واستنباط کے مطابق ابواب قائم کئے، اس کی وجہ سے ان کو ایک ایک حدیث کے ٹکڑے کر کے ان کو ابواب میں تقسیم کرنا پڑا بخلاف امام مسلم کے کہ انھوں نے استنباط احکام کی فکر اپنے ذمہ نہیں لگائی اس لئے ایک حدیث کے سارے متون مرویہ اور طرق واسانید بھی ایک جگہ میں جمع کر دیئے۔

(۵) امام مسلم نے امام بخاری کے برخلاف احادیث پر اقتصار کیا۔ موقوفات کو صرف چند مواضع میں لائے ہیں، وہ بھی تبعاً لا مقصوداً، اور اس لئے شاید ابن مندہ کے شیخ امام حاکم ابو علی نیسا پوریؒ نے کہا کہ ”آسمان کے نیچے کتاب مسلم سے زیادہ صحیح کوئی کتاب نہیں ہے“۔

(۶) بعض شراح بخاری نے باعتبار صحت کے صحیح بخاری کو دوسری کتابوں پر ترجیح دیتے ہوئے لکھا کہ امام مسلم کی صحیح کو صحیح بخاری پر زیادہ فضیلت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ سارے متون حدیث کو ایک جگہ جمع کر دیتے ہیں اور ان کو امام بخاریؒ کی طرح ابواب متفرقہ میں تقسیم نہیں کرتے، اور یہ بھی ہے کہ امام مسلم حدیث کے متون پورے پورے ایک جگہ ذکر کرتے ہیں اور امام بخاری کی طرح ان کے ٹکڑے ٹکڑے بنا کر تراجم میں نہیں بانٹتے۔ اور یہ بھی ہے کہ امام مسلم احادیث کی روایت باللفظ پر محافظت کرتے ہیں۔ اور روایت بالمعنی نہیں کرتے، اور متون احادیث الگ کر کے لاتے ہیں امام بخاری کی طرح ان کے ساتھ اقوال صحابہ ومن بعدہم کو مخلوط نہیں کرتے۔

حافظ ابن حجرؒ نے تہذیب میں لکھا کہ امام مسلم کو اپنی صحیح کی وجہ سے وہ عظیم وعالی مرتبۂ رفیعہ حاصل ہوا جو اور کسی کو حاصل نہ ہو سکا، اور اسی وجہ سے بعض لوگوں نے اس کو امام بخاری کی صحیح پر بھی فضیلت دے دی ہے، کیونکہ اس کو جمع طرق جودت سیاق۔ محافظت علی اداء الالفاظ کی خصوصیات حاصل ہو گئیں، اور وہ محافظت بھی ایسی کہ نہ صرف روایت بالمعنی سے محترز رہے بلکہ احادیث ومتون کی تقطیع سے بھی اجتناب اختیار کیا۔“ (مقدمہ فتح الملہم ص ۹۹)

چونکہ صحیح بخاری کی شرح چل رہی ہے، مناسب سمجھا کہ صحیحین کا کچھ فرق وامتیاز بھی ناظرین کے سامنے آ جائے۔ اور دونوں کی عظمت اور جلالت قدر بھی ملحوظ رہے۔

احادیث اتمام سے وجوب قراءۃ خلف الامام کا ثبوت

امام بخاریؒ نے بہت سی احادیث اتمام ذکر کر کے یہ ثابت کیا کہ جب حضور علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے کہ جو کچھ نماز کا حصہ تمہیں مل جائے امام کے ساتھ وہ اس کے ساتھ پڑھ لو اور جو رہ جائے اسے بعد کو پورا کرلو۔ تو جس سے قراءت کا فرض رہ گیا یا قیام کا تو اسے بعد کو پورا کرنا ہے اور صرف رکوع میں ملنے سے قراءت و قیام دونوں رہ گئے، لہٰذا وہ رکعت نہ ہوئی اور مقتدی کوئی رکعت بعد کو پوری کرنی چاہئے جیسا کہ حضور علیہ السلام نے اتنی بہت سی احادیث میں ذکر فرمایا ہے۔

اگر کوئی یہ کہے کہ فاتحہ کی قراءت رکوع میں کرلے گا، جیسا کہ بعض اہل ظاہر اس کو کہتے ہیں اور خود امام بخاری کے یہاں بھی رکوع و سجدے میں قرآن مجید پڑھنے کا جواز ہے (جبکہ سب اس کو ناجائز کہتے ہیں اور مسلم شریف میں بہت سی احادیث ممانعت کی وارد ہیں) تو امام بخاری اس کو بھی رد کرتے اور کہتے ہیں کہ یہ اس لئے صحیح نہ ہوگا کہ قراءت کا محل رکوع سے قبل کا ہے، اگر ہم اس کو قیام سے مؤخر کر کے رکوع میں جائز کردیں گے تو یہ حدیث کی مخالفت ہوگی۔ لہٰذا جس طرح سجدہ رکوع سے قبل نہیں ہوسکتا، رکوع بھی قراءت سے پہلے صحیح نہ ہوگا، اور اس رکوع کو جو بے محل ہوا ہے معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔

من ادرک رکعة سے استدلال

جزء القراءۃ ص ۲۴ و ص ۲۵ میں امام بخاری نے من ادرک رکعة من الصلوٰة فقد ادرک الصلوٰة کے مختلف متون متعدد اسناد سے ذکر کئے اور یہ تاثر دیا کہ ان سب احادیث میں یہ ہے کہ ایک رکعت ملنے سے جماعت کی نماز کا ثواب مل جاتا ہے، یہ نہیں ہے کہ رکوع ملنے سے رکعت مل گئی، کیونکہ کسی حدیث میں ایسا نہیں آیا کہ جس کو رکوع یا سجود یا تشہد مل گیا تو اس کو رکعت مل گئی۔

ص ۲۷ میں امام بخاری نے یہ اعتراض بھی غیر موجبین پر کیا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے، اور ان لوگوں میں سے بعض نے یہ بھی خیال کیا کہ حضور اس لئے اس کو طویل کرتے تھے تاکہ لوگوں کو رکوع تک امام کے ساتھ ملنے سے رکعت مل جائے مگر یہ بات تو جب صحیح ہوتی کہ وہ کہتے حضور علیہ السلام رکوع کو طویل کرتے تھے، اور وہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ لوگوں کے رکوع میں مل جانے کی توقع ہو تو امام رکوع میں دیر لگائے، حالانکہ رکوع میں کسی کا انتظار کرنا نہ کوئی سنت ہے نہ اس میں ثواب ہے۔

پھر امام بخاریؒ نے ایسی روایت پیش کی کہ جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام قراءت طویل کرتے تھے، اور صحابہ بقیع جاکر ضرورت سے فارغ ہوکر گھر آتے اور وضو کر کے آپ کے ساتھ اطمینان سے شریک ہوجایا کرتے تھے گویا قراءت طویل کرنا اس لئے نہ تھا کہ لوگوں کو رکوع میں ملنے سے رکعت مل جائے گی بلکہ لوگوں کو بسہولت اور ضروریات سے فارغ ہوکر پہلی رکعت ملنے کی غرض سے تھا۔

پہلے ہم تفصیل سے ذکر کرچکے ہیں کہ جمہور سلف و خلف کا فیصلہ امام بخاریؒ کی اس رائے کے خلاف ہے کہ رکوع ملنے سے رکعت نہیں ملتی مگر امام صاحب برابر اپنی رائے درست ثابت کرنے کے لئے مواقع تلاش کر کے نکالتے ہیں۔

خداج سے استدلال

امام بخاریؒ نے متعدد صفحات میں حضرت ابوہریرہؓ وغیرہ سے وہ ۱۲۔۱۳ روایات ذکر کیں جن سے معلوم ہوا کہ بغیر قراءۃ فاتحہ کے نماز خداج ہوگی یا غیر تمام ہوگی، اور ص ۲۵ میں جاکر خداج کے وہ معنی بھی کھول دیئے جو ان کے ذہن میں تھے، فرمایا:۔ ابوعبید نے کہا اخدجت الناقة اس وقت بولتے ہیں جبکہ اونٹنی سقط ڈالے، اور سقط بچہ مردہ ہوتا ہے، جس کا کوئی فائدہ نہیں، گویا اسی طرح بغیر فاتحہ کے نماز بھی مردہ

بے جان، بے فائدہ یا غیر مقلدین کی تعبیر میں باطل وکالعدم ہوگی۔

جواب: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے حدیث خداج کے تحت لکھا:۔ خداج کے معنی کمی اور نقصان کے ہیں۔ امام لغت خلیل وغیرہ نے کہا کہ خدجت الناقۃ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی پوری مدت حمل سے پہلے بچہ ڈال دے اگرچہ وہ بچہ جسمانی اعتبار سے پورا ہو اور اخدجتہ جب بولتے ہیں کہ وہ بچے کو ناقص الخلقت جنے اگرچہ پوری مدت پر جنے۔ اور غیر تمام جن روایات میں آیا ہے۔ اس کا مطلب بھی ناقص اور کمی ہے، بہ نسبت کمال کے۔ گویا غیر تمام بطور بدل یا تاکید کے ہے اور بظاہر یہ بتلایا ہے کہ بغیر فاتحہ کے نماز میں کمی رہے گی یا نہیں کہ وہ سرے سے باطل اور کالعدم ہو جائے گی۔

حنفیہ بھی یہ ہرگز نہیں کہتے کہ نماز بغیر اس کے جائز ہوگی، وہ بھی واجب کہتے ہیں او اگر نہ پڑھے تو نماز کو واجب الاعادہ بتلاتے ہیں، لہٰذا جن حضرات نے یہ سمجھ کر حنفیہ پر تشنیع کی کہ وہ بغیر فاتحہ کے نماز جائز کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، البتہ امام کے پیچھے اور وہ بھی جہری میں مقتدی پر اس کو واجب نہیں مانتے۔ اور اس کے عدم وجوب میں ان کے ساتھ اور سب بھی ہیں (بجز امام بخاری و ابن حزم کے) لہٰذا حافظ ابن حجر کا تعجب اور علامہ نووی کے تشنیع حنفیہ پر بالکل بے محل ہے۔ الخ (اوجز ص ۱/۲۴۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل الخطاب ص ۱۹ میں مستقل فصل احادیث خداج پر لکھی ہے اور فرمایا کہ احادیث خداج نے تو یہ بتلایا کہ فاتحہ کے بغیر نماز ناقص ہوگی یہ نہیں بتلایا کہ بالکل باطل ومنفی ہوگی، اور جب صحیح حدیثوں میں پوری بات ہے کہ نماز بغیر فاتحہ اور کچھ مزید قراءت کے بغیر نہ ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف فاتحہ بلکہ ضم قراءت یا سورت بھی ضروری ہے، اس لئے حنفیہ صرف قراءت کو نماز کے لئے فرض اور فاتحہ و سورت دونوں کو واجب قرار دیتے ہیں، دوسرے حضرات نے حدیث کے ایک قطعہ (فصاعدا وغیرہ) کو بہت کم درجہ دیا کہ اس سے صرف سنیت و استحباب کا اثبات کیا ہے۔ حنفیہ نے احادیث کے لفظ فصاعدا اور فمازاد اور وما تیسر وغیرہ کے اشارات کو بھی پوری اہمیت دی ہے، اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ ان احادیث کی وجہ سے اگر کسی نے نماز میں نہ فاتحہ پڑھی نہ اس کے ساتھ دوسری قراءت کی تو اس کی نماز بالکل نہ ہوگی، حضرتؒ نے فرمایا کہ اس قسم کے اشارات، صراحتوں سے زیادہ مقصد کی طرف مشیر ہوتے ہیں بقول شاعر ؎ "منازل من تھوی رویدک فانزل"
(یہی تو تیری محبوبہ کے گھروں کے نشانات ہیں، لہٰذا اپنے سفر کو موخر کر کے یہاں اتر کر کچھ دیر بیٹھ اور گذشتہ باتوں کی یاد تازہ کر)

حضرتؒ نے پوری تفصیل و وضاحت کر کے بتلایا کہ احادیث خداج نے نماز بلا فاتحہ کو محسوس ناقص الخلقۃ بچہ سے تشبیہ دے کر اس کے حکماً ناقص ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، لہٰذا ان احادیث سے بطلان صلوٰۃ کا فیصلہ کرنا احادیث کے منشا کے خلاف ہے۔ کیونکہ ان سے صرف وجوب فاتحہ اور مرتبہ واجب کا ثبوت ملتا ہے جو حنفیہ کا مسلک ہے۔ آخر میں حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہاں غیرہ تمام تمام بالمعنی المشہور سے نہیں ہے، بلکہ تمام عرب کے خاص محاورہ ''ولدتہ امہ تمام'' سے ہے۔ یعنی پوری مدت پر بچہ ہو مگر ناقص یا کم مدت پر ہو مگر کامل ہو۔ گویا خداج ہی کے دونوں معنی کی تاکید ہوتی ہے۔

اس تفصیل سے خوب واضح ہو گیا کہ امام بخاریؒ نے جو خداج کے لفظ سے نماز کو باطل محض سمجھا تھا، یا جیسے اب غیر مقلدین بھی دعوی کرتے ہیں کہ بغیر فاتحہ کے نماز باطل اور کالعدم ہوتی ہے۔ یہ دعوی بلا برہان ہے۔ اور امام بخاری نے مردہ بچہ ڈالنے اور میت لا ینتفع بہ کا اضافہ بھی کیا، وہ لفظ کے معنی اصلی سے زائد بات ہے، اور بقول حضرتؒ کے یہ امام بخاریؒ کے مبالغات میں سے ہے کہ جب ایک شق کو اختیار کر لیتے ہیں تو دوسری جانب کی ساری عمارتوں کو منہدم کر دینے کی سعی کیا کرتے ہیں، جس طرح علامہ ابن تیمیہ (اپنے تفردات کے اثبات میں) صرف اپنی ہی دھنتے تھے اور دوسروں کی نہیں سنتے تھے۔

صاحب احسن الکلام نے دوسری ایسی احادیث بھی اس موقع پر پیش کی ہیں جن میں خداج یا غیر تمام کے الفاظ کسی واجب و فرض کے

ترک پر نہیں بلکہ صرف مکملات وسنن صلوٰۃ کے ترک پر فرمائے گئے ہیں (احسن الکلام ص۴۰/۲) اور لکھا کہ جس طرح موجبین نے فصاعدا وغیرہ الفاظ کو نظر انداز کر دیا ہے، حالانکہ اس کی روایت کرنے والے اکابر امام معمر، سفیان بن عیینہ، امام اوزاعی، شعیب بن ابی حمزہ، عبد الرحمان بن اسحٰق مدنی، اور صالح بن کیسان ایسے جلیل القدر ائمہ ثقات اور حفاظ ہیں، اسی طرح خداج والی احادیث میں بھی الا صلوٰۃ خلف الامام کی زیادتی ثقات کو نظر انداز کر دیا ہے اور جہاں خود ضرورت پیش آئی تو حضرت عبادہؓ کی حدیثِ صحیحین میں جہری قرائۃ خلف الامام کے اثبات کرنے کے لئے محمد بن اسحٰق جیسے ضعیف راوی کے ذریعہ خارج صحیحین سے زیادتی ثابت مان لی ہے۔

صلوٰۃ الی غیر القبلہ کا جواز؟

امام بخاری نے ص۲۷ جزء القراءۃ میں لکھا کہ حضرت زید بن ثابت سے تو یہ ثابت ہوا کہ انھوں نے غیر قبلہ کی طرف رجوع کیا ہے، مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر رکوع غیر قبلہ کی طرف کیا تو اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔ حنفیہ نے جن صورتوں میں تحری یا بغیر تحری کے غیر قبلہ کی طرف نماز کو درست یا نادرست کہا ہے، اس کی پوری تفصیل کتب فقہ میں ہے، اور حلبی کبیر (شرح منیہ) ص۲۱۷/۲۲۵ میں تمام صورتوں کی تفصیل واحکام ہیں اس لئے مبہم طور سے کسی مسلک کو گرانے کے لئے اس کو احادیث یا آثار کے خلاف کہہ دینا انصاف سے بعید ہے۔

جہر مقتدی بالقراءۃ کی ممانعت؟

امام بخاریؒ نے ص۲۸ میں مستقل فصل قائم کر کے یہ تاثر دیا کہ دراصل قراءت خلف الامام کی احادیث ممانعت میں نفس قرائۃ کی وجہ سے ممانعت نہیں ہے، بلکہ زور سے پڑھنے کی ممانعت ہے اور پہلی حدیث اس طرح پیش کی کہ لوگ حضور علیہ السلام کے پیچھے زور سے پڑھتے تھے، اس لئے آپ نے منع فرمایا، حالانکہ اسی فصل میں امام بخاریؒ نے جو دوسری احادیث ذکر کی ہیں، اور اس میں ظہر کی نماز کا بھی واقعہ ہے، جس میں ظاہر ہے کہ جب حضور علیہ السلام اور دوسرے صحابہ بھی قراءت زور سے نہ کرتے ہوں گے تو کسی ایک نے ہی کیوں زور سے کی ہو گی۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ہر جگہ کے واقعات میں حضور علیہ السلام نے نماز کے بعد یہی سوال فرمایا کہ تم میں سے کس نے قراءت کی ہے؟ یہ سوال کہیں نہیں ہے کہ کس نے زور سے قراءت کی؟ لہٰذا ان سب احادیث کو جہر مقتدی سے متعلق کر دینا صحیح نہیں ہوسکتا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

منازعت کی وجہ سے اعادہ کا حکم نہیں ہوا

امام بخاریؒ نے ص۲۹ میں یہ باب بھی قائم کیا، جس سے ثابت کیا کہ امام کے پیچھے قراءت سے کوئی نقصان نماز میں نہیں آتا، اسی لئے تو حضور علیہ السلام نے منازعت والے کو اعادہ صلوٰۃ کا حکم نہیں فرمایا، اور حدیث مسلم وغیرہ کے الفاظ کہ امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو ان کو زیادتی غیر ثقہ بتلایا، حالانکہ وہ کبار محدثین کے نزدیک زیادتی ثقہ ہے، پھر حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف قراءت فی الجہر یہ کی بات منسوب کی، حالانکہ وہ غلطی ہے اور غیر جہری کی جگہ جہری ہوگیا ہے۔ آخر میں امام بخاری نے دعویٰ کیا کہ مسلم وغیرہ کی زیادتی جو ابو خالد سے نقل ہوئی ہے، اس کی کسی نے متابعت نہیں کی ہے، حالانکہ اس کی متابعت وتائید دوسرے متعدد ثقہ راویوں نے کی ہے۔ (پوری بحث کتابوں میں دیکھی جائے)

سکتات امام کی بحث

ص۲۹ میں امام بخاریؒ نے مستقل باب سکتات امام میں قراءت کے لئے ذکر کیا ہے، ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بھی فصل الخطاب ص۸۵ میں سکتات پر تفصیلی بحث کی ہے، آپ نے لکھا:۔ جبکہ شریعت نے جہری نماز میں امام کے پیچھے کوئی محل وموقع فاتحہ کے لئے تجویز نہیں کیا تو امام بخاری نے سکتات میں پڑھنے کی صورت نکالی ہے، اور حضرت سعید بن جبیر سے یہ بھی نقل کیا کہ لوگوں نے نئی نئی باتیں

نکال لی ہیں، سلف میں تو امام تکبیر کہہ کر اتنی دیر تک خاموش ہوتا تھا کہ اس کو اطمینان ہو جاتا تھا کہ اس کے پیچھے والے مقتدیوں نے فاتحہ پڑھ لی ہوگی۔ پھر وہ قراءت کرتا اور لوگ خاموش رہ کر قراءت سنتے تھے۔

اس پر حضرتؒ نے لکھا کہ یہ ان لوگوں نے خود سے بات بنالی ہے ورنہ کسی مرفوع حدیث سے ایسے بڑے سکوت امام اور قراءت مقتدی خلف الامام کا ثبوت نہیں ہے، اور خود حضرت سعید بن جبیر ہی سے مصنف ابن ابی شیبہ میں یہ بھی منقول ہے کہ ان سے قراءت خلف الامام کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:۔ امام کے پیچھے کوئی قراءت نہیں ہے، اور دوسرا اثر ان ہی سے کتاب الآثار امام محمد میں بھی ہے، لیکن موجبین کی طرف سے اصرار و مبالغہ یہاں تک ہوا ہے کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں بھی قراءت ضرور کرو خواہ اس کی قراءت سے پہلے ہو یا بعد میں یا اس کے ساتھ ہی ہو کسی حال میں بھی ترک نہ کرو، حالانکہ شارع علیہ السلام نے حدیث انسؓ میں سوال فرمایا کیا تم اپنی نماز میں امام کے پیچھے قرائۃ کرتے ہو جبکہ وہ قراءت کر رہا ہو؟ دوسری حدیث میں ہے کہ شاید تم امام کی قراءت کے وقت بھی قراءت کرتے ہو؟! اور حدیث ابن اکیمہ (جزء القراءۃ بخاری) میں بھی ہے کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرائۃ کی ہے؟ غرض اوپر جیسا اصرار و مبالغہ مناسب نہیں، اور اس کے مقابلہ میں دوسری طرف سے بھی مصنف ابن ابی شیبہ کا اثر حضرت ابراہیم نخعی کا پیش ہو سکتا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ سب سے پہلی بدعت جو لوگوں نے چلائی وہ قراءۃ خلف الامام کی ہے اس سے پہلے لوگ نہ پڑھتے تھے۔

دوسری بات یہ بھی دیکھنی ہے کہ جو شخص امام کی فاتحہ ختم ہونے کے قریب نماز میں داخل ہوا تو وہ امام کے آمین کہنے پر آمین کہہ کر بقیہ اپنی فاتحہ اگر پڑھے گا تو اس صورت میں ''آمین'' طابع نہ رہے گی، کہ ابوداؤد میں اس کو طابع[1] قرار دیا گیا ہے، اور اگر آمین اپنی فاتحہ پوری کرنے کے بعد کہے گا تو امام و ملائکہ کی موافقت نہ رہے گی۔ غرض دونوں فضیلتوں میں سے ایک ضرور فوت ہو جائے گی۔ اور یہ سب غیر موزوں باتیں اس لئے پیش آئیں کہ خود احادیث کے اندر قراءۃ خلف الامام کو کوئی خاص مقام و اہمیت نہیں دی گئی ہے، اور ہم نے التزام مالا یلزم کر کے خود سے کچھ صورتیں تجویز کر لی ہیں۔

پھر فرمایا کہ امام نووی سے تعجب ہے کہ انھوں نے ''الاذکار'' میں سکتات کا مسئلہ اٹھایا ہے اور تیسرا طویل سکتہ آمین کے بعد نکالا جس میں مقتدی فاتحہ پڑھے گا۔ گویا انھوں نے آمین کے بعد اس کو مقتدی کے لئے بطور اصل مطرد کے تجویز کر دیا۔ الخ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں سکتات کے اندر قراءت کو پوری طرح سے ضعیف قرار دیا ہے اور کافی و وافی بحث کر دی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ کا ارشاد

آپ نے اپنے رسالہ ''تنوع العبادات'' میں لکھا:۔ نماز میں سکتہ کے متعلق لوگوں کے تین قول ہیں، ایک یہ کہ نماز میں کوئی سکتہ نہیں ہے جیسے امام مالکؒ کا مذہب ہے کہ ان کے نزدیک ثناء و تعوذ نہیں ہے، اور قراءت امام کے اندر بھی کوئی سکتہ نہیں ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ نماز میں صرف ایک سکتہ ثناء و تعوذ کے لئے ہے جیسے امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہے کیونکہ حدیث ابی ہریرہ عند الشیخین سے اس کا ثبوت ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نماز میں دو سکتے ہیں جیسا کہ سنن کی روایات میں ہے، مگر ان میں سے دوسرا سکتہ قراءت سے فارغ ہونے کے بعد رکوع سے پہلے ہے اور یہی صحیح ہے، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ حضور علیہ السلام سورۂ فاتحہ سے فراغت پر سکتہ کرتے تھے، امام شافعی اور امام احمد کے اصحاب میں سے بعض لوگوں کا قول اس روایت کی بناء پر یہ ہے کہ نماز میں تین سکتے مستحب ہیں، سورۂ فاتحہ کے بعد والے سکتہ کو امام

---

[1] بذل المجہود ص ۲/۱۰۶ میں ہے:۔ قولہ اختمہ بآمین فان آمین مثل الطابع علی الصحیفۃ، یعنی اپنی دعا کو آمین پر ختم کیا کرو، کیونکہ آمین ایسی ہے جیسے خط پر مہر لگ جاتی ہے، اور جس طرح شئی عزیز مہر کے ذریعہ محفوظ کر دی جاتی ہے۔ ایسی ہی دعا بھی آمین کی مہر کے ذریعہ محفوظ ہو کر حق تعالیٰ کی جناب میں پہنچا دی جاتی ہے۔ (مؤلف)

شافعی کے اصحاب اور بعض اصحاب احمد نے مقتدی کی قراءت فاتحہ کے لئے قرار دیا ہے، مگر صحیح یہ ہے کہ صرف دو ہی سکتے مستحب ہیں۔ حدیث صحیح میں اس کے سوا کچھ نہیں ہے، اور ایک روایت دو میں سے غلط ہے، ورنہ تین سکتے ہو جائیں گے۔ اور امام احمدؒ سے یہی منصوص ہے کہ صرف دو سکتے مستحب ہیں اور دوسرا سکتہ قراءت سے فارغ ہونے کے بعد راحت کے لئے اور قراءت ورکوع میں فصل کرنے کے لئے ہے۔

پھر یہ کہ سورۂ فاتحہ کے بعد سکتہ کرنے کو امام احمد اور امام مالک وامام ابوحنیفہؒ مستحب نہیں سمجھتے اور جمہور بھی اس امر کو مستحب نہیں سمجھتے کہ امام اس غرض سے سکتہ طویلہ کرے کہ مقتدی فاتحہ پڑھ لے۔ کیونکہ جب امام جہر سے قراءت کرے۔ اس وقت مقتدی کے ذمہ جمہور کے نزدیک قراءت واجب یا مستحب نہیں ہے بلکہ قراءت کرنا مقتدی کو منع ہے۔

اگر امام کے ساتھ اس حالت میں مقتدی قراءت کرے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ امام احمد کے مذہب میں اس کے متعلق دو قول ہیں اور عامۂ سلف صالحین جو امام کے پیچھے قرائۃ کو مکروہ کہتے ہیں یہ کراہت اس صورت میں ہے کہ امام جہر سے قراءت کر رہا ہو اور اکثر ائمہ سورہ فاتحہ کے طویل سکوت نہیں کرتے تھے، اور جہری نماز میں امام کے پیچھے قراءت کرنے والے بہت کم لوگ تھے۔

اس سے تو کتاب اللہ میں بھی منع کیا گیا ہے اور حدیث میں بھی، اور جمہور سلف وخلف اسی پر ہیں کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قراءت مکروہ ہے۔ نیز لکھا: جو لوگ امام کے ساتھ قراءت کرنے سے مقتدی کو منع کرتے ہیں ان کے ساتھ جمہور سلف وخلف بھی ہیں اور کتاب اللہ وسنت صحیحہ بھی ہے، اور جو لوگ اس حالت میں مقتدی پر قراءت کو واجب کہتے ہیں، ان کی حدیث ابی داؤد کو ائمہ نے ضعیف کہا ہے، اور امام احمد ومسلم واسحق بن راہویہ وغیرہم نے جو حدیث میں واذا قرا فانصتوا روایت کیا ہے۔ وہ صحیح قرار دی گئی ہے۔ اور ابوداؤد والی اوپر کی حدیث صحیح کے درجہ میں شامل نہیں کی گئی اور بہت سی وجوہ سے اس کا ضعیف ہونا ثابت ہے اور حقیقت میں وہ حضرت عبادہ کا قول ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نہیں ہے (تنوع العبادات ص۸۵/۸۶)

آخری باب اور قراءت خلف الامام

امام بخاریؒ نے باب جزء القرائۃ میں قراءۃ ظہر کا قائم کیا ہے جس میں وہ احادیث ذکر کیں، جن سے ظہر وعصر کی چاروں رکعتوں میں فاتحہ پڑھنے کا ثبوت ہے، اور اس کو سب ہی منفرد کے لئے مانتے ہیں، سوال تو فرضوں میں خلف الامام کی صورت کا ہے اور وہ بھی جہری میں، لیکن اس باب میں امام بخاریؒ نے جو سب سے پہلی حدیث حضرت جابر عبداللہ کی پیش کی ہے، اسی میں یہ مضمون ہے کہ جو کوئی بھی بغیر قراءۃ فاتحہ کے رکعت پڑھے گا تو اس کی نماز نہ ہوگی، الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو، امام بخاریؒ نے اس حدیث پر کوئی کلام بھی نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صحت بھی ان کو تسلیم ہے۔ اور یہی ساری امت کے سلف وخلف کا مسلک بھی ہے کہ ہر شخص پر نمازیں قراءت فاتحہ واجب ہے، مگر یہ وجوب خلف الامام مقتدی پر نہیں ہے، لہٰذا وجوب خلف الامام کا مسلک رد ہو جاتا ہے۔

آگے حضرت ابوالدرداء کی حدیث لائے ہیں، جس سے ثابت ہوا کہ ہر نماز کے لئے قراءت ضروری ہے، اور یہ بعینہ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے اور یہ امام بخاری وغیرہ کے خلاف ہے جو ہر رکعت کے لئے فاتحہ کو ضروری کہتے ہیں اور صرف قراءت کو کافی نہیں مانتے۔

آخر سے قبل حضرت عبادہ کی حدیث پھر لائے ہیں لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب، جس کے لئے حافظ ابن تیمیہ ودیگر اکابر محدثین کی رائے ہے کہ وہ قول عبادہ ہے، نبی کریم ﷺ کا ارشاد نہیں ہے۔ رسالہ کی آخری حدیث حضرت ابوہریرہؓ کی ہے کہ نماز بغیر فاتحہ اور کچھ زائد قراءت کے درست نہ ہوگی۔ یہ بھی حنفیہ کے مطابق ہے کہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کوئی سورت یا چند آیات پڑھنا ہر نماز کے لئے ضروری ہے اگر نہ پڑھے گا تو نماز کا اعادہ کرنا پڑے گا، الا یہ کہ امام کے پیچھے ہو تو اس پر قراءت فاتحہ اور ما زاد واجب نہیں ہے، کیونکہ امام کی

قراءت مقتدی کے لئے کافی ہے۔ **لقوله عليه السلام من كان له امام فقراءة الامام له قراءة**

امام بخاریؒ کا رسالہ ختم ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ نے درس بخاریؒ شریف میں فرمایا تھا کہ امام بخاریؒ نے صحیح میں چند احادیث ذکر کیں مگر وہ کوئی صریح حدیث تعیین فاتحہ خلف الامام کے لئے نہ لا سکے۔ اسی لئے ترجمۃ الاباب میں بھی اس کو نہ لائے اور مطلق قراءت کو لائے ہیں البتہ اپنے رسالہ ''جزءالقراءۃ میں خوب توسع سے کام لیا ہے، بلکہ اس موضوع فاتحہ خلف الامام سے ہٹ کر دوسرے مسائل حنفیہ پر بھی سخت ناقدانہ و جارحانہ کلام کیا ہے، جو ان کی شان رفیع کے مناسب نہ تھا ہم نے اوپر یہ بھی ہتلا دیا ہے کہ بہت سے مسائل میں امام بخاری نے جو نسبت امام صاحب یا حنفیہ کی طرف کی ہے، وہ صحیح بھی نہیں ہے۔

دلائل امام بخاری ایک نظر میں

ہم یہاں ان کے خاص دلائل کو ایک جگہ بھی کر دینا چاہتے ہیں، اور بیشتر یہی دلائل ونظریات اس دور کے غیر مقلدین کے بھی ہیں، اس لئے مختصر جواب بھی ساتھ ہی لکھ دیئے ہیں:۔

(۱) حدیث عبادہؓ: بخاری و مسلم میں جو حدیث حضرت عبادہؓ سے روایت کی گئی ہے وہ بالکل صحیح وقوی ہے، کہ نماز بغیر فاتحہ کے نہیں ہوتی، لیکن اس کو خود راویان حدیث مذکور اور امام احمد وغیرہ نے بھی صرف امام و منفرد کے حق میں قرار دیا ہے۔ مقتدی کو اس حکم میں شامل نہیں کیا ہے کیونکہ حضرت جابرؓ سے مرفوعاً و موقوفاً ثابت ہوا کہ کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے نہ ہوگی مگر جو امام کے پیچھے ہو (موطا امام مالک ترمذی وطحاوی) پھر ایک اور حدیث صحیح سے بھی ثابت ہو کہ **من كان له امام فقرائة الامام له قرائة** کہ مقتدی کے لئے امام کی قراءت کافی ہے (مصنف ابن ابی شیبہ، موطا امام محمد، مسند احمد ابن منیع وغیرہ) اور جہری میں ممانعت کے لئے سورۂ اعراف کی آیت اور حدیث مسلم **اذا قرأ فانصتوا** موجود ہے۔

حضرت عبادہؓ کی دوسری حدیث جس میں قراءۃ فاتحہ امام کے پیچھے بھی ثابت کی جاتی ہے، اس کو محمد بن اسحٰق نے روایت کیا ہے جو ضعیف ہے اور ابوداؤد میں مکحول وغیرہ سے روایت کی گئی ہے جو محمد بن اسحٰق سے بھی کم درجہ ہیں۔

(۲) حدیث ابی ہریرہؓ: مسلم وغیرہ میں یہ حدیث ہے کہ نماز بغیر فاتحہ کے ناقص و ناتمام رہتی ہے، اول تو اس سے نماز کا ناقص ہونا ثابت ہے، باطل و کالعدم ہونا ثابت نہیں، اس کو ہم نے پہلے تفصیل سے لکھا ہے۔ دوسرے یہ بھی منفرد و امام کے لئے ہے، تیسرے اس روایت میں بھی ثقہ راویوں نے **الاصلوٰۃ خلف الامام** کی زیادتی نقل کی ہے

(۳) حدیث جابر سے استدلال: امام بخاری نے فرمایا کہ استماع وانصات کا حکم قراءت نماز و خطبہ دونوں کے لئے ہے اور جب صحیح حدیث فعلی وقولی سے خطبہ کے وقت نماز پڑھنے کا حکم ثابت ہوا تو اسی طرح امام کے پیچھے قراءت کے لیے بھی یہی حکم ہونا چاہئے، اس کا جواب بھی پہلے لکھا گیا ہے اور حضرت مولانا عبداللہ خاں صاحب نے اس کی سند میں بھی کلام نقل کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں جو زیادتی محمد بن جعفر غندر نے بطور حدیث قولی روایت کی ہے، وہ ان کا تفرد ہے، جس کی طرف امام ابواؤد نے زاد کے لفظ سے اشارہ کیا۔ اور امام احمد نے تینوں اشخاص کی سند بیان کر کے غندر کے تفرد کا اظہار کیا ہے، (**قال محمد فی حدیثه ثم اقبل علی الناس**، مسند احمد) اس طرح دو راویوں کے مقابلہ میں یہ صرف ایک کی زیادتی ہے، اور غندر کے بارے میں حافظ ابن حجر نے لکھا کہ ان میں غفلت کی ملت ہے (تقریب) دوسرا نقص یہ کہ غندر نے سعید بن ابی عروبہ سے روایت کی ہے جو مدلس ہیں اور انھوں نے عنعنہ کیا ہے جبکہ مدلس کا عنعنہ مقبول نہیں ہوتا۔ تیسرے یہ کہ سعید مذکور کا حافظہ آخر عمر میں خراب ہو گیا تھا، اور محدث عبدالرحمٰن بن مہدی نے تصریح کر دی ہے کہ غندر نے سعید سے روایت اختلاط وخرابی حافظہ کے زمانہ میں کی ہے۔ چوتھے یہ کہ سعید ولید ابو بشر سے روایت کر رہے ہیں جبکہ بہ تصریح امام احمد ان

کو ابو بشر سے سماع ہی حاصل نہیں ہے۔ مولانا عبداللہ خاں نے لکھا کہ اگر حضرت الاستاذ علامہ عثمانیؒ کو ان روایتی اسقام پر تنبہ ہوتا تو وہ فتح الملہم ص ۴۱۸/۲ میں غندر والی قولی حدیث کی تصویب نہ فرماتے (نماز بوقت خطبہ ص ۴۷)

درحقیقت اپنے موضوع پر مولانا موصوف نے روایتی حدیثی تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے، اسلئے رسالہ مذکورہ ہر عالم کے لئے قابل مطالعہ ہے، اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ کا رسالہ فصل الخطاب امام بخاریؒ وغیرہ کے جواب میں محققانہ محدثانہ نقطہ نظر سے شاہ کار کا درجہ رکھتا ہے، نیز مولانا ظفر احمد صاحبؒ نے اعلاء السنن اور رسالہ فاتحہ میں اور مولانا سرفراز خاں صاحب صفدر دامت فیوضہم نے روایات موجبین و مانعین کا احصاء کر کے مدلل محدثانہ و ناقدانہ کلام کیا ہے۔ جزاہم اللہ خیر الجزاء۔

(۴) اثر مجاہد: امام بخاریؒ نے جزء القراءۃ میں حضرت مجاہد کا اثر پیش کیا کہ اگر امام کے پیچھے قراءت نہ کی تو نماز لوٹائے گا اول تو امام نے اس کی کوئی سند پیش نہیں کی اور بغیر سند کے ایسے اہم معاملہ میں کسی روایت کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ خصوصاً کتاب اللہ کی ممانعت اور احادیث کے مقابلہ میں۔ پھر قراءت بھی مجمل ہے، اس سے فاتحہ کیونکر مراد ہوگی؟ اور خود حضرت مجاہد سے ہی مروی ہے کہ آیت **اذا قری القرآن فاستمعوا له** نماز کے بارے میں اتری ہے۔ (کتاب القراءۃ بیہقی ص ۳۷) اور یہ بھی وہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے قرأۃ فی الصلوٰۃ کی حالت میں کسی انصاری نوجوان کی قراءت سنی تو یہ آیت **واذا قری القرآن** اتری تھی۔ (کتاب القراءۃ ص ۲۷) اس طرح تفصیل سے شان نزول بتلانے کے بعد بھی حضرت مجاہد کیونکر نماز لوٹانے کو فرما سکتے تھے؟! دوسرے یہ کہ امام احمدؒ کا قول المغنی سے نقل کردہ مشہور ہے کہ مقتدی کے ذمہ امام کے پیچھے قراءت کا واجب نہ ہونا اجماعی مسئلہ ہے اور امام احمدؒ یہ بھی فرما چکے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ امام کے پیچھے جہری نماز میں قراءت نہ کرنے سے نماز صحیح نہ ہوگی، (لہٰذا اعادہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور آپ کا یہ قول بھی پھر تازہ کر لیا جائے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ و تابعین اور اہل حجاز میں سے امام مالک، اہل عراق میں سے سفیان ثوری، اہل شام میں سے اوزاعی اور اہل مصر میں سے لیث بن سعد، ان میں سے کسی نے بھی نہیں کہا کہ امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے سے نماز باطل ہوتی ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ امام احمدؒ کے نزدیک یا تو مجاہد اور عبداللہ بن زبیر کا مبینہ فتوے بہ سند صحیح ثابت نہ تھا، یا اس کا وہ مطلب صحیح نہیں جو امام بخاری اور دوسرے اہل حدیث نے سمجھا ہے۔

(۵) اثر قاسم بن محمدؒ: امام بخاریؒ نے ان سے نقل کیا کہ بڑے بڑے لوگ امامت کا درجہ رکھنے والے امام کے پیچھے قراءت کرتے تھے، یہ اثر اس لئے حجت نہیں کہ اس کی سند میں اسامہ ہیں، جن کو امام احمد نے لیس بشئی اور نسائی نے لیس بالقوی بتلایا۔ ابو حاتم نے کہا کہ ان سے استدلال درست نہیں، امام یحییٰ بن سعید نے ان کو ضعیف سمجھ کر بالآخر مطلقاً ترک کر دیا تھا، امام یحییٰ بن معین نے فرمایا کہ ان کی احادیث کا محدثین نے انکار کیا ہے۔

امام دارقطنی نے کہا کہ جب انھوں نے عطاء عن جابر یہ روایت مرفوعاً بیان کی کہ ایام منیٰ کے چاروں دنوں قربانی جائز ہے (غیر مقلدین کا عمل اسی پر ہے) تو امام یحییٰ بن سعید نے فرمایا کہ تم گواہ ہو جاؤ کہ میں نے اس کی حدیث بالکل ترک کر دی ہے۔ دارقطنی نے یہ بھی لکھا کہ اسی حدیث کی وجہ سے امام بخاری نے بھی اس کو ترک کر دیا تھا۔ (تہذیب ص ۲۰۹/۱) غالباً امام بخاریؒ نے صرف صحیح بخاری کی حد تک ان کو ترک کیا ہوگا کیونکہ باہر تو وہ ان کی سند لائے ہیں۔ ممکن ہے یہاں ہمارے سب کے خلاف محاذ مضبوط تر کرنے کے لئے اس ضعیف تر راوی سے ہی فائدہ اٹھانا چاہا ہو۔ والعلم عند اللہ

پھر اس روایت میں بھی قراءت مبہم ہے، اس لئے قراءت فاتحہ کے لئے استدلال درست نہ ہوا۔ اور خود قاسم بن محمد سے یہ اثر منقول ہے کہ وہ غیر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے) موطأ امام مالکؒ) اور سری میں فاتحہ پڑھنے سے کوئی بھی نہیں روکتا۔

(۲) **فانتھی الناس من کلام الزہری کا جواب:** ۔ امام بخاریؒ نے جزاء القراءۃ ص ۱۳ میں نقد کیا کہ "حضور علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد کہ مجھ سے نماز کی قرائۃ میں کیوں منازعت کی جاتی ہے؟ سب لوگ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت سے رک گئے تھے"۔ یہ کلام زہری کا ہے یعنی حضرت ابو ہریرہؓ صحابی کا قول نہیں ہے،۔ کیونکہ امام اوزاعی نے کہا کہ امام زہری نے یہ بھی کہا کہ حضور کے ارشاد مذکور کے بعد سب لوگوں نے نصیحت پکڑ لی اور اس کے بعد جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت ترک کر دی۔

سب سے پہلے تو گذارش ہے کہ امام بخاریؒ نے موطأ امام مالک اور ابوداؤد دونوں کی روایت کے خلاف **فقال رجل نعم** کی جگہ **فقلنا نعم** نقل کیا ہے، اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءت کرنے والے بہت سے افراد تھے، حالانکہ وہ صرف ایک ہی شخص تھا، اور دوسرے سارے صحابہؓ نے قرائۃ نہیں کی تھی، چنانچہ حدیث مذکور سے محدثین نے چند فوائد اخذ کئے تھے (۱) جو لوگ حضور علیہ السلام کے پیچھے قراءت کرتے تھے، وہ آپ کے امر سے نہ کرتے تھے، اور نہ آپ کو اس کا علم تھا، ورنہ آپ کو اس سوال کی ضرورت نہ ہوتی کہ کیا کسی نے اس وقت میرے پیچھے قراءت کی ہے؟ (۲) سب صحابہ آپ کے پیچھے قراءت نہ کرتے تھے، کیونکہ حضور کے دریافت فرمانے پر صرف ایک شخص نہ بولتا، بلکہ دوسرے بھی کہتے کہ ہم نے قراءت کی ہے (مگر امام بخاریؒ نے **فقلنا نعم** کی روایت کر کے اس فائدہ کو مشکوک کر دیا ہے،) (۳) حضور علیہ السلام نے اس ایک شخص کی قراءت کو بھی پسند نہ فرمایا، اور آپ کی نکیر کے بعد سب ہی لوگ جہری میں قراءت خلف الامام سے رک گئے، اس کے بعد صحابہ کرام سری نمازوں میں بھی رک گئے ہوں گے، کیونکہ ایک روایت عبداللہ بن شداد سے اس طرح آئی ہے کہ ایک شخص نے عصر کی نماز میں حضور کے پیچھے قراءت کی، اور اس کو قریب والے صحابی نے اشارہ سے روکا، نماز کے بعد اس نے کہا کہ تو نے مجھے کیوں دبایا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ تیرے آگے تھے تو میں نے اس کو مکروہ سمجھا کہ تو حضور کے پیچھے قراءت کرے، ان دونوں کی گفتگو سن کر حضور علیہ السلام نے فرمایا، کی امام کی قراءت مقتدی کے لئے بھی ہے۔ یہ روایت مسند احمد بن منیع میں ہے اس کی سند شرط شیخین کے موافق ہے۔ اور کتاب الآثار امام محمدؒ میں بھی یہ روایت مفصلاً موجود ہے۔

غرض ایک بات تو یہی تحقیق طلب ہے کہ **فقال رجل نعم** اصح یا **فقلنا نعم**، واللہ تعالیٰ اعلم، اس کے بعد امام بخاری کا دوسرا نقد ہے کہ لوگوں کے قراءت سے رک جانے کی بات صحابی سے نہیں بلکہ تابعی زہری سے ہے۔

افادۂ انور: ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فصل الخطاب ص ۳۳ میں مستقل فصل میں اس کا محدثانہ جواب دیا ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ حدیث ابن اکیمہ لیثی والی ان احادیث صحیحہ میں سے ہے جن سے ترک قراءۃ فی الجہر یہ کا ثبوت ہوتا ہے، اس حدیث کی تصحیح ابو حاتم اور دوسروں نے بھی کی ہے، البتہ بعض ان حضرات نے تصحیح سے پہلوتہی کی ہے جو قراءت خلف الامام کو اختیار کر چکے ہیں اور ان کی فقہی رائے حدیث نبوی تک سرایت کر گئی ہے۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ امام بخاریؒ نے جزاء القراءۃ میں اعتراف کیا کہ حضور کی تنبیہ کے بعد لوگ غیر جہری نمازوں میں امام کے پیچھے دل دل میں پڑھنے لگے تھے، لہٰذا معلوم ہوا کہ مقابلہ جہری و سری نماز میں تھا یہ بات نہ تھی کہ حضور نے زور سے قراءت کرنے کو روکا تھا، لہٰذا پھر لوگ آہستہ پڑھنے لگے تھے، اور نہ یہ بات تھی کہ وہ فاتحہ کے علاوہ اور قراءت کرنے سے رکے تھے (وغیرہ تاویلات بعیدہ جو غیر مقلدین کرتے ہیں)

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک بات اس حدیث کے اثر کو کم کرنے کے لئے یہ بھی کہی گئی ہے کہ **فانتھی الناس** زہری (تابعی) کا کلام ہے، صحابی (ابو ہریرہؓ) کا نہیں ہے، حالانکہ ابوداؤد میں معمر سے بصراحت منقول ہے کہ یہ حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے اور نیچے کے راوی کا مقصد یہ ہے کہ زہری نے حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ بات نقل کی ہے۔

حضرتؒ نے اس بات کو اچھی طرح مدلل کیا ہے۔ بحث دقیق ہے مطالعہ کر لی جائے۔ اوجز ص ۲۴۹/۱ اور بذل ص ۵۷/۲ میں بھی

محققانہ بحث ہے، امام بخاری نے امام اوزاعی کی نقل عن الزہری سے فائدہ اٹھانے کی سعی کی ہے، حالانکہ سارے محدثین جانتے ہیں کہ انھوں نے امام زہری سے جتنی روایات کی ہیں وہ سب کمزور ہیں۔ اور معمر جتنی روایات زہری سے کرتے ہیں وہ سب قوی ہیں۔

یحییٰ وابن عبدالبر کا نقد

امام بخاری یحییٰ بن معین کو امام نقد رجال مانتے ہیں، اور یحییٰ نے کہا کہ اوزاعی زہری کے بارے میں لیس ھذاک ہیں، یعنی قوی نہیں (تہذیب ص۲۴۱/۶) علامہ ابن عبدالبرؒ نے لکھا کہ امام اوزاعی کی امام زہری اور یحییٰ بن ابی کثیر سے جملہ روایات ضعیف و کمزور ہیں (کتاب العلم ص۲۰۱) ان کے مقابلہ میں معمر اثبت الناس فی الزہری ہیں۔ لیکن ان کو امام بخاریؒ نے یہاں نظر انداز کرنا ہی بہتر خیال کیا ہوگا۔

احسن الکلام ص۱۴۱/۱ میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام بخاری نے جو امام اوزاعی کی طرف بات منسوب کی ہے، اس کی سند میں حسن بن صالح ہیں، جن کو امام نسائی نے لیس بالقوی (ضعیف) قرار دیا ہے۔ (میزان ص۲۲۳/۱) اس کے بعد علامہ ابن تیمیہ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔

علامہ ابن تیمیہ کا فیصلہ

اگر بالفرض فانتھی الناس الخ کو امام زہری کا مدرج ہی تسلیم کالیا جائے، تب بھی یہ اس بات کی ایک بہت بڑی وزنی دلیل ہوگی کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ امام زہریؒ اپنے وقت میں سنت وحدیث (اور سیر ومغازی واخبار زمانہ رسالت) کے بہت بڑے عالم اور امام تھے، قرائۃ کرنا ضروری ہوتا تو یہ مسئلہ امام زہری سے کیسے مخفی رہ سکتا تھا؟! لہٰذا جب امام زہری یہ فرماتے ہیں کہ جہری نمازوں میں لوگوں نے قراءت ترک کردی تھی تو یہ اس بات کی کھلی اور معقول دلیل ہے کہ صحابہ وتابعین امام کے پیچھے قراءت نہیں کیا کرتے تھے، اور اسی پر امام موصوف نے ان کو عامل پایا تھا۔ (فتاویٰ ص۱۴۵/۲)۔

حدیث بلا زیادۃ زہری بھی حجت ہے

صاحب احسن الکلام نے علامہ ابن تیمیہؒ کی عبارت نقل کر کے آخر میں لکھا:۔ فریق مقابل یہ بات اگر ہم تسلیم بھی کرلیں کہ وہ جملہ امام زہری کا مدرج ہے اور روایت مالی انازع القرآن پر ہی ختم ہو جاتی ہے (جیسا کہ امام لیث بن سعد وغیرہ کی روایت یہیں ختم ہو جاتی ہے) تب بھی یہ حدیث جمہور ہی کی دلیل ہے کیونکہ آں حضرت ﷺ کے پیچھے قراءت کرنے والا صرف ایک ہی شخص تھا، اور اس کو بھی آپ نے گوارہ نہ فرمایا، پہلے تو نماز سے فارغ ہوتے ہی فوراً سوال فرمایا کہ کس نے قراءت کی ہے؟ پھر اس شخص کے اقرار کرنے کے بعد "مالی انازع القرآن" کے جملہ سے اس کی قراءت پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی فرمایا، اس لئے اگر سرے سے جملہ فانتھی الناس نہ بھی ہو تو کیا تنبیہ مذکور کے بعد بھی صحابۂ کرامؓ سے یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ پھر بھی حضور علیہ السلام کے پیچھے قرائۃ کرتے رہتے، لہٰذا ظاہر ہے کہ جملہ مذکورہ ہو یا نہ ہو بہرصورت نتیجہ وہی صحیح ہو کر سامنے آتا ہے کہ پھر کسی نے بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کی ہوگی۔ وہو المقصود (احسن الکلام ۱۴۲/۱)

دلائل تارکین قراءت خلف الامام ایک نظر میں

(۱) قال تعالے جل ذکرہ:۔ واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وانصتوا" (اعراف) جمہور کا برامت کا فیصلہ ہے کہ یہ آیت قراءت خلف الامام کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ امام کی قرائۃ کے وقت مقتدیوں کا وظیفہ صرف استماع (کان لگا کر سننا) اور انصات (خاموشی) ہے۔

(۲) حدیث سنن (بروایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ) انما جعل الامام لیؤتم به الخ کہ امام اس لئے ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔ اس حدیث کو اصحاب السنن نے روایت کیا اور امام مسلم نے اس کی تصحیح کی ہے۔

(۳) حدیث بخاری و بیہقی وغیرہ کہ حضرت ابوبکرہ صحابی مسجد نبوی میں پہنچے تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام رکوع میں جا چکے تھے انہوں نے جلدی سے صف میں پہنچنے سے قبل ہی رکوع کر لیا تا کہ حضور علیہ السلام کے ساتھ رکوع پالیں، اور اس طرح آگے بڑھ کر جماعت میں شرکت کر لی۔ حضور علیہ السلام نے کیفیت معلوم کر کے فرمایا کہ تمہاری دینی حرص اور زیادہ ہو مگر آئندہ اس طرح نہ کرنا۔

حضور علیہ السلام نے ان کے رکوع میں شامل ہو جانے کو رکعت ملنے کے لئے کافی سمجھا اور رکعت لوٹانے کا حکم نہیں فرمایا اور ابوبکرہ نے فاتحہ وغیرہ بھی نہ پڑھی تھی، پھر بھی ان کی رکعت صحیح ہو گئی، اس سے سارے اکابر امت نے یہ بھی سمجھا کہ رکوع میں ملنے سے رکعت مل جاتی ہے، مگر امام بخاری نے ساری امت سے الگ ہو کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ رکوع میں ملنے سے رکعت نہ ملے گی کیونکہ اس کا قیام اور قراءت رہ گئی ہے۔ حضرت ابوبکرہ آخر میں اسلام لائے تھے۔ اس لئے یہ حضور علیہ السلام کا آخری فیصلہ ہے۔

لمحہ فکریہ: امام بخاری نے بخاری ص ۱۰۳۸ کتاب الحیل میں باب الھبۃ کے ایک مسئلہ پر لکھا کہ اس میں بعض الناس (امام ابوحنیفہؒ) نے رسول اکرم ﷺ کے فیصلہ کے خلاف رائے قائم کی ہے، اسی صفحہ پر حاشیہ میں اس طعن کا پورا جواب تحقیق والزامی درج ہے، اور ہم بھی انوار الباری میں اس کے موقع پر لکھیں گے، لیکن یہاں کیا صورت ہے وہ ابھی دیکھ لی جائے (۴) حضور علیہ السلام نے جو آخری نماز پڑھی ہے اور حضرت ابوبکرؓ سورۃ فاتحہ پڑھ کر اگلی سورۃ پڑھ رہے تھے، کہ آپ نے تشریف لا کر امامت فرمائی اور اسی جگہ سے قراءت فرمائی، جہاں تک حضرت ابوبکر پڑھ چکے تھے، یہ حدیث تمام کتب حدیث میں ہے، اس میں خود آپ نے بھی فاتحہ نہیں پڑھی، اور بغیر فاتحہ کے آپ کی رکعت کیسے صحیح ہو گئی، بتایا جائے!! جبکہ امام بخاری اور غیر مقلدوں کا اصرار ہے کہ بغیر فاتحہ کے کوئی رکعت نہیں ہوتی اور جس نماز میں فاتحہ نہ ہو وہ باطل اور کالعدم ہے۔

(۵) حدیث مشہور من کان له امام الخ کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قراءت کی ضرورت نہیں کیونکہ امام کی قراءت اس کے لئے بھی ہے۔ یہ حدیث مختلف طرق سے ثابت وصحیح ہے، موطا امام محمد، مسند احمد، مسند احمد بن منیع، مصنف ابن ابی شیبہ، سنن کبریٰ بیہقی ......، کتاب القراءۃ بیہقی، الجوہر النقی میں درج ہے۔ رجال کی ابحاث مطولات میں ہیں۔ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے بحث وتحقیق کے درمیان ص ۹۷ فصل الخطاب میں حافظ ابن تیمیہؒ کا حسب ذیل ارشاد نقل کیا:۔ فتاوی ابن تیمیہ میں ہے "کہ اگر حدیث "من کان له امام" مرسل بھی ہے، تو یہ ایسی مرسل ہے جس کی تائید ظاہر قرآن وسنت سے ہو رہی ہے، اور اس کے قائل جماہیر اہل علم صحابہ وتابعین بھی ہیں۔ پھر یہ کہ اس حدیث کا ارسال کرنے والا اکابر تابعین میں سے ہے، اور ایسی مرسل ائمہ اربعہ وغیرہم کے نزدیک بالاتفاق حجت ہوتی ہے"۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید افادہ کیا کہ حافظ ابن تیمیہ نے اپنے فتاوی میں یہ بھی لکھا ہے کہ امام احمدؒ کا مذہب مشہور سری نمازوں میں بھی امام کے پیچھے صرف استحباب قراءت ہے، وجوب نہیں ہے۔

امام بخاریؒ وغیر مقلدین کا موقف؟

جبکہ امام بخاری وابن حزم اور اس زمانہ کے غیر مقلدین جہری وسری سب ہی نمازوں میں امام کے پیچھے وجوب فاتحہ کے لئے مصر ہیں، اور دعوے کرتے ہیں کہ بغیر اس کے نماز باطل اور کالعدم ہوتی ہے پھر یہ کہ ہمارے زمانہ کے غیر مقلدین جو ہندوستان و پاکستان میں حنفیہ کی نمازوں کو باطل بتلاتے ہیں، ان کو یہ بھی تو کہنا چاہیئے کہ ساری دنیا کے متبعین ائمہ اربعہ کی ہی نمازیں باطل ہیں، اور خاص طور سے سعودی عرب اور حرمین شریفین کے لوگوں کی بھی، کہ نجد والے تو زیادہ تر امام احمد وابن تیمیہ وابن قیم کے متبع ہیں، اور یہ غیر مقلدین اپنے کو ان سے مسلک ومشرب میں قریب تر بتلا کر لاکھوں روپے کی سالانہ امدادیں بھی حاصل کرتے ہیں۔

(۶) حدیث موطا امام مالکؒ وترمذی شریف من صلی رکعة الخ کہ جو کوئی رکعت بغیر فاتحہ کے پڑھی جائے وہ درست نہ ہو گی۔ البتہ امام کے پیچھے صحیح ہو گی۔

(۷) موطا امام مالک و دارقطنی وغیرہ میں ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے جب سوال کیا جاتا کہ کیا امام کے پیچھے قراءت کی جائے؟ تو فرمایا کرتے تھے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قراءت کافی ہے۔ لیکن الگ پڑھے تو قراءت کرے۔ اور خود حضرت ابن عمرؓ بھی امام کے پیچھے قراءت نہ کرتے تھے۔ جس کا اعتراف امام بخاری کو بھی ہے۔

(۸) حدیث صحاح و سنن، قسمت الصلوٰۃ الخ سے بھی ثابت ہے کہ نماز کی حقیقت فاتحہ وقراءت سورۃ ہے اور اس کو پیش کرنے کا حق جماعت کی نماز میں صرف امام کو ہے۔ مقتدی خاموش ہوکر دربار خداوندی کی معروضات کو سنیں گے۔ اس کے بارے میں پوری تحقیق ہمارے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے رسالہ میں قابل دید ہے۔ اس کے ساتھ امام اعظمؒ کا مشہور واقعہ بھی تائید میں ہے کہ چند آدمی آپ کی خدمت میں قراءت خلف الامام ہی کے مسئلہ میں بحث و مناظرہ کے لئے پہنچے تھے تو امام صاحب نے فرمایا کہ تم میں سے ایک وکیل ہوکر مجھ سے کلام کرے، انھوں نے ایک کو وکیل بنالیا تو آپ نے فرمایا کہ زیر بحث مسئلہ تو حل ہوگیا، اس نے کہا کس طرح پر؟ آپ نے فرمایا کہ جس طرح تم سب کی طرف سے کلام کے لئے مقرر ہوئے ہو، اسی طرح امام صلوٰۃ بھی سب مقتدیوں کی طرف سے دربار خداوندی میں عرض و معروض کے لئے پیش ہوتا ہے، اور اس کا کلام وقراءت سب کی طرف سے کافی ہوتی ہے۔ اس پر وہ سب لوگ لاجواب ہوکر واپس ہوئے۔

(۹) حدیث ترمذی، ابوداؤد و ابن ماجہ وغیرہ "الامام ضامن و المؤذن موتمن" (امام ضامن وکفیل ہے اور مؤذن امانت دار ہے) سب جانتے ہیں کہ کسی کا ضامن وکفیل جب اس کی طرف سے قرضہ ادا کردیتا ہے تو قرض دار سبکدوش ہوجاتا ہے، اسی طرح امام صلوٰۃ بھی مقتدیوں کی طرف سے قراءت کا فرض ادا کر کے سب کو سبکدوش کردیتا ہے، یہی حدیث کا منشاء ہے۔

(۱۰) حدیث ابی داؤد وغیرہ فانتھی الناس عن القرائۃ والی جس پر امام بخاری کا اعتراض وجواب بھی اوپر گذرا ہے (۱۱) حدیث بخاری (عن ابن عباسؓ) کہ وہ حضور علیہ السلام کی نماز جماعت کے سامنے سے اونٹنی پر سوار گذر گئے، اور کسی نے ان پر نکیر نہیں کی، امام بخاریؒ نے اس حدیث پر عنوان وترجمۃ الباب باندھا کہ امام کا سترہ مقتدیوں کے لئے کافی ہے۔ علامہ عینی نے لکھا کہ ابن بطال اور ابوعمرؒ نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ اسی طرح قراءت کا مسئلہ بھی ہے)

حافظ ابن القیم کا ارشاد

حافظ ابن القیمؒ نے کتاب الروح ص ۱۶۶ میں لکھا: امام کی قراءت مقتدیوں کی قراءۃ ہے اور امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ ہے، اور مسئلہ قراءۃ خلف الامام کی تحقیق کے سلسلہ میں مزید لکھا کہ آں حضرت ﷺ نے مقتدیوں پر سے سجدہ سہو ساقط کردیا ہے بایں طور کہ امام کے پیچھے مقتدی کی بھول سے اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہوتا، یعنی جب امام کی نماز صحیح ہوگئی تو مقتدیوں کی بھی صحیح ہوگئی، اسی طرح آں حضرت ﷺ نے مقتدی پر سورۂ فاتحہ کا پڑھنا بھی ساقط کردیا ہے کیونکہ امام کا پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے (......) ہم نے آثار صحابہ وتابعین کا ذکر بخوف طوالت ترک کردیا ہے۔

نطق انور: آخر میں ہم حضرت شاہ صاحبؒ کے چند کلمات آخری درس بخاری شریف کے (مورخہ ۱۸۔ جون ۱۹۳۲ء) نقل کر کے بحث کو ختم کرتے ہیں:۔

فرمایا:۔ "میں اپنے رسالہ میں اول تو جواز فاتحہ سری میں بتلایا ہے حدیث کی روشنی میں۔ پھر یہ بتلایا ہے کہ نامرضی ہے جو برغبت خاطر عاطر نہیں ہے حضور علیہ السلام سے، لیکن اس درجہ کی بھی نہیں ہے کہ اس کے پیچھے پڑ جائیں جو قرائۃ کرے سری میں۔" پھر فرمایا:۔ "جہری میں دو چار ہی صحابہ سے قرائۃِ فاتحہ خلف الامام منقول ہے، اور سری میں ۲۰۔۳۰ صحابہ سے منقول ہے، اس لئے میں اس میں نرم ہوگیا ہوں"۔

یہ حضرتؒ کے بعینہ الفاظ ہیں جو درس کے وقت احقر نے قلمبند کئے تھے۔ چونکہ حضرتؒ کی تحقیق علومِ سلف وخلف کے پورے مطالعہ کے بعد ہوتی تھی، اس لئے آپ کے ایک ایک لفظ کی قدر ہوتی تھی۔ اور بقول حضرت تھانوی قدس سرہ آپ کے ایک ایک جملہ پر ایک رسالہ

لکھا جاسکتا ہے۔

ہم نے قرائۃ فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ پر کافی طویل بحث درج کردی ہے، صرف اس لئے کہ ایک صحیح مسلک کی تشریح و تحقیق بطور نمونہ کے سامنے آجائے۔ اور اس لئے کہ مقابل میں امام بخاری تھے ورنہ ہر جگہ اور ہر مسئلہ کی شرح و تحقیق کرنے سے بوجہ خوف طوالت معذوری ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

باب القرآءۃ فی الظہر

نماز ظہر میں قراءت کا بیان

۷۱۹: حدثنا ابو النعمان قال حدثنا ابو عوانہ عن عبدالملک بن عمیر عن جابر بن سمرۃ قال سعد کنت اصلی بھم صلوٰۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صلوٰتی العشی لآخرم عنھا کنت ارکد فی الاولیین واحذف فی الاخریین فقال عمر ذٰلک الظن بک

۷۲۰: حدثنا ابو نعیم قال حدثنا شیبان عن یحییٰ عن عبداللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ قال کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الرکعتین الاولین عن صلوٰۃ الظہر لفاتحۃ الکتاب وسورتین یطول فی الاولیٰ ویقصر فی الثانیۃ ویسمع الأیۃ احیاناً و کان یقرأ فی العصر بفاتحۃ الکتاب وسورتین و کان یطول فی الاولیٰ و کان یطول فی الرکعۃ الاولیٰ من صلوٰۃ الصبح ویقصر فی الثانیۃ

۷۲۱: حدثنا عمر بن حفص حدثنا ابی قال حدثنا الاعمش قال حدثنی عمارۃ عن ابی معمر قال سالنا خباباً اکان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الظہر والعصر قال نعم قلنا بای شیء کنتم تعرفون قال باضطراب لحیتہ

ترجمہ ۷۱۹: حضرت جابر بن سمرہ روایت کرتے ہیں، کہ سعد نے (حضرت عمرؓ سے بجواب اپنی شکایت کے) کہا، کہ میں کوفہ والوں کو (بعد دوپہر) شام کی دونوں نمازیں (ظہر و عصر) رسول خدا ﷺ کی نماز مثل پڑھاتا تھا، ان میں کسی قسم کا کوئی نقصان نہ کرتا تھا، میں پہلی دو رکعتوں میں دیر لگاتا، اور پچھلی دو رکعتوں میں تخفیف کرتا تھا۔ تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ تمہاری طرف میرا بھی یہی خیال ہے۔

ترجمہ ۷۲۰: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ نماز ظہر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور (کوئی اور) دو سورتیں پڑھتے تھے، پہلی رکعت میں بڑی سورت پڑھتے تھے، اور نماز صبح کی پہلی رکعت میں (بھی) بڑی سورت پڑھتے تھے اور دوسری رکعت میں (اس سے) چھوٹی سورت پڑھتے تھے۔

ترجمہ ۷۲۱: حضرت ابومعمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم نے خباب سے پوچھا کہ کیا نبی کریم ﷺ ظہر اور عصر (کی نماز) میں قرآن پڑھتے تھے، انہوں نے کہا، ہاں، ہم نے کہا، کہ تم کس طرح پہچان لیتے تھے، وہ بولے، کہ آپ کی داڑھی کی جنبش کی وجہ سے۔

تشریح: علامہ عینی نے لکھا کہ اس باب کی پہلی حدیث تو وہی ہے جو باب وجوب القرائۃ کے تحت آچکی ہے، اور امام بخاری کا مقصد اس باب سے بھی یہ تھا کہ قرائۃ کی رکنیت و فرضیت نہ صرف منفرد و امام کے لئے بلکہ مقتدی کے لئے بھی ثابت کردی جائے، حالانکہ ہم نے وہاں بھی (ص ۱۵۷/۳ میں) بتلایا تھا کہ امام بخاری کی بات منفرد و امام کے لئے سب کو تسلیم ہے لیکن مقتدی کے لئے صحیح نہیں، اور نہ احادیث

الباب سے اس کا ثبوت ہوسکتا ہے۔

یہاں بھی وہی بات ہے کہ امام بخاری ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی نماز کا حوالہ دے کر حضرت سعدؓ یہاں بھی وہی پہلی بات کہہ رہے ہیں مگر ان تینوں احادیث الباب سے بھی صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام چاروں رکعت میں قرائۃ کرتے تھے لیکن یہ بات کہ وہ قرائۃ بطور رکن وفرض کے تھی محلِ نظر ہے، اگر یہ کہا جائے کہ جب حضور علیہ السلام ہمیشہ ہی قرائۃ چاروں رکعت میں کرتے تھے، تو یہ صورت بظاہر رکن وفرض ہی کی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے امام بخاری کا استدلال درست ہوجانا چاہئے، تو اس سے استدلال اس لئے صحیح نہیں کہ حضور علیہ السلام سے مداومتِ عمل بہت سی سنن پر بھی ثابت ہے۔ مثلاً اذان واقامت وغیرہ کہ برابر حضور علیہ السلام کی نماز جماعت میں ان کا اہتمام ہوتا رہا ہے، لہٰذا دوامِ عمل وجوب وفرضیت یا رکنیت کے لئے دلیل وحجت نہیں بن سکتا، حضرت گنگوہیؒ نے یہ بھی لکھا کہ رکنیت کا ثبوت تو جب ہوسکتا ہے کہ چار رکعت میں سے مثلاً کسی ایک میں بھی قرائۃ رہ جائے تو نماز فاسد ہو۔ (عمدہ ولامع ص۱\۲۹۶)

امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ جزء القرائۃ ص۳۰ میں بھی مستقل **باب القرائۃ فی الظہر فی الاربع کلھا** قائم کیا ہے، اور یہاں بخاری میں بھی ظہر کے بعد عصر ومغرب کی نمازوں کے لئے باب لا رہے ہیں، اور ان تمام روایت کو پیش کر کے یہی تاثر دینا چاہتے ہیں کہ فرضوں کی ہر رکعت میں قرائۃ فرض ورکن ہونی چاہئے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام ہمیشہ پڑھتے تھے، حالانکہ ان کا مقصد اس طرح حاصل نہیں ہوسکتا۔

مذاہب کی تفصیل: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ امام زفر وحسن فرائض کی ہر رکعت میں قرأت کو فرض بتلاتے ہیں، حنفیہ دو رکعت میں۔ امام مالک تین میں اور امام شافعی چاروں میں فرض کہتے ہیں۔ حاشیۂ لامع میں یہ بھی ہے کہ امام مالکؒ سے متعدد روایات ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ہر رکعت میں واجب ہے مگر کسی رکعت میں سہواً رہ جائے تو نماز صحیح ہوجائیگی سجدۂ سہو کرنا ہوگا کما فی الباجی۔ (لامع ص۱\۲۹۶)۔

علامہ عینیؒ نے لکھا:۔ ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ **مصلی مامور بالقرائۃ** ہے بقولہ تعالیٰ **فاقرؤا ما تیسر منہ** اور امر مقتضی تکرار نہیں ہوتا لہٰذا پہلی رکعت اداءِ فرض کے لئے متعین ہوگی، اور دوسری رکعت میں پہلی کی مشاکلت من کل وجہ کے سبب سے قرائۃ ضروری قرار دی گئی ہے۔

علامہ نے مزید لکھا کہ کچھ حضرات نے تو نماز میں قرائۃ کو صرف استحباب ہی کا درجہ دیا ہے، جن میں احمر، اصم، ابن علی وحسن ہیں۔ اور امام مالکؒ سے بھی ایک شاذ روایت ہے کہ نماز بغیر قرائۃ کے صحیح ہوجائے گی، ابن ماجشون نے کہا کہ جس سے صبح کی یا اور کسی وقت کی نماز کی ایک رکعت میں قرائۃ رہ جائے تو نماز سجدہ سہو کرنے سے درست ہوجائے گی۔

امام بیہقیؒ نے حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت کی کہ نماز میں قرائۃ سنت ہے، امام شافعی کا قدیم قول یہ تھا کہ اگر بھول سے رہ جائے تو نماز درست ہوگی، مصنف میں بھی ہے کہ حضرت علی وابن مسعودؓ نے فرمایا:۔ پہلی دو رکعت میں قرائۃ کرو اور دوسری دو میں تسبیح۔ (یہ بات حضرت عائشہؓ سے بھی نقل ہوئی ہے) اسود، ابراہیم وثوریؒ سے بھی نقل ہوا کہ آخری دو رکعتوں میں تسبیح تحمید وتکبیر کافی ہے اور افضل قرائۃ ہی ہے۔ (عمدہ ص۳\۶۲)

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ کو چونکہ کوئی دلیل فاتحہ وسورت کے احکام میں فرق کرنے کے لئے نہیں ملی، تو بابِ سابق کی طرح یہاں بھی باب کے عنوان میں صرف قرائۃ کا لفظ لائے ہیں، جس میں فاتحہ اور دوسری سورتیں برابر ہیں، پھر فرمایا کہ پہلی اور تیسری حدیث الباب میں تو فاتحہ کا ذکر بھی نہیں ہے۔ تو کیا رکن کی شان یہی ہے کہ امام بخاری بغیر اس کے ذکر وصراحت کے ہی رکن ثابت کردیں گے؟! پھر یہ کہ اضطراب لحیہ سے تو قرائۃ بھی ثابت نہیں ہوتی، ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام تسبیح وتحمید فرماتے ہوں گے، لہٰذا ایسے الفاظ سے بھی مدعا ثابت نہیں ہوتا، نہ اس سے کوئی خاص فائدہ؟! اس سے استدلال ہوسکتا تو بڑے طمطراق دکھائے جاتے۔ البتہ ان امور کا فیصلہ تعامل وتوارث سے ہوتا ہے اور ہوا ہے، اور چونکہ اس کے ذریعہ سب ہی کو تسلیم ہے کہ قرائۃ ہوتی تھی، اس لئے اضطراب والی بات پر کوئی بحث ونظر یا قیل وقال کا بھی موقع نہ ہوا۔

غرض الفاظ رواۃ پر تکیہ کر کے بحثیں اٹھانے سے بہتر یہی ہے کہ فیصلہ کی بات تعامل پر ہی رکھی جائے۔ (حنفیہ کا خاص طریقۂ اثبات بھی یہی ہے کہ کتاب وسنت کے بعد آثار صحابہ وتابعین اور ان کے تعامل پر نظر کرتے ہیں) حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ یہ بات بڑے عجائب میں سے ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کی طرف عدمِ قرأۃ فی العصرین منسوب کردی گئی۔ قولہ **یطول فی الاولی** پر فرمایا: شیخین (امام ابوحنیفہ وامام ابو یوسفؒ) کا مذہب یہ ہے کہ سواء فجر کے سب نمازوں کی پہلی دو رکعتوں میں قرأۃ برابر ہو کہ استحقاق قرأۃ میں وہ برابر ہیں (فجر میں اس لئے پہلی رکعت میں قرأۃ زیادہ کرنا بہتر ہے کہ نیند وغفلت کا وقت ہے جتنے زیادہ لوگ جماعت میں شرکت کرسکیں اچھا ہے) امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ پہلی رکعت میں قرأۃ سب ہی نمازوں میں زیادہ ہو تو بہتر ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام سے نقل ہوا کہ آپ سب ہی نمازوں کی پہلی رکعت کو طویل کرتے تھے۔ شیخین کہتے ہیں کہ وہ طوالت بوجہ ثنا تھی، قرأۃ کی وجہ سے نہ تھی۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک امام محمدؒ ہی کے مسلک کو ترجیح ہے کیونکہ ابوداؤد میں احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام صبح اور ظہر وعصر کی بھی پہلی رکعت میں طوالت اختیار کرتے تھے جب تک کہ لوگوں کی آواز آتی رہتی تھی۔ اور حضرت ابوقتادہ نے فرمایا کہ ہم سمجھتے تھے کہ آپ یہ چاہتے تھے کہ لوگوں کو پہلی رکعت مل جائے۔ (بذل المجہود ص۱۴۳\۲) اس لئے اب بھی اگر لوگوں کے پہلی رکعت میں ملنے کی توقع ہو تو حدیث کے مطابق پہلی رکعت کو طویل کرنا بہتر ہے۔

باب القرآءۃ فی العصر

نماز عصر میں راءت کا بیان

۷۲۲: حدثنا محمد بن یوسف قال حدثنا سفیان عن الاعمش عن عمارۃ بن عمیر عن ابی معمر قلت لخباب بن الارت اکان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فے الظھر والعصر قال نعم قلت بای شی کنتم تعلمون قرآء تہ قال باضطراب لحیتہ

۷۲۳: حدثنا المکی بن ابراھیم عن ھشام عن یحیی بن ابی کثیر عن عبداللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ قال کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی الرکعتین من الظھر والعصر بفاتحۃ الکتاب سورۃ سورۃ ویسمعنا الأیۃ احیاناً

ترجمہ ۷۲۲:۔ حضرت ابومعمرؒ بیان کرتے ہیں کہ میں نے خباب بن ارت سے کہا کہ کیا نبی ﷺ ظہر اور عصر (کی نماز) میں قرآن مجید پڑھتے تھے، وہ بولے، کہ ہاں، میں نے کہا، کہ تم کس طرح آپ کا کا پڑھنا معلوم کر لیتے تھے، وہ بولے، کہ آپ کی داڑھی کی جنبش سے۔

ترجمہ ۷۲۳:۔ حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ ظہر اور عصر کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور کوئی ایک ایک دوسری سورت پڑھتے تھے، ور کبھی کبھی کوئی آیت ہمیں سنائی دی جاتی تھی۔

تشریح: یہ دنوں احادیث الباب پہلے باب میں بھی آچکی ہیں اور ظہر وعصر دنوں کے احکام یکساں ہیں۔ اس لئے مزید تشریح یا بحث کی ضرورت نہیں۔

قولہ **ویسمعنا احیانا** پر حضرتؒ نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ حنفیہ کے اس بارے میں متعدد اقوال ہیں کہ اگر کوئی سری نماز میں جہر کرلے تو سجدۂ سہو کتنی قرأۃ کرنے پر جواب ہوگا، ایک کلمہ کی قرأۃ سے) ایک پوری آیت سے اور کہا گیا کہ ایک سے زیادہ آیت پڑھنے پر واجب ہوگا۔ میرا اختار دوسرا قول ہے۔

پھر یہ کہ حضور علیہ السلام کا سری نمازوں میں کبھی کبھی جہر کے ساتھ کسی آیت کا سنانا تعلیمِ قرأۃ کے لئے تھا، تعلیم جہر کے لئے نہیں تھا

جیسا کہ ظاہر ہے، اور ہمارے نزدیک تسمیہ کا جہر بھی تعلیم ہی کے لئے تھا، لہٰذا وہ بھی سنت نہ ہوگا اور سری میں کسی آیت کا جہر سامنے سے گذرنے والے کو روکنے کے لئے بھی بہتر سمجھا گیا ہے۔

باب القرآءة فی المغرب

مغرب (کی نماز) میں قرآن پڑھنے کا بیان

۷۲۴: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن عبیدالله بن عبدالله بن عتبة عن ابن عباس انه' قال ان ام الفضل سمعته وهو یقراء والمرسلات عرفاً فقالت یابنی لقد ذکرتنی بقرآءتک هذه السورة انها لأخرما سمعت من رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرأبها فی المغرب

۷۲۵: حدثنا ابوعاصم عن ابن جریج عن ابن ابی ملیکة عن عروة بن الزبیر عن مروان بن الحکم قال قال بی زید بن ثابت مالک تقرأ فی المغرب بقصار وقدسمعت النبی صلی الله علیه وسلم یقرأ بطولی الطولیین

ترجمہ۷۲۴:۔ حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ (میری والدہ) ام فضل نے (ایک مرتبہ نماز میں) مجھے **والمرسلات عرفاً** پڑھتے سنا تو کہنے لگیں، کہ اے میرے بیٹے، تو نے یہ سورت پڑھ کر مجھے یاد دلا دیا کہ یہی آخری سورت ہے، جو میں نے رسول خدا ﷺ سے سنی کہ آپ اس کو مغرب میں پڑھتے تھے۔

ترجمہ۷۲۵:۔ مروان بن حکم روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے زید بن ثابتؓ نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم مغرب میں چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھتے ہو حالانکہ میں نے نبی کریم ﷺ کو دو بڑی سورتوں سے بھی بڑی سورتیں پڑھتے ہوئے سنا ہے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا:۔ مغرب کی نماز میں مختصر قرأتہ مستحب ہے، اس لئے یہاں جو سورۂ مرسلات پڑھنے کا ذکر ہے اس کو امام طحاویؒ نے اس پر محمول کیا کہ حضور علیہ السلام نے سورۂ مرسلات کا کچھ حصہ پڑھا ہوگا، پوری نہ پڑھی ہوگی۔

میرے نزدیک اگر پوری سورت بھی مان لی جائے تو کوئی حرج نہیں کیونکہ طویل قرأتہ بھی جائز ہے بشرطیکہ مقتدیوں پر بار نہ ہو اور ستارے اچھی طرح نہ نکل آئیں۔

میرا یہ خیال پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ حضور علیہ السلام اپنے مرضِ وفات کے دنوں میں مغرب کی نماز کے لئے بھی نکلے ہیں اور اس کی روایت نسائی میں موجود ہے، جس کی حافظ نے تاویل کر دی ہے کہ حضور علیہ السلام مسجد میں تشریف نہ لائے تھے بلکہ اپنے بیت اقدس کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ کی طرف نکلے تھے۔

اس موقع پر امام ابوداؤدؒ نے فرمایا کہ مغرب کی نماز میں طویل قرأتہ منسوخ ہوگئی ہے، حالانکہ آپ کی سورۂ مرسلات والی نماز مذکور مرض وفات کی تھی، اس کو منسوخ کیونکر کہہ سکتے ہیں البتہ امام طحاویؒ کی اصطلاحِ خاص کے لحاظ سے منسوخ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امام طحاوی نے رفع

---

[1] مقدمہ فتح الباری میں مروان سے روایت بخاری کی مدافعت میں حافظ نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کا قول نقل کیا کہ وہ حدیث کے بارے میں متہم نہ تھا اور یہی بات تہذیب و اصابہ میں بھی نقل کی لیکن تاریخ کبیر بخاری ص ۳۶۸\۳۱ میں ان کا قول یہ نقل کیا ہے کہ (باوجود خاندانی عداوت کے) میرا گمان ہے کہ مروان ہم لوگوں پر کوئی اتہام نہ لگائے گا، اس میں اس کی حدیث کے بارے میں کوئی توثیق نہیں ہے۔ اس پر تاریخ کبیر کے محشی علام نے بجا لکھا کہ دونوں جملوں میں بہت تراذق ہے اور اوپر کا جملہ مطبوعہ تاریخ والا اصلین میں ہے اور مسند احمد میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حافظ نے کیا بات تھی اور کیا نقل کر دی۔ ''مؤلف''

مقدمہ فتح الباری میں مروان سے روایت بخاری کی مدافعت میں حافظ نے حضرت عروہ ابن زبیرؓ کا قول نقل کیا کہ وہ حدیث کے بارے میں متہم نہ تھا اور یہی بات تہذیب و اصابہ میں بھی نقل کی لیکن تاریخ کبیر بخاری ص ۳۶۸\۳۱ میں ان کا قول یہ نقل کیا ہے کہ (باوجود خاندانی عداوت کے) میرا گمان ہے کہ مروان ہم لوگوں پر کوئی اتہام نہ لگائے گا، اس میں اس کی حدیث کے بارے میں کوئی توثیق نہیں ہے۔ اس پر تاریخ کبیر کے محشی علام نے بجا لکھا کہ دونوں جملوں میں بہت تراذق ہے اور اوپر کا جملہ مطبوعہ تاریخ والا اصلین میں ہے اور مسند احمد میں بھی اسی طرح ہے۔ اور حافظ نے کیا بات تھی اور کیا نقل کر دی۔ ''مؤلف''

یدین کومنسوخ کہہ دیا تھا توان پر ہر طرف سے رافعین نے اعتراضات کی بوچھاڑ کردی تھی، حالانکہ ان کا روئے سخن رفعِ یدین کو واجب قرار دینے والوں کی طرف تھا، اورانہوں نے وجوب کے نسخ کی بات کہی تھی جس سے نسخِ جواز لازم نہیں آتا تھا، نیز یہ کہ ان کے نزدیک نسخ بمعنی رفعِ شروعیت نہیں تھا، بلکہ کسی ایک امر کے بعد دوسرا امراس کے خلاف ثابت ہونے پر وہ نسخ کا اطلاق کیا کرتے تھے، جیسا کہ بہت سے مواقع میں ان سے ایسا ہی ثابت ہے، تو اسی اطلاق کے مطابق امام ابوداؤد کا نسخ فرمانا بھی درست ہوسکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

صحیح بخاری میں مروان کی روایت

حضرتؒ نے فرمایا کہ امام بخاری کی حدیث الباب میں مروان سے روایت ہے اور مجھے یہ بات اوپری معلوم ہورہی ہے کیونکہ مروان فتنہ پرداز، خونریزیوں کا باعث، اور حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سبب بنا ہے، اس کی غرض ہر جنگ میں یہ ہوتی تھی کہ بڑوں میں سے کوئی نہ رہے تاکہ خود صاحبِ حکومت بنے، جنگِ جمل کے واقعہ میں حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کون ہے جو حرمِ نبی پر دست درازی کرتا ہے؟ پھر کوئی آیا اوراونٹ کے تلوار ماری، جس سے عماری گرنے لگی اور حضرت علیؓ نے دیکھ کر فوراً پہنچ کر حضرت عائشہؓ کو گرنے سے بچایا، اور جنگ ختم ہوگئی۔ اور حضرت طلحہ وزبیر حدیثِ نبی اکرم ﷺ سن کر مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے مروان نے پیچھے سے جا کر حضرت طلحہ کو تیر مارا اور زخمی کردیا جس سے وہ شہید ہوئے، مروان کا مقصد یہ تھا کہ حضرت علیؓ سے جنگ جاری رہے۔ اور کوئی میدان سے نہ جائے۔

غرض مروان کے اندر حکومت کی طمع اور فتنہ پردازی اس قدر تھی کہ ٹھکانہ نہیں ہے اسی نے حضرت محمد بن ابی بکرؓ کے لئے بجائے **فاقبلوہ** کے **فاقتلوہ** لکھ دیا تھا۔ صرف اتنی بات اس میں تھی کہ حدیث میں اس سے جھوٹ ثابت نہیں ہوا، اسی لئے روایتیں لے لی گئی ہیں، تاہم امام مسلم نے اس سے کوئی روایت نہیں لی، اور حافظ ابن حجر نے جہاں دوسرے متکلم فیہم رواۃِ بخاری کی طرف سے جوابدہی کی ہے ص ۴۴۳ مقدمۂ فتح الباری میں لکھا کہ عروۃ ابن الزبیر نے کہا کہ وہ حدیث کے بارے میں مُتہم نہیں تھا۔ اس کی پیدائش یوم خندق یا یوم احد میں ہوئی تھی، امام بخاری نے لکھا کہ اس سے حضورِ اکرم ﷺ کی زیارت نہیں کی۔ طلبِ خلافت کے موقع پر مروان نے یہ بھی کہا تھا کہ ابن عمرؓ مجھ سے بہتر نہیں ہیں، لیکن وہ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں اوران کو شرفِ صحبت حاصل ہے، تہذیب میں حافظ نے لکھا کہ محدث اسماعیلی نے امام بخاری پر مروان سے حدیث لانے کی بنا پر نقد کیا ہے اور مروان کے بدترین کاموں میں سے حضرت طلحہؓ کو تیر مار کر شہید کرنا لکھا ہے جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے، پھر خلافت حاصل کرنے کے لئے خونریزی کی بھی مذمت کی ہے۔ حافظ نے لکھا کہ میں نے تخریج بخاری کے لئے مقدمہ فتح الباری میں معذرت پیش کی ہے کہ وہ حدیث میں مُتہم نہ تھا۔ (تہذیب ص۱۰\۹۱)

حضرت شاہ صاحبؒ نے مزید فرمایا کہ مقبلی نے جو زیدی تھے، کہا کہ امام بخاریؒ نے حنفیہ کے ساتھ فرطِ تعصب کی وجہ سے امام محمد ایسے حضرات سے بخاری میں حدیث نہیں لی اور رجالِ مجہولین سے روایات درج کی ہیں۔ پھر حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ اشتغال بالحدیث کی برکت سے مقبلی کی زیدیت ہلکی ہوگئی تھی۔

ہمارے مولانا عبداللہ خاں صاحب دام ظلہم نے اپنے رسالۂ خطبہ میں حافظ ابن حجرؒ کی اس دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہ حضرت سلیکؓ کے علاوہ حضرت ابوسعید خدریؓ کے عمل سے بھی نماز بوقتِ خطبہ ثابت ہے، اول تو مولانا نے فرمایا کہ سارے اہلِ مدینہ میں سے صرف ایک شخص کے عمل کو پیش کرنا ہی ان کے مسلک کی مرجوحیت کے لئے کافی ہے، دوسرے یہ کہ اس زمانہ میں مسجد نبویؐ کا خطیب مروان تھا، جو سلطنتِ نامرضیہ بنی امیہ کی جانب سے والی مدینہ تھا، مروان حکومتِ متسلطہ کا ایک رکن ہونے کے علاوہ خود بھی بڑا ظالم وجابر تھا، صحابۂ کرام کے ساتھ ان بدبخت حکام کا طرزِ عمل بے حد گستاخانہ تھا، حتیٰ کہ خطبوں میں دل آزار کلمات کہنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اوراپنے امراء کی

قصیدہ خوانی بھی کرتے تھے، اس لئے علماء کرام ان لوگوں کے خطبے سننا بھی پسند نہ کرتے تھے، اور غالباً حضرت ابوسعید خدریؓ نے مروان کا خطبہ سننے کی نسبت سے یہی بہتر سمجھا ہوگا کہ کچھ نماز ہی پڑھ لیں۔

اسی طرح سلیک کی نماز کے وقت تو حضور علیہ السلام نے خطبہ بند فرما دیا تھا، اس لئے ان کی نماز بوقتِ خطبہ نہ تھی اور مروان کے خطبہ کے لئے شرعی خطبہ کا حکم ہی بمشکل دیا جاسکتا تھا، اس لئے حضرت ابوسعید خدریؓ کی اس وقت کی نماز کو بطور دلیل پیش کرنا بے سود ہے۔ (نماز بوقت خطبہ ص ۶)

مولانا نے ص ۲۶ میں امام بخاریؒ کی جرح بابتہ عطاء خراسانی پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ امام بخاری کے یہاں جرح و توثیق میں قوتِ دلیل کا سوال نہیں بلکہ خود ان کے رجحانِ طبع پر فیصلہ ہے۔ قابلِ اعتماد سمجھ لیں تو مروان بن الحکم کو جس کی پیشانی پر اصحاب نبی ﷺ کے خون کا ٹیکہ لگا ہوا ہو، اور جس کو سفاکِ امت کہنا بھی بے جا نہیں، اور ضعیف سمجھ لیں تو راس التابعین حضرت اویس قرنیؒ کو جو ایسے خوش قسمت تھے کہ حضور علیہ السلام نے حضرت عمرؓ کی وساطت سے ان کو اپنا سلام دیا ہے، حافظ ذہبی نے امام بخاریؒ کے اس فعل پر اظہار افسوس کرتے ہوئے اس کو ان کی بے تکی حرکت قرار دیا ہے، اور لکھا کہ اگر امام بخاری ان کو ضعفاء میں ذکر نہ کرتے تو میں بھی اپنی اس کتاب میں ان کا ذکر نہ کرتا کیونکہ وہ تو اولیائے صادقین میں سے تھے۔ (میزان الاعتدال)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ مروان کی حدیث کو اگر حدیث کے بارے میں بھروسہ کر کے لے بھی لیا جائے، تب بھی ان کو ثقہ و ثبت تو نہیں مانا جاسکتا اور جس نے قبل کو خط میں قتل بنا دیا ہو، وہ کیسے ثقہ ہوسکتا ہے؟ امام اعظمؒ کی یہ عظیم منقبت یہاں یاد میں تازہ کر لی جائے تو اچھا ہے کہ وہ احادیث کی روایت صرف ثقہ متدین اور پرہیزگار لوگوں سے کرتے تھے، امام بخاری نے امام اعظم پر امت کے اندر خونریزی کرانے کا الزام دھرا تھا (کما فی جزء القرأۃ) کیا اکابرِ حنفیہ مروان سے بھی زیادہ قصوروار تھے، کہ سارے ہی ائمۂ حنفیہ اور کبار محدثین حنفیہ کو ترک کر کے مروان جیسوں سے صحیح بخاری میں روایات درج کیں۔ والی اللہ المشتکی. مروان کے بارے میں تاریخ کبیر امام بخاری کے حوالہ سے ایک اہم نوٹ ص ۱۱۰ میں گزرا ہے۔

احادیث بخاری سب صحیح ہیں

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ امام بخاری نے جو ضعیف و متکلم فیہ رواۃ سے صحیح میں احادیث درج کی ہیں، وہ سب بھی اس لئے صحیح و قوی ہیں کہ باہر سے ان کی متابعات و مؤیدات مل گئی ہیں، اور اسی لئے صحیح بخاری کی ساری ہی احادیث متلقی بالقبول ہو چکی ہیں۔ اس نقطہ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

امام اعظمؒ کی روایت کردہ احادیث اور شروطِ روایت

امام صاحبؒ نے اپنی کتاب الآثار کو چالیس ہزار صحیح احادیث میں سے منتخب کیا ہے اور فرماتے تھے کہ میرے پاس حدیثِ صحیح کے صنادیق بھرے ہوئے ہیں مگر میں نے ان میں سے تھوڑی احادیث نکالی ہیں جن سے لوگوں کو نفع ہو (مراد احادیثِ احکام ہیں)۔

امامِ حدیث وکیع کا بیان ہے کہ جیسی احتیاط امام ابوحنیفہؒ سے حدیث میں پائی گئی، کسی دوسرے سے نہیں پائی گئی۔ حافظِ حدیث علی بن الجعد جوہریؒ (استاذ امام بخاری و ابوداؤد) نے کہا کہ امام ابوحنیفہؒ جب حدیث بیان کرتے ہیں تو وہ موتی کی طرح آب دار ہوتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مبارک (ممدوحِ اعظم امام بخاریؒ) اور امامِ اہل سمرقند ابومقاتل نے امام اعظم کی مدح میں فرمایا کہ ”آپ نے روایتِ احادیث و آثار میں ایسی بلند پرڈازی دکھائی کہ جیسے شکاری پرندے بلند مقامات پر پرواز کر رہے ہوں۔ اور آپ نے ایسے معزز ین ثقات سے روایت کی جو بڑے وسیع علم والے اور معتمد مشائخ تھے۔ امام نقدِ رجال یحییٰ بن سعید القطان نے کہا کہ واللہ ابوحنیفہؒ اس امت میں خدا اور اس کے رسول ﷺ سے جو کچھ وارد ہے اس کے سب سے بڑے عالم تھے۔

امام ربانی شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے المیزان الکبریٰ میں لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ کسی حدیث رسول اللہ ﷺ پر عمل سے پہلے یہ شرط کرتے تھے کہ اس کو متقی لوگوں کی ایک جماعت صحابیِ رسول سے برابر نقل کرتی آئی ہو، اور خود امام صاحب نے بھی فرمایا کہ میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے لیتا ہوں جو ثقات کے ہاتھوں میں ثقات ہی کے ذریعہ شائع ہوئی ہوں۔ الخ

محدث سفیان ثوریؒ نے امام صاحب کے بارے میں کہا کہ جو حدیثیں ان کے نزدیک صحیح ہوتی ہیں اور ثقات جن کو روایت کرتے ہیں نیز جو آں حضرت ﷺ کا آخری فعل ہوتا ہے یہ اسی کو لیتے ہیں (امام ابن ماجہ اور علم حدیث اردو۔ ص ۱۶۴) امام اعظمؒ کی شروطِ روایت اور بھی کڑی ہیں، اور ان کو دیکھتے ہوئے، یہ تقریباً ناممکن ہے کہ مروان جیسے متکلم فیہ یا مجہول راویوں سے ان کے یہاں کوئی روایت مل سکے۔ کیونکہ کسی کا صرف صادق اللہجہ ہونا ان کے یہاں کافی نہ تھا، جب تک کہ اس میں زہد و ورع، تقویٰ وغیرہ نہ ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله یقرا بطولی الطولیین، اس سے مغرب کی نماز میں دو بڑی سورتوں سے بھی بڑی سورت پڑھنے کا ثبوت ملتا ہے، جو حسب روایت ابوداؤد سورۂ اعراف ہے، اس پر علامہ عینی نے لکھا کہ اس سے امام شافعیؒ کے خلاف دلیل ملتی ہے کہ ان کے نزدیک مغرب کا وقت صرف تین رکعت پڑھنے کی مقدار ہے، ظاہر ہے کہ مغرب میں حضور علیہ السلام نے سورۂ اعراف پڑھی تو اس میں کتنا وقت صرف ہوا ہوگا، علامہ کرمانی نے کہا کہ مراد بعض سورت ہوگی، اور امام طحاوی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ (عمدہ ص ۳۱۸۱)

باب الجهر فی المغرب

نماز مغرب میں بلند آواز سے پڑھنے کا بیان

۷۲۶: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن محمد بن جبیر بن مطعم عن ابیه قال سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم قرأ فی المغرب بالطور

ترجمہ ۷۲۶:۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو مغرب میں "والطور" پڑھتے سنا۔

تشریح: آگے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث آرہی ہے کہ حضور علیہ السلام جن نمازوں میں جہر سے قرائۃ کرتے تھے ہم بھی کرتے ہیں اور جن میں جہر نہیں کیا ہم بھی نہیں کرتے، لہٰذا معلوم ہوا کہ جہر و اسرار اتباعِ نبوی ہے، اسی لئے اگر امام جہر کی جگہ اسرار کرے یا بالعکس تو پوری ایک آیت یا زیادہ بھول کر پڑھنے پر سجدۂ سہو کرنا چاہئے، اور عمداً ایسا کرے گا تو خلافِ سنت کا مرتکب ہوگا۔

باب الجهر فی العشآء

نماز عشاء میں بلند آواز پڑھنے کا بیان

۷۲۷: حدثنا ابوالنعمان قال حدثنا معتمر عن ابیه عن بکر عن ابی رافع قال صلیت مع ابی هریرة العتمة فقرأ اذا السمآء انشقت فسجد فقلت له قال سجدت خلف ابی القاسم صلی الله علیه وسلم فلاازال اسجدبها حتیٰ القاه.

ترجمہ ۷۲۷:۔ حضرت ابورافعؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ عشا کی نماز پڑھی، تو انہوں نے اذا

السمـاء انشقـت پڑھی اور سجدہ کیا، میں نے ان سے کہا (کہ یہ آپ نے کیا کیا) بولے کہ میں نے ابوالقاسم ﷺ کے پیچھے (اس سورت کے اس مقام پر) سجدہ کیا ہے۔ لہٰذا میں ہمیشہ اس میں سجدہ کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ ان سے مل جاؤں۔

۷۲۸: حدثنا ابوالولید قال حدثنا شعبة عن عدی قال سمعت البرآء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان فی سفر فقرأ فی العشآء فی احدی الرکعتین بالتین والزیتون

ترجمہ ۷۲۸: عدی کا بیان ہے کہ میں نے حضرت براءؓ سے سنا کہ نبی کریم ﷺ کسی سفر میں تھے۔ تو آپ نے عشاء کی کسی ایک رکعت میں **والتین والزیتون** پڑھی۔

تشریح: اس باب میں اور سابق باب کے بارے میں بھی علامہ محدث ابن المنیر نے اعتراض کیا کہ مغرب وعشاء کی نماز میں جہرِ قرأۃ سب کے نزدیک اتفاقی مسئلہ ہے۔ پھر جب کوئی اختلافی صورت نہ تھی تو امام بخاری نے ان دونوں کے لئے باب کیوں قائم کئے؟ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ جواب دیا کہ امام بخاری کا مقصد تو بیانِ احکام ہے اگر اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں، تب بھی حکم بیان کرنا ہی تھا۔ (عمدہ وفتح الباری)

شاید علامہ ابن المنیرؒ نے اعتراض اس وجہ سے کیا ہو کہ انہوں نے دیکھا اکثر جگہ کچھ نہ کچھ اختلافی صورتیں ہی سامنے آئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی فقہی آراء کے مطابق صحیح کو مرتب کیا ہے، اس میں بہ کثرت مواضع میں دوسرے فقہاء کے خلاف بھی رائے قائم کی ہے، دوسرے یہ کہ اتنا اختلاف تو یہاں موجود ہی ہے کہ کتنے جہر یا اسرار پر سجدۂ سہو ہوگا؟ پھر معلوم نہ ہوسکا کہ امام بخاری کی اپنی رائے کیا ہے کسی نے اتنی کھوج نہیں لگائی، کیونکہ فقہ البخاری کو کسی نے مدون نہیں کیا، نہ اس کو اہمیت دی گئی۔ دوسری حدیث الباب میں ہے کہ پہلی رکعتِ عشاء میں حضور علیہ السلام نے والتین پڑھی، حافظؒ نے لکھا کہ دوسری میں انا انزلنا پڑھی تھی۔

باب القرآءة فی العشآء بالسجدة

(عشاء میں سجدے والی سورت پڑھنے کا بیان)

۷۲۹: حدثنا مسدد ثنا یزید بن زریع ثنا التیمی عن ابی بکر عن ابی رافع قال صلیت مع ابی ہریرة العتمة فقرأ اذا السماء انشقت فسجد فقلت ماھذہ؟ قال سجدت فیھا خلف ابی القاسم صلی اللہ علیہ وسلم فلا ازال اسجد فیھا حتیٰ القاہ

ترجمہ ۷۲۹:۔ حضرت ابورافعؓ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے (ایک مرتبہ) حضرت ابوہریرہؓ کے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی تو انہوں نے **اذا السمآء انشقت** پڑھی اور سجدہ کیا، میں نے ان سے کہا، کہ یہ کیا کیا؟ بولے، کہ میں نے اس سورت میں ابوالقاسم ﷺ کے پیچھے سجدہ کیا۔ لہٰذا میں اس میں ہمیشہ سجدہ کرتا رہوں گا، یہاں تک کہ آپ سے مل جاؤں۔

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سورۂ **اذا السمـاء انشقت** میں بھی سجدہ ہے، اس میں امام مالکؒ کے نزدیک سجدہ نہیں ہے، علامہ عینی نے لکھا کہ علامہ ابن المنیر نے جو لکھا کہ اس حدیث کو امام مالک کے خلاف حجت سمجھنا درست نہیں، کیونکہ ان کے مشہور قول سے تو فرض نماز میں کراہت معلوم ہوتی ہے اور یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، حضرت ابوہریرہؓ کا قول ہے، علامہ عینی اور حافظ نے بھی دوسری روایات پیش کر کے اس حدیث کا مرفوع ہونا ثابت کیا، اور لکھا کہ یہ سب احادیث امام مالکؒ کے خلاف ہیں۔ (عمدہ وفتح)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حنفیہ کے یہاں جو یہ فیصلہ ہے کہ سری نماز میں سجدۂ تلاوت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے محلِ نظر ہے، کیونکہ سجدہ افعالِ صلوٰۃ میں سے ہے، لہٰذا اس سے نماز فاسد نہ ہونی چاہئے، جس طرح اذکار اگر غیر محل میں ہو جائیں تو ان سے نماز فاسد نہیں

ہوتی، حالانکہ وہ بھی غیر محل و موضع میں غیر مشروع ہی ہیں، اسی طرح سجدہ کا حکم بھی ہونا چاہئے۔

باب القرآءة فی العشآء

عشاء (کی نماز) میں قراءت کا بیان

۷۳۰: حدثنا خلاد بن یحییٰ لنا مسعر ثنی عدی بن ثابت انہ سمع البرآء قال سمعت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یقرأ فی العشآء بالتین والزیتون وما سمعت احداً احسن صوتاً منہ او قرآءةً

ترجمہ ۷۳۰: حضرت براءؓ روایت کرتے ہیں، کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو عشاء (کی نماز) میں والتین والزیتون پڑھتے ہوئے سنا، اور میں نے آپ سے زیادہ خوش آواز یا اچھا پڑھنے والا نہیں سنا۔

تشریح: اس حدیث الباب کو امام بخاری مکرر لائے ہیں، نمبر ۷۲۸: پر گزر چکی ہے، البتہ اس میں جملہ **وما سمعت احد الخ** زائد ہے، حافظ نے لکھا کہ اس جملہ کی شرح اواخر کتاب التوحید میں آئے گی، مگر وہاں پہنچ کر ص ۱۳/۳۹۹ (باب قول النبی ﷺ **(الماهر بالقرآن الخ)** میں لکھ دیا کہ اس کی شرح ہم کتاب الصلوٰۃ میں کر آئے ہیں۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایسا حافظ سے بہت جگہ ہوا ہے کہ وعدہ کر گئے ہیں آگے بیان کرنے کا اور پھر ذکر کرنا غالباً بھول گئے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب یطول فی الاولیین ویحذف فی الاخریین

پہلی دو رکعتوں کو طویل کرے، اور پچھلی دو رکعتوں کو مختصر کرے

۷۳۱: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا شعبة عن ابی عون قال سمعت جابر ابن سمرة قال قال عمر لسعد لقد شکوک فی کل شیء حتی الصلوٰة قال اما انا فامد فی الاولیین واحذف فی الاخریین ولا آلو ما اقتدیت بہ من صلوٰة رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال صدقت ذاک الظن بک او ظنی بک

ترجمہ ۷۳۱: حضرت جابر بن سمرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سعدؓ سے کہا کہ کوفے والوں نے تمہاری ہر بات میں شکایت کی ہے، یہاں تک کہ نماز میں (بھی) سعدؓ نے کہا سنئے میں پہلی دو رکعتوں میں طول دیتا تھا، اور پچھلی دو رکعتوں میں اختصار کرتا تھا اور میں (ان کی شکایت کی کچھ) پروانہیں کرتا، جب کہ میں نے رسول خدا ﷺ کی نماز کی متابعت کی ہے، حضرت عمرؓ نے کہا، سچ کہتے ہو، تمہاری نسبت ایسا ہی خیال ہے، یا (یہ کہا کہ) میرا خیال تمہاری طرف (ایسا ہی ہے)۔

تشریح: امام بخاریؒ حضرت سعدؓ کے بارے میں سابق الذکر شکایت والی طوالت نماز والی حدیث کو یہاں مختصر کر کے اختلاف اسناد وغیرہ کی وجہ سے مکرر لائے ہیں۔

باب القرآءة فی الفجر وقالت ام سلمة قرأ النبی ﷺ بالطور

۷۳۲: حدثنا ادم قال حدثنا شعبة قال حدثنا سیار بن سلامة قال دخلت انا وابی علیٰ ابی برزة الاسلمی فسالناه عن وقت الصلوات فقال کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یصلی الظہر حین تزول

الشمس والعصر و یرجع الرجل الیٰ اقصی المدینة والشمس حیة ونسیت ماقال فی المغرب ولایبالی بتاخیر العشآء الیٰ ثلث الیل ولایحب الموم قبلها ولاالحدیث بعدها و یصلی الصبح فینصرف الرجل فیعرف جلیسه' وکان یقرأ فی الرکعتین اواحداهما ما بین الستین الی المائة

۷۳۳: حدثنا مسدد قال حدثنا اسمٰعیل بن ابراهیم قال اخبرنا ابن جریج قال اخبرنی عطآء انه' سمع اباهریرة یقول فی کل صلوٰة یقرأ فما اسمعنا رسول الله صلے الله علیه وسلم اسمعناکم ومآ اخفیٰ عنا اخفینا عنکم وان لم تزد علیٰ ام القراٰن اجزأت و ان زدت فهو خیر

ترجمہ۷۳۲: سیار بن سلامہ کا بیان ہے کہ میں اور میرے باپ حضرت ابو برزہ اسلمی کے پاس گئے اور ان سے نمازوں کے اوقات پوچھے، تو انہوں نے کہا کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی نماز جب آفتاب ڈھل جاتا تھا اس وقت پڑھتے تھے اور عصر کی ایسے وقت (پڑھتے تھے) کہ آدمی مدینہ کی انتہا تک لوٹ کر جا سکے، اور آفتاب میں زردی نہ آئی ہو (سیار کہتے ہیں) اور میں بھول گیا کہ، مغرب کے بارے میں ابو برزہ نے کیا کہا اور آپ عشاء کی تاخیر میں ایک تہائی رات تک کچھ پروانہ کرتے تھے، اور عشاء سے پہلے سونے کو اور اس کے بعد بات کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اور صبح کی نماز آپ (ایسے وقت) پڑھ لیتے تھے کہ آدمی فارغ ہوکر اپنے پاس والے کو پہچانتا تھا اور آپ دونوں رکعتوں یا ہر ایک میں ساٹھ آیتوں سے لے کر سو ۱۰۰ تک پڑھتے تھے۔

ترجمہ۷۳۳: حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں، کہ تمام نمازوں میں قرآن پڑھا جاتا ہے، جن (نمازوں) میں رسول خدا ﷺ نے (بلند آواز سے بڑھ کر) ہمیں سنایا (ان میں) ہم (بھی بلند آواز سے پڑھ کر) تم کو سناتے ہیں۔ اور جن میں (آہستہ آواز سے پڑھ کر) ہم سے چھپایا (ان میں) ہم (بھی آہستہ آواز سے پڑھ کر) تم سے چھپاتے ہیں، اور اگر سورۂ فاتحہ سے زیادہ نہ پڑھو، تو کافی ہے، اور اگر زیادہ پڑھ لو، تو بہتر ہے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا قولہ **وان لم تزد الخ** حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے، اگرچہ وہ بظاہر ان کے نزدیک استحباب سورۃ پر دال ہے، مگر مجھے یہ بات واضح ہوگئی کہ انہوں نے یہ بات مسبوق کے حق میں کہی ہے، کیونکہ موطأ امام مالک میں ہے (اوجز ص ۱۱۹\۱) حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے کہ جس کو رکعت کا رکوع مل گیا۔ اس کو اس کا سجدہ بھی مل گیا (رکعت پوری ہوگئی) لیکن ام القرآن کی قرأۃ رہ جانے سے وہ خیر کثیر سے محروم ہوگیا۔

حضرت شیخ الحدیث نے لکھا کہ حضرت ام سلمہؓ کے اثر مذکور ترجمۃ الباب کو امام بخاریؒ نے کتاب الحج باب طواف النساء میں موصول کیا ہے، جس میں ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے حضور علیہ السلام سے اپنی بیماری کا عذر کیا تو آپ نے اجازت دی کہ لوگوں کے طواف کرنے کی جگہ سے باہر باہر سوار ہوکر طواف کرلیں۔ پھر یہ کہ اس میں بھی نماز صبح کا ذکر نہیں ہے مگر اس کے چھٹے باب کے بعد **اذا اقیمت الصلوٰة للصبح** وارد ہے، اور ابن خزیمہ نے جو اپنی حدیث میں عشاء کا ذکر کیا ہے، وہ شاذ ہے الخ۔ (الابواب والتراجم ص ۲۸۵\۲)

حافظ ابن حجرؒ نے لکھا کہ حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کے ساتھ ضم سورت صرف مستحب و افضل ہے، جو جمہور کا قول ہے اور وجوب کا قول بھی بعض صحابہ سے ثابت ہوا ہے جیسا کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ سے اور اسی کے قائل بعض حنفیہ و ابن کنانہ بھی ہیں مالکیہ میں سے، اور امام احمدؒ سے بھی ایک روایت ہے۔ (فتح الباری ص ۱۷۱\۲)

علامہ عینیؒ نے لکھا کہ اس حدیث سے شافعیہ نے ضم سورت کے استحباب پر استدلال کیا ہے اور ہمارے اصحاب و ابن کنانہ مالکی و امام احمد سے وجوب نقل ہوا ہے کیونکہ اس بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں، پھر علامہ نے وہ احادیث نقل کیں جن میں فاتحہ کے ساتھ دما

تیسر اور سورۃ معہا وغیرہ الفاظ وارد ہیں۔ (عمدہ ۳\۱۹۱)

باب الجهر بقرآء ة صلوٰة الفجر وقالت ام سلمة طفت ورآء الناس والنبی صلے الله علیه وسلم یصلی یقرأ بالطور

۷۳۴: حدثنا مسدد قال حدثنا ابوعوانة عن ابی بشر عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ قال انطلق النبی صلے الله علیه وسلم طآئفة من اصحابه عامدین الیٰ سوق عکاظ وقد حیل بین الشیاطین و بین خبر السمآء وارسلت علیهم الشهب فرجعت الشیاطین الیٰ قومهم فقالوا مالکم قالوا حیل بیننا و بین خبر السمآء وارسلت علینا الشهب قالوا ماحال بینکم و بین خبر السمآء الاشی حدث فانصرف اولٰٓئک الذین توجهوا نحو تهامة الی النبی صلے الله علیه وسلم وهو بنخلة عامدین الیٰ سوق عکاظ وهو یصلی باصحابه صلوٰة الفجر فلما سمعوا القران استمعوا لهٗ فقالو اهذا والله الذی حال بینکم و بین خبر السمآء فهنالک رجعوآ الیٰ قومهم قالوا یقومنآ انا سمعنا قراناً عجباً یهدیٓ الی الرشد فاٰمنابه ولن نشرک بربنا احداً فانزل اللّٰه علیٰ نبیه صلے الله علیه وسلم قل اوحی الیٰ وانما اوحی الیه قول الجن

۷۳۵: حدثنا مسدد قال حدثنا اسماعیل قال حدثنا ایوب عن عکرمة عن ابن عباسؓ قال قرأ النبی صلے الله علیه وسلم فیما امروسکت فیمآامر وماکان ربک نسیاً ولقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة

ترجمہ ۷۳۴: حضرت ابن عباس روایت کرتے ہیں، کہ (ایک دن) نبی کریم ﷺ اپنے چند اصحاب کے ساتھ سوق عکاظ کی طرف ارادہ کر کے چلے، اور (اس وقت) شیاطین کو آسمان کی خبریں لانے سے روک دیا گیا تھا، اور ان پر شعلے پھینکے جاتے تھے، پس شیاطین اپنی قوم کے پاس لوٹ کر آئے، قوم نے کہا، تمہارا کیا حال ہے؟ (اب کی مرتبہ کوئی خبر نہیں لائے) شیاطین نے کہا کہ ہمارے لئے آسمان تک جانا ممنوع کر دیا گیا، اور (اب) ہمارے اوپر شعلے پھینکے جاتے ہیں، قوم نے کہا، کہ تمہارے آسمان تک جانے کی رکاوٹ کی (کوئی خاص ایسی نئی) وجہ پیدا ہوئی ہے، جو حال ہی میں ظاہر ہوئی ہے۔ لہٰذا زمین کے مشرق اور مغرب کی تمام جوانب میں سفر کرو اور دیکھو، وہ کیا چیز ہے جس نے تمہارے اور آسمانی خبر کے درمیان رکاوٹ ڈال دی (چنانچہ وہ لوگ اس تلاش میں نکلے) تو جو لوگ (ان میں سے) تہامہ کی طرف آئے تھے، وہ نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ (اس وقت مقام) نخلہ میں سوق عکاظ جا رہے تھے (چنانچہ جب یہ جنات وہاں پہنچے ہیں تو) آپ (اس وقت) اپنے اصحاب کے ہمراہ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، جب ان جنوں نے قرآن کو سنا، تو اس کو سنتے رہے۔ اور کہنے لگے، کہ خدا کی قسم یہی ہے جس نے تمہارے اور آسمان کی خبر کے درمیان میں رکاوٹ ڈال دی ہے، پس وہیں سے اپنی قوم کے پاس لوٹ کر گئے، تو کہنے لگے، کہ اے ہماری قوم (کے لوگو!) ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے، پس ہم اس پر ایمان لے آئے، اور (اب) ہم ہرگز اپنے پروردگار کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ پر یہ آیتیں نازل فرمائیں قل اوحی الی، اور آپ پر جنوں کی گفتگو نقل کی گئی۔

ترجمہ ۷۳۵: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو جن نمازوں میں (جہر کا) حکم دیا گیا، ان میں آپ نے قرائۃ کی، اور جن میں (خاموشی کا) حکم دیا گیا، ان میں سکوت کیا اور تمہارا پروردگار بھولنے والا نہیں ہے (کہ بھولے سے کوئی غلط حکم دے دے) اور یقیناً تم لوگوں کے لئے رسول اللہ (کے افعال واقوال) میں ایک اچھی پیروی ہے۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ ابن رشید نے کہا حدیثِ ام سلمہ میں جہر کی صراحت نہیں ہے تاہم ان کے اس قول

ہے کہ میں نے لوگوں کے پیچھے سے طواف کیا، جہر کی بات نکلتی ہے۔ کیونکہ اگر قرائۃ سری ہوتی تو اتنی دور سے نہ سن سکتی تھیں۔ اسی طرح حدیث ابن عباسؓ میں بھی اگرچہ جہر کی صراحت نہیں ہے مگر جنوں کی قرائۃ سننے سے معلوم ہوا کہ حضور جہری قرأت فرمارہے تھے۔ (الابواب ص۲۸۶\۲)

افاداتِ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی حدیث الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوں کے اوپر جاکر خبریں لانے پر پابندی اور ارسالِ شہب کا سلسلہ حضور علیہ السلام کی نبوت کے زمانہ میں شروع ہوا ہے، حالانکہ ستاروں سے ان کو مار بھگانے کا سلسلہ شروع زمانہ سے ہی رہا ہے، اس کا جواب جیسا کہ حاشیۂ بخاری میں علامہ کرمانی سے منقول ہے یہ کہ پہلے سے بھی ایسا ضرور تھا مگر کم تھا، اور حضور کے زمانہ میں زیادہ ہوا اور شدید بھی ہوگیا۔ یہ کتب سیر میں بھی ہے کہ شروع بعثت میں کثرت ہوئی ہے رجمِ شیاطین بالشہب کی۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ بظاہر سیاقِ قصہ سے معلوم ہوا کہ ارسالِ شہب اور جنوں کا زمین میں تلاش و جستجو کے لئے پھیل جانا ایک ہی زمانہ میں ہوا ہے، حالانکہ یہ بات اوائلِ نبوت کی تھی اور ارسالِ شہب اس سے بہت بعد کو ہوا ہے۔

سائنس جدید اور شاہ صاحب رحمہ اللہ

اس کے بعد یہ سوال ہے کہ وہ شہب، نجوم و ستارے ہی ہیں یا دوسری چیز؟ اس میں تحقیق یہ ہے کہ یہ نجوم بعینہا ہیں، اور بطلیموسی ہیئت کی باتیں اب غلط ہو چکی ہیں، کیونکہ جدید سائنس اور ہیئت مشاہدہ پر مبنی ہے اور اجسام اثریہ میں خرق والتسام بھی ثابت ہو چکا ہے اور مشاہدہ ہوا کہ ستارے بنتے اور ٹوٹتے ہیں، گرتے بھی ہیں اور ان کے ٹکڑے ملے بھی ہیں جو پہلے ممنوع سمجھا جاتا تھا۔ اب دوربینی مشاہدہ سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ آفتاب کے اندر ہزار ہا فرسنگوں کے اونچے پہاڑ اور ہزار ہا فرسنگوں کے غبشات (گڑھے) بھی ہیں کیونکہ دوربینوں سے کبھی بڑے گڑھے سامنے آئے اور کبھی اونچے پہاڑ۔ یہ سب مشاہدہ کی چیزیں ہیں جواب معلوم ہوئی ہیں۔ اس طرح ارسطو کی ہفوات سب بیکار ہو گئیں، جو آفتاب وغیرہ کے متعلق تھیں۔

حضرتؒ نے جو سائنس جدید کے مشاہدات کا یہاں ضمنی تذکرہ فرمایا، اس سے زیادہ تفصیل سے ان کا ذکر مع دیگر معلومات جدیدہ ''نطقِ انور'' ص۱۶۴ تا ص۱۷۰ میں۔ سے ملاحظہ کی جائیں۔ اس میں سورج اور نظامِ شمسی اور کہکشاں کا بھی ذکر ہے، اور سورج کے اندر ہزار ہا فرسنگوں کے پہاڑ اور غاروں پر حیرت نہ کی جائے، کیونکہ سورج کا قطر ۸ لاکھ ۶۶ ہزار میل کا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کا پورا حجم کتنا ہوگا، کیونکہ وہ زمین سے ۱۳ لاکھ گنا بڑا ہے، اور زمین سے سورج کا فاصلہ ۹ کروڑ ۲۹ لاکھ میل ہے۔

نظامِ شمسی اور کہکشاں

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ نظامِ شمسی ہمارے کہکشاں کا ایک نہایت حقیر جزو ہے، جس کے ساتھ صرف چالیس سیارے ہیں، جن کی وجہ سے نظامِ شمسی بولا جاتا ہے اور ہمارے کہکشاں کے اندر سورج کی طرح سے تقریباً ایک کھرب ثوابت و سیارے اور بھی ہیں اور ہمارے کہکشاں کے علاوہ اور بھی بہت سے کہکشاں ہیں، جن کی ریسرچ ہو رہی ہے، اور سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس طرح کے لاتعداد کہکشاں خلاء کی لامتناہی وسعتوں میں بکھرے ہوئے ہیں (اور وہ سب زمین و آسمان کے درمیان واقع ہیں)۔

ایک کہکشاں سیدیم اینڈرومیدہ دریافت ہوا ہے جو ہم سے ۸ لاکھ ۵۰ ہزار نوری سال دور ہے۔ اور اس کا قطر ۴۵ ہزار نوری سال ہے۔

نوری سال: روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، اس رفتار سے روشنی ایک سال میں جو فاصلہ طے کرتی ہے اسی نوری سال کہتے ہیں۔

سائنس جدید اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ

حضرت استاذ الاساتذہ مولانا نانوتوی قدس سرہٗ نے حجۃ الاسلام میں معجزۂ شق القمر پر بحث فرماتے ہوئے سائنس جدید کی تحقیقات کو مان کر جوابدہی فرمائی ہے اس کی تفصیل بھی نطق انور ۱۵۶ میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

قولہ وانما اوحی الیہ قول الجن پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ حضور علیہ السلام کو جنوں کی آمد اوران کی تلاوت مبارکہ سننے کی خبراس وقت نہ ہوئی تھی مگر مسلم شریف باب سجدۃ التلاوۃ میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ ایک درخت نے جو قریب ہی تھا، حضور علیہ السلام کو اس واقعہ کی خبر دے دی تھی۔ یہ بخاری کی تفسیر میں بھی ہے اور مفسرین نے حضرت ابن مسعودؓ کے قول پر اعتماد کیا ہے کیونکہ وہ حضرت ابن عباسؓ سے عمر میں بھی بڑے ہیں اور شاید ابن عباسؓ کی اس واقعہ کے وقت تک پیدائش بھی نہ ہوئی تھی۔

پھر فرمایا کہ اسنادِ مسلم میں حضرت معن بھی ہیں جو حضرت ابن مسعودؓ کے بھتیجے ہیں، اوران کے بیٹے قاسم امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کی خدمت میں کافی مدت رہے ہیں، اس سے اندازہ کیا جائے کہ امام اعظم کی قدر ومنزلت کتنی رفیع تھی کہ حضرت ابن مسعودؓ کے اتنے قریبی عزیز ان سے دینی وعلمی استفادہ کرتے تھے۔

علامہ عینی اور وجود جن کی تحقیق

علامہ نے عمدہ ص ۳\۱۹۶ میں وجودِ جن پر اکابرِ امت کے افادات اور مکمل تحقیق درج کی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

باب الجمع بین السورتین فی رکعۃ والقرآءۃ بالخواتیم وبسورۃ قبل سورۃ و باول سورۃ ویذکر عن عبداللہ بن السآئب قرأ النبی صلے اللہ علیہ وسلم المؤمنون فی الصبح حتیٰ اذاجآء ذکر موسیٰ و ہارون اوذکر عیسیٰ اخذتہ سعلۃ فرکع وقرأ عمر فی الرکعۃ الاولیٰ بمائۃ و عشرین اٰیۃ من البقرۃ وفی الثانیۃ بسورۃ من المثانی وقرأالاحنف بالکہف فی الاولیٰ و فے الثانیۃ بیوسف او یونس وذکر انہٗ صلے عمر الصبح بہما وقرأ ابن مسعود باربعین اٰیۃً من الانفال وفے الثانیۃ بسورۃ من المفصل وقال قتادۃ فیمن یقرأ بسورۃ واحدۃ فی رکعتین اویردد سورۃً واحدۃً فی رکعتین کل کتاب اللہ عزوجل وقال عبیداللہ عن ثابت عن انسؓ کان رجل من الانصار یؤمہم فی مسجد قبآء وکان کلما افتتح سورۃ یقرأبہا لہم فی الصلوٰۃ مما یقرأبہ افتتح بقل ہواللہ احد حتیٰ یفرغ منہا ثم یقرأ بسورۃ اخریٰ معہا وکان یصنع ذٰلک فی کل رکعۃً فکلمہ اصحابہ وقالوا انک تفتتح بہٰذہ السورۃ ثم لاتریٰ انہا تجزئک حتیٰ تقرأ باخریٰ فاماتقرأبہا و اما ان تدعہا وتقرأباخریٰ فقال مآانا بتارکہا ان احببتم ان اؤمکم بذٰلک فعلت و ان کرہتم ترکتکم وکانوا یرون انہٗ من افضلہم وکرہوآ ان یؤمہم غیرہٗ فلمآ اتٰہم النبی صلے اللہ علیہ وسلم اخبروہ الخبر فقال یافلان مایمنعک ان تفعل مایامرک بہٖ اصحابک ومایحملک علیٰ لزوم ہذہ السورۃ فے کل رکعۃ فقال انی احبہا قال حبک ایاہآ ادخلک الجنۃ

(ایک رکعت میں دوسورتوں کے ایک ساتھ پڑھنے اور سورتوں کی آخری آیتوں اور ایک سورت کا قبل ایک سورت کے، اور سورت کی ابتدائی آیتوں کے پڑھنے کا بیان، عبداللہ بن سائب سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صبح (کی نماز) میں سورۂ مومنوں پڑھی) یہاں تک کہ جب آپ حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر پہنچے تو آپ کو کھانسی آگئی، اور آپ نے رکوع کردیا، حضرت عمرؓ نے پہلی رکعت میں ایک سو بیس آیتیں سورہ بقرہ کی اور دوسری رکعت میں

ایک سورت مثانی کی پڑھی، اور احنف نے پہلی رکعت میں سورۂ کہف، اور دوسری میں سورہ یوسف یا یونس پڑھی، اور بیان کیا کہ میں نے حضرت عمرؓ کے ہمراہ صبح کی نماز ان ہی دونوں سورتوں کے ساتھ پڑھی ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ نے (پہلی رکعت میں) انفال کی چالیس آیتیں اور دوسری رکعت میں ایک سورت مفصل کی پڑھی، حضرت قتادہؓ نے اس شخص کے بارے میں جو ایک سورت کو (دو حصہ کر کے) دو رکعتوں میں پڑھے، یا ایک ہی سورت پوری پوری دونوں رکعتوں میں پڑھے، یہ کہا، کہ یہ سب اللہ عزوجل کی کتاب ہے (جس طرح چاہو پڑھو) اور عبید اللہ نے ثابت سے انہوں نے حضرت انسؓ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک انصاری شخص مسجد قبا میں انصار کی امامت کیا کرتا تھا، اس کی عادت تھی کہ جن نمازوں میں قرائۃ (بلند آواز سے) کی جاتی ہے، ان میں جب وہ کوئی سورت شروع کرنا چاہتا کہ ان کے آگے پڑھے، تو قل ھو اللہ احد سے شروع کرتا، اس کو پڑھ کر پھر کوئی دوسری سورت اس کے ساتھ پڑھتا، وہ ہر . میں یہی کیا کرتا تھا اس کے ساتھ والوں نے اس سے (اس سلسلہ میں) گفتگو کی، اور کہا، کہ تم اس سورت سے ابتدا کرتے ہو، پھر تم یہ نہیں سمجھتے کہ یہ تمہیں کافی ہے، یہاں تک کہ دوسری سورت پڑھتے ہو، پس یا تو تم اسی کو پڑھو، (دوسری سورت نہ ملاؤ) اور یا اس کو چھوڑ دو، اور دوسری سورت پڑھا کرو، وہ شخص بولا کہ میں اس کو نہ چھوڑوں گا، اگر تم اسی کے ساتھ مجھے اپنا امام بنانا چاہو، تو خیر، ورنہ میں تم لوگوں کی امامت چھوڑ دوں گا، اور وہ ان سب سے افضل ہے، اور وہ اس بات کو اچھا نہ سمجھے، کہ کوئی اور ان کا امام بنے، پس جب نبی کریم ﷺ (حسب معمول) ان کے پاس تشریف لے گئے، اور ان لوگوں نے یہ کیفیت آپؐ سے بیان کی، آپؐ نے فرمایا کہ اے فلاں تمہیں اس سے کون چیز مانع ہے کہ تم وہی کرو، جو تمہارے اصحاب تم سے کہتے ہیں، اور تمہیں ہر رکعت میں اس سورت کے لازم کرنے پر کس بات نے آمادہ کیا ہے؟ وہ شخص بولا، کہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں، آپؐ نے فرمایا کہ اس کی محبت تمہیں جنت میں داخل کر دے گی۔

ف: قرآن مجید کی سورتوں کو باعتبار تعداد آیات کے علماء نے چار قسمیں کر دی ہیں، جن میں سو آیتوں سے زیادہ ہیں، ان کو طوال کہتے ہیں، اور جن میں سو یا سو کے قریب ہیں، ان کو ذوات المئین کہتے ہیں، اور جن میں سو سے بہت کم آیتیں ہوں، ان کو مثانی کہتے ہیں، اور سورۂ حجرات سے آخر قرآن تک جو سورتیں ہیں ان کو مفصل کہتے ہیں۔

۷۳۶: حدثنا ادم قال حدثنا شعبة قال حدثنا عمرو بن مرة قال سمعت ابا وائل قال جآء رجل الی ابن مسعود فقال قرأت المفصل اللیلة فی رکعة فقال هذاً لهذا الشعر لقد عرفت النظائر التی کان النبی صلے اللہ علیه وسلم یقرن بینهن فذکر عشرین سورةً من المفصل سورتین فی کل رکعةٍ

ترجمہ: حضرت ابو وائلؒ کا بیان ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے پاس ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ میں نے رات کو مفصل کی سورتیں ایک رکعت میں پڑھیں اور کہا کہ میں نے اس قدر جلد پڑھیں جیسے شعر جلد پڑھا جاتا ہے، میں ان ہم شکل سورتوں کو جانتا ہوں جنہیں نبی کریم ﷺ ساتھ پڑھ لیا کرتے تھے، پھر انہوں نے مفصل کی بیس سورتیں ذکر کیں (کہ ان میں سے) دو دو سورتیں ہر رکعت میں (آں حضرت ﷺ پڑھا کرتے تھے)۔

تشریح: امام بخاریؒ نے یہاں ایک بڑا عنوان و ترجمۃ الباب قائم کر کے متعدد مسائل کا حل کیا ہے، چار مسائل کا حل تو ابتدائی سرخی میں ہی کر دیا ہے اور دو مسئلے درمیان میں ضمناً ذکر کئے ہیں۔

علامہ عینیؒ نے نہایت عمدگی سے ہر مسئلہ کی مع اس کی دلیل کے وضاحت فرما دی ہے، علامہ نے لکھا کہ امام بخاریؒ نے ان چار مسائل میں سے دوسرے نمبر یعنی قرائۃ بالخواتیم کی دلیل پیش نہیں کی ہے اور لکھا کہ حافظ ابن حجر نے جو یہ کہا کہ شروع سورتوں کے پڑھنے سے اس کی دلیل بن جاتی ہے، کیونکہ ہر ایک میں سورت کا کچھ ہے تو اس تاویل سے یہ بہتر ہے کہ قول قتادہؓ کو اس کے لئے دلیل بنایا جائے، جس میں ہے

کہ سب ہی کتاب اللہ ہے، جہاں سے بھی پڑھ لو کوئی حرج نہیں ہے۔ (عمدہ ص ۳\۹۸)

(۱) پھر لکھا کہ امام بخاری نے جو چوتھا مسئلہ عنوان میں ذکر کیا ہے کہ سورت کا ابتدائی حصہ پڑھا جائے تو اس کے لئے سب سے پہلی ذکر کردہ دلیل ہے یعنی حضور علیہ السلام کا فعل مبارک۔ اس میں مسئلہ فقہی یہ ہے کہ کچھ حصہ سورت کا پڑھ کر قطع کر کے رکوع کر دینا سارے فقہا کے نزدیک بلا کراہت کے جائز ہے۔ اگر کسی عذر سے ایسا کرے، البتہ بلا عذر کے بھی بلا کراہت جمہور کے نزدیک جائز ہے، صرف امام مالک کا مشہور مذہب کراہت کا ہے۔ (عمدہ ۳\۹۹)

(۲) حضرت عمرؓ کا فعل، علامہ عینی نے لکھا کہ اس کی مطابقت ترجمہ کے کسی جز سے نہیں ہے کہ اس سے صرف تطویلِ قرائۃ کا جواز معلوم ہوتا ہے۔ اور نمبر ا سے مطابقت اس احتمال پر ہو سکتی ہے کہ حضرت عمر پہلی رکعت میں بقرہ کی ایک سو آیات کے ساتھ مفصل کی بھی سورت ملاتے ہوں، اور دوسری میں بھی اسی طرح۔ تو جمع بین السورتین فی رکعۃ والی صورت بنے گی، اور دوسرے احتمال پر کہ پہلی میں صرف بقرہ اور دوسری میں سورتِ مثانی پڑھتے تھے، کوئی مطابقت نہ بنے گی۔ (عمدہ ۳\۱۰۰)

(۳) قرأ الاحنف، اس سے ترجمہ کے تیسرے جزو سے مطابقت ہوگی کہ سورتوں میں ترتیب مصحف کی رعایت ضروری نہیں۔ علامہ نے لکھا کہ اسکو ہمارے اصحاب نے مکروہ کہا ہے، شرح ہدایہ میں بھی مکروہ لکھا اور یہی جمہور علماء کا قول ہے جن میں امام احمد بھی ہیں کیونکہ ترتیب مصحف عثمانی کی رعایت مستحب ہے، اور بعض نے اسکو فرائض میں مستحب قرار دیا ہے اور نوافل میں وسعت دی ہے کیونکہ ان کی ہر رکعت مستقل نماز ہے، امام مالک نے بھی اس میں کوئی حرج نہیں بتلایا۔

محقق قاضی عیاض کی تحقیق

آپ نے لکھا کہ ترتیب سور جیسا کہ باقلانی نے کہا اصح القولین میں اجتہادِ مسلمین سے ہے، حضور علیہ السلام سے نہیں ہے، اور منکوساً تلاوت سے ممانعت کو پورے قرآن مجید کو اس طرح پڑھنے پر محمول کیا ہے البتہ ترتیب آیات جس طرح مصحف میں ہے، اس کو سب نے بالاتفاق توقیف من اللہ قرار دیا ہے۔ (عمدہ ص ۳\۱۰۰)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بعض حضرات نے ترتیب سور کو بھی باستثناءِ انفال و توبہ، توقیفی قرار دیا ہے اور میرا مختار بھی یہی ہے لیکن چونکہ صحابہ کرام کے نزدیک یہ حدِ وجوب تک نہ پہنچی تھی اور صرف محسنات میں سے شمار کی گئی، اس سے یہ خیال عام طور سے کر لیا گیا کہ وہ ان کے نزدیک اجتہادی ہے۔

حضرتؒ نے مزید فرمایا کہ کبیری شرح منیہ میں امام بخاری کی چاروں ذکر کردہ صورتوں کو مکروہ لکھا ہے، اور امام طحاوی نے جائز لکھا ہے، میرے نزدیک طحاوی کو ترجیح ہے۔ صاحب بحر نے ترتیب سور کو ضروری لکھا ہے۔ ملا نظام الدین نے بھی تحسین کی بحر کی کہ بیشک واجبات سے ہے کیونکہ صحابہؓ نے ترتیب دی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اکثر علماء کے نزدیک ترتیب آیات تو توقیفی ہے بالاجماع، اور ترتیب سور توقیفی نہیں ہے۔ نوافل میں حنفیہ نے قرائۃ کے حق میں ہر رکعت کو مستقل قرار دیا ہے (اگرچہ ویسے شفعہ بنایا ہے دو دو رکعت کو) اس لئے ان میں ترتیب سور بھی نہیں ہے۔ اور سنن و فرائض میں ترتیب ضروری ہے۔

(۴) قرأ ابن مسعودؓ، اس کی مطابقت بھی چوتھے جزو سے ہے، جس طرح فعلِ نبوی کی تھی۔ کیونکہ دوسری روایات سے ان کا ابتداءِ سورت سے پڑھنا متعین ہو گیا ہے۔ (عمدہ ۳\۱۰۰)

(۵) قال قتادہ :رؒ علامہ عینی نے لکھا کہ قولِ قتادہ کی کوئی مطابقت اجزاءِ ترجمۃ البخاری کے ساتھ نہیں ہے، گویا اس کو امام بخاریؒ صرف اس لئے لائے ہیں کہ اس سے بھی چاروں اجزاء ترجمہ کا ثبوت ہو سکتا ہے، کیونکہ انہوں نے کتاب اللہ کے ہر طرح پڑھنے کو بلا کراہت

جائز کہا ہے۔ (عمدہ ص۱۰۱\۳)

حافظ نے لکھا کہ ابن رشید نے کہا شاید امام بخاری تردید سورت کو نہ مانتے ہوں، اور اس لئے ترجمہ میں نہ لائے ہوں کیونکہ بعض علماء سے اس کی کراہت منقول ہے، مگر میرے نزدیک ان کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ صحتِ دلیل کے بعد امام بخاری ایسی رعایت نہیں کیا کرتے۔ اس کے بعد حافظ نے علامہ زین بن المنیر کا قول نقل کیا ہے کہ "امام مالکؒ ہر رکعت میں ایک سورت پڑھنے کے قائل تھے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ ہر سورت کے لئے رکوع وسجود میں حصہ مقرر ہے (کہ ہر رکوع وسجود یا رکعت کے لئے ایک سورت کامل ملنی چاہئے) اور فرمایا کہ ایک سورت کو دو رکعت پر تقسیم نہ کیا جائے اور کسی سورت کے کچھ حصہ پر اکتفانہ کرنا چاہئے کہ باقی کو ترک کر دیا جائے، اور نہ کسی سورت کو پڑھ کر پھر اس سے قبل کی سورت پڑھی جائے کہ یہ ترتیب مصحف کے خلاف ہے، اگر ایسا کرے گا تو نماز تو فاسد نہ ہوگی، مگر خلاف اولیٰ ہوگا، پھر علامہ نے لکھا کہ امام بخاری نے جو استدلال کئے ہیں وہ امام مالک کے خلاف نہیں ہیں، کیونکہ وہ بیانِ جواز پر محمول ہیں"۔ (فتح الباری ص۱۷۴\۲)

علامہ عینی نے لکھا کہ قولِ قتادہ کے تحت ۲ مسئلے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک سورت کو دو رکعت میں پڑھا جائے جیسے کہ حضور علیہ السلام نے نماز مغرب میں سورۂ اعراف دونوں رکعت میں پڑھی، اور حضرت ابوبکرؓ نے سورۂ بقرہ فجر کی دو رکعت میں پڑھی، یا حضرت عمرؓ نے عشاء کی پہلی دو رکعت میں آلِ عمران پڑھی، دوسرا مسئلہ یہ کہ ایک ہی سورت کو دونوں رکعت میں پڑھا جائے، جیسا کہ حضور علیہ السلام نے ایک بار نماز صبح کی دونوں رکعتوں میں اذا زلزلت پڑھی۔ معلوم نہیں کہ بھول کر یا عمداً، اسی لئے ہمارے بعض اصحاب نے کہا کہ عمداً ایسا کرنا مکروہ ہے اور بعض نے کہا کہ مکروہ نہیں ہے، مبسوط میں لکھا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں ہے، لیکن اگر کر لیا تو حرج نہیں، اور افضل یہی ہے کہ فرضوں کی ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ اور کوئی سورت پوری پڑھے۔ (عمدہ ص۱۰۱\۳)

(۶) حدیث الباب حضرت انسؓ:

اس سے بھی امام بخاری نے ثابت کیا کہ ایک رکعت میں دو سورت پڑھنا درست ہے۔ لہٰذا اس کی مطابقت بھی ترجمہ کے جزو اول سے ہے۔ علامہ عینی نے کہا کہ یہی مذہب امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا (ایک روایت میں) اور دوسرے اکابر کا بھی ہے، البتہ کچھ حضرات شعبی وغیرہ نے کہا کہ ایک رکعت میں علاوہ فاتحہ کے ایک سورت سے زیادہ پڑھنا مناسب نہیں ہے، کیونکہ مصنف عبدالرزاق میں ہے۔ حضرت ابن عمرؓ سے ایک شخص نے کہا، کہ میں نے ایک رکعت میں مفصل کی سب سورتیں پڑھیں۔ آپ نے فرمایا کیا تم لوگوں نے ایسا کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ اگر چاہتے تو مفصل کی سب سورتوں کی جگہ ایک ہی سورت بنا کر نازل فرما دیتے۔ لہٰذا تم ہر سورت کو اس کا حصہ رکوع و سجود سے دو۔ (واخرجہ الطحاوی ایضا)

ائمہ اربعہ وغیرہم کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے خلاف حضرت عائشہ وحضرت حذیفہؓ کی احادیث وارد ہیں جن سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام نے ایک رکعت میں سورۂ بقرہ، آلِ عمران ونساء پڑھیں۔ اور آپ مفصل کی کئی کئی سورت ملا کر پڑھا کرتے تھے۔ (عمدہ ص۱۰۳\۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب میں لا تری انہا تجزئک سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بھی ضمِ سورت کو واجب سمجھتے تھے۔

عدم اشتراطِ فاتحہ: علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حدیث الباب بخاری میں سورۂ فاتحہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، بلکہ یہ بھی صراحت ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے امام صاحب جو ان سب میں سب سے افضل بھی تھے اور اسی لئے ان کی امامت سے وہ حضرات صرف نظر بھی نہیں کر سکتے تھے، وہ ہر رکعت کی قرأۃ میں افتتاح سورۂ قل ھو اللہ احد سے کرتے، پھر دوسری سورت اس کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پھر نہ خود ان تمام صحابہ کو ان کے فاتحہ نہ پڑھنے پر کوئی اعتراض ہوا اور نہ حضور علیہ السلام نے تنبیہ فرمائی کہ تم فاتحہ کیوں نہیں پڑھتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی صحت کے

لئے قرائتِ فاتحہ کی شرط لگانا صحیح نہیں کہ بغیر اس کے نماز ہی صحیح نہ ہوگی خواہ وہ کتنا ہی قرآن مجید پڑھ لے۔ (عمدہ ص ۳\۱۰۲)

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا نقد

آپ نے فرمایا کہ بظاہر اگر چہ حدیث الباب میں ترکِ فاتحہ ہے، مگر خیال ہے کہ فاتحہ بھی پڑھتے ہوں گے، ورنہ جہاں اس سے اشتراط و رکنیتِ فاتحہ کی نفی ہوتی ہے، ایجابِ فاتحہ کی بھی تو نفی ہوگی، جو مسلکِ حنفیہ کے بھی خلاف ہے۔

تحقیق لفظ اجزاء وصحت

حضرتؒ نے فرمایا کہ عام طور سے فقہاء کی عبادتوں میں یہ دونوں لفظ آتے ہیں۔ اور کہہ دیتے ہیں کہ نماز صحیح ہوگئی یا جائز ہوگئی حالانکہ وہ ان کے نزدیک بھی کراہت کے ساتھ ہوتی ہے لیکن چونکہ ان الفاظ سے بظاہر کراہت کی نفی معلوم ہوتی ہے، اس لئے مخالفوں کو اعتراض کا موقعہ مل جاتا ہے کہ ان کے نزدیک مکروہ بھی نہیں ہے، اس لئے بہتر ہوتا کہ فقہاء ان دونوں لفظوں کی جگہ دوسرے الفاظ استعمال کرتے، جن سے اعتراضات وارد نہ ہوتے اور مخالفوں کو توحش بھی نہ ہوتا۔

پھر حضرتؒ نے فرمایا کہ درحقیقت صح کا لفظ صح المریض سے نہیں ہے، جو صحت باعتبارِ اوصاف پر دلالت کرتا ہے، بلکہ صرف اجزاء کے اعتبار سے ہے، یعنی اجزاء تو پورے ہیں اگر چہ اوصاف میں نقص اور کمی ہے، اور کبھی ایک لفظ لغت میں ایک معنی کے لئے وضع ہوتا ہے، پھر عرف میں اس معنی سے نکل جاتا ہے اور بلغاءِ لسان اس کو معنی اول ہی کے لحاظ سے استعمال کرتے ہیں تو عوام کو پریشانی ہوتی ہے کیونکہ وہ دوسری طرف کے لحاظ سے پہلے معنی کو بھول جاتے ہیں اور اس سے معانی کا تعدد بھی بلکہ موارد و مواقع کا تعدد ہوتا ہے جیسے لفظِ مسح کو پیروں کے لئے پانی بہانے کے معنی ہیں اور سر کے لئے تر ہاتھ پھیرنے کے واسطے ہوتا ہے اور نضح البحر کا لفظ سمندر کی امواج کے لئے اور نضح النواضح اونٹنیوں کے پانی ڈھونڈنے کے واسطے ہوتا ہے اور نضح الانسان پانی چھڑکنے کے لئے ہوتا ہے، اسی طرح ایک ہی لفظ کے اختلاف موارد کے ساتھ معنی بدل جاتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے عربی سے فارسی میں ترجمہ سید علی ہمدانی اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے زیادہ اچھا کسی کا نہیں دیکھا، بعینہ عربی کو فارسی کر دیتے ہیں، بغیر تقدیم و تاخیر کے۔ اور میرے نزدیک آج کل کے فقہ وغیرہ کے ترجمے قطعاً ساقط ہیں میرے نزدیک جازت کا ترجمہ رواشد نہیں بلکہ رواں شد ہے کہ چل گئی، یعنی مثلاً نماز تاکہ اس کے نقص و کمی کی طرف اشارہ ہو جائے اجزاء کا ترجمہ یہ ہونا چاہئے کہ کچھ ہوگئی۔ جیسے کہ ابھی حضرت ابوہریرہؓ کا قول گزرا ہے فان لم تزد علیے ام القرآن اجزأت کہ یہاں بھی اجزأت کا لفظ نقص پر دال ہے۔

قولہ حبک ایاھا الخ حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس میں نیت کی تصویب ہے، عمل کی نہیں، کیونکہ اس سے پہلے حضور علیہ السلام نے مایمعک الخ سے اس پر اعتراض کیا ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی نماز کے لئے کسی سورت کا تعین کر لینا بہتر نہیں، جیسا کہ کنز میں ہے، البتہ ابن نجیم نے ان سورتوں کی تعیین کو جائز بلا کراہت بتلایا ہے جو حضور علیہ السلام سے مروی ہیں۔

امام بخاری کے توسعات

اوپر کی پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ نے حضور علیہ السلام اور صحابۂ کرام کے کبھی کبھی کے عمل سے جواز ثابت کیا ہے اور حضرت قتادہ کا یہ قول بھی پیش کر دیا کہ سب قرآن مجید ہے خدا کا کلام ہے جس طرح بھی پڑھے و نماز ہو جائے گی، مگر ہم نے اوپر حضرت ابن عمرؓ کا قول بھی پیش کیا ہے کہ انہوں نے کئی سورتوں کو ناپسند کیا ہے، امام بخاریؒ نے اس کو پیش نہیں کیا، کیونکہ وہ تو توسعات کے درپے ہوگئے، حالانکہ حضور علیہ السلام کا اکثری تعامل وہی تھا جس کی طرف حضرت ابن عمرؓ نے اشارہ فرمایا ہے، کہ ترتیب مصحف کے خلاف بھی نہ ہو، ہر رکعت کے

لئے ایک ہی سورت کامل ہو (خواہ چھوٹی ہی ہو) ایک سورت کو دو رکعتوں پر بھی تقسیم نہ کیا جائے، اور نہ ناقص سورت پڑھی جائے۔ وغیرہ ہم کچھ نہیں کہتے، حضرت ابن عمرؓ ایسے جلیل القدر صحابی کی تصریحات ہی حضرت قتادہؓ کے قول سے معارض ہیں۔ یاد ہوگا اسی طرح امام بخاری نے مساجد کے اندر سارے وہ کام جائز ثابت کئے تھے جو حضور علیہ السلام کے دورِ مبارک میں احیاناً یا کسی ضرورت کے تحت انجام پائے تھے۔

باب یقرأفی الاخریین لفاتحة الکتاب

آخری دونوں رکعتوں میں (صرف) سورہ فاتحہ پڑھی جائے

۷۳۷: حدثنا موسیٰ بن اسماعیل قال حدثنا همام عن یحییٰ عن عبدالله ابن بی قتادة عن ابیه ان النبی صلی الله علیه وسلم کان یقرأفی الظهرفی الاولین بام الکتاب وسورتین و فی الرکعتین الاخرین بام الکتاب ویسمعنا الأیة ویطول فی الرکعة الاولیٰ مالایطیل فی الرکعة الثانیة وهکذا فی العصر وهکذا فی الصبح

ترجمہ۷۳۷: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ ظہر کی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور دو سورتیں اور (اس کے ساتھ) پڑھتے تھے اور پچھلی دونوں رکعت میں (صرف) سورۂ فاتحہ پڑھتے تھے، اور ہم کو کوئی آیت (کبھی کبھی) سنائی دیتی تھی۔ اور پہلی رکعت میں اس قدر طول دیتے تھے کہ دوسری رکعت میں نہ دیتے تھے، اور عصر اور صبح میں بھی یہی صورت تھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ دوسری دو رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ ضمِ سورت کے بارے میں ہمارے تین قول ہیں، ایک یہ کہ اس سے سجدہ سہو آئے گا، دوسرا یہ کہ نہیں آئے گا، تیسرا یہ کہ نہ وہ مسنون ہے نہ مکروہ ہے، یہ قول فخر الاسلام کا ہے اور اسی کو میں اختیار کرتا ہوں۔ ورنہ مشہور مذہب حنفیہ پر احادیثِ صحیحہ صریحہ کا جواب نہ ہو سکے گا۔ فافہم۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک آخری دو رکعتوں میں ضم سورت مکروہ ہے، الحدیث الباب، امام شافعی کا قدیم قول جمہور کے ساتھ ہے اور جدید میں فاتحہ کے ساتھ سورتیں ملانے کا استحباب ہے۔ (کمافی الاوجز) لہٰذا امام بخاری کا ترجمۃ الباب ان پر رد کے لئے ہوگا۔ (الابواب ص۲\۲۸۷)

باب من خافت القرآءة فی الظهر والعصر

جس نے ظہر اور عصر کی نماز میں آہستہ قراءت کی۔ اس کا بیان

۷۳۸: حدثنا قتیبة قال حدثنا جریر عن الاعمش عن عمارة بن عمیر عن ابی معمر قال قلنا لخبابؓ اکان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقرأفی الظهر والعصر قال نعم قلنا من این علمت قال باضطراب لحیته

ترجمہ۷۳۸: حضرت ابومعمر روایت کرتے ہیں کہ ہم نے خبابؓ سے کہا کہ کیا رسول خدا ﷺ ظہر اور عصر میں قرائۃ کرتے تھے؟ خبابؓ نے کہا، ہاں! ہم نے کہا تم نے کس طرح پہچانا؟ خبابؓ نے کہا کہ آپ کی داڑھی کی جنبش سے۔

تشریح: الابواب ص۲\۲۸۷ میں ہے کہ یہ مسئلہ اتفاقی ہے، سب کے نزدیک یہی ہے اور حافظؒ نے لکھا کہ حدیث کی مطابقت ترجمۃ الباب سے واضح ہے۔

باب اذا اسمع الامام الآية

۷۳۹: حدثنا محمد بن یوسف قال حدثنا الاوزاعی قال حدثنی یحیی بن ابی کثیر قال حدثنی عبداللہ بن ابی قتادۃ عن ابیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقرأ بام الکتاب وسورۃ معھا فی الرکعتین الاولیین من صلوٰۃ الظھر وصلوٰۃ العصر ویسمعنا الآیۃ احیانا وکان یطیل فی الرکعۃ الاولیٰ

ترجمہ ۷۳۹: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نمازِ ظہر اور عصر کی پہلی دو رکعتوں میں سورۂ فاتحہ اور اس کے ہمراہ ایک سورت اور پڑھا کرتے تھے، اور کبھی کبھی کوئی آیت ہمیں سنا دیتے تھے اور پہلی رکعت میں (زیادہ) طول دیتے تھے۔

تشریح: سری نماز میں اگر کوئی آیت جہر سے پڑھ دی جائے تو اس سے نماز مکروہ نہ ہوگی، حافظ نے لکھا کہ یہ ان کے خلاف ہوگا جو سہو کی وجہ سے پڑھنے پر یا بغیر سہو کے بھی سجدہ کرنے کو کہتے ہیں۔ (الابواب ص ۲۸۷\۲)

باب یطول فی الرکعۃ الاولیٰ

پہلی رکعت کو طویل کرے

۷۴۰: حدثنا ابو نعیم قال حدثنا ھشام عن یحیی بن ابی کثیر عن عبداللہ ابن ابی قتادۃ عن ابیہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یطول فی الرکعۃ الاولیٰ من صلوٰۃ الظھر ویقصر فی الثانیۃ ویفعل ذٰلک فی صلوٰۃ الصبح

ترجمہ ۷۴۰: حضرت ابوقتادہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نمازِ ظہر کی پہلی رکعت طویل ادا فرماتے، اور دوسری رکعت (پہلی کے اعتبار سے) کم ہوتی تھی، اور یہی صبح کی نماز میں (بھی) کرتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث الباب کی اسناد میں ابونعیم فضل بن دکین م ۲۱۸ھ حنفی ہیں اور امام اعظمؒ کے تلمیذ۔ ان کا نام عمرو بن حماد ہے، رواۃِ صحاح ستہ میں ہیں۔ ولادت ۱۳۰ھ میں ہوئی تھی، ۸۸ سال کی عمر میں انتقال فرمایا، سب ہی ناقدینِ رجال نے ان کی توثیق و مدح کی ہے۔ میمونی نے امام احمد سے نقل کیا کہ وہ ثقہ، متیقظ و عارف بالحدیث تھے۔ پھر امتحان میں بھی ایسے ثابت قدم نکلے کہ ان جیسا دوسرا نہ ہوسکا۔ (امانی الاحبار ص ۱۸۳ ج ۲)

حضرت شاہ صاحبؒ نے انکے حفظ و تثبت کا عجیب واقعہ بھی درسِ بخاری میں ذکر کیا تھا۔ جو فیض الباری ص ۲\۲۹۰ میں بھی ہے، دیکھ لیا جائے۔

باب جھر الامام بالتامین وقال عطآء امین دعآء امن ابن الزبیر ومن ورآءہ حتیٰ ان للمسجد للجۃ وکان ابوھریرۃ ینادی الامام لاتفتنی بآمین وقال نافع کان ابن عمر لایدعہ ویحضھم وسمعت منہ فی ذٰلک خبراً

۷۴۱: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شھاب عن سعید بن المسیب وابی سلمۃ بن عبدالرحمٰن انھما اخبراہ عن ابی ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذا امن الامام فامنوا فانہ من وافق تامینہ تامین الملٰئکۃ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ قال ابن شھاب وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول امین

ترجمہ ۷۴۱: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا، جب امام آمین کہے، تو تم بھی آمین کہو اس لئے کہ

جس کی آمین ملائکہ کی آمین سے مل جائے گی، اس کے اگلے گناہ بخش دیئے جائیں گے ابن شہاب کہتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ آمین کہا کرتے تھے۔

تشریح: آمین کے جہر و اخفاء کا مسئلہ بھی معرکۃ الآراء مسائل میں سے ہے، اس میں بڑا اختلاف شافعیہ کا ہے اور بقول حضرت شاہ صاحبؒ قدیم قول امام شافعیؒ کا یہ تھا کہ امام و مقتدی سب آمین کا جہر کریں اور جدید قول یہ ہے کہ صرف امام جہر کرے اور مقتدی اخفا کریں۔ شافعیہ نے امام شافعیؒ کے قولِ جدید کو اختیار نہ کر کے نزاعی صورت کو بڑھوا دیا ہے، حالانکہ امام کے آخری قول کو ہی ترجیح دینی چاہئے تھی، اور امام بخاریؒ بھی چونکہ ان ہی کے ساتھ ہیں۔ اس لئے وہ بھی حسبِ عادت مبالغانہ تراجم قائم کر رہے ہیں، یہاں حدیث الباب میں جہر کی کوئی صراحت نہیں ہے، اور صرف "اذا من الامام" کے لفظ سے جہر کا اثبات مشکل ہے، جیسا کہ ہم تفصیل کریں گے۔ لیکن ترجمہ و عنوانِ باب میں لجہ کے لفظ سے یہ تاثر دیا ہے کہ ساری مسجد لوگوں کی آمین کی وجہ سے گونج جاتی تھی۔ حالانکہ ہلکی آواز بھی اگر مجمع کی ہو تو اس کی خاص کیفیت بن جاتی ہے۔ وار دوسرا نسخہ جلبہ کا بھی ہے، جس کے معنی مختلف آوازوں کی ملی جلی کیفیت ہے جس کے لئے صوتِ مرتفع ضروری نہیں ہے۔

استدلالِ جہر آمین پر نظر

امام بخاریؒ نے ترجمہ کے اندر حضرت ابو ہریرہؓ کا قول بھی پیش کیا ہے کہ وہ ایک وقت میں جب موذن تھے تو امام سے فرماتے تھے کہ دیکھنا فاتحہ اتنی جلد ختم نہ کر دینا کہ میری آمین رہ جائے، کیونکہ مقتدی کی آمین کا امام اور فرشتوں کے ساتھ بیک وقت ہونا مغفرتِ ذنوب کا موجب ہے، لیکن اس سے بھی جہر کا اثبات نہیں ہوتا۔

اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے بطورِ مزاح یہ بھی فرمایا کہ امام بخاری یہاں جہرِ آمین ثابت کرنے کی فکر میں ایسے مشغول ہوئے کہ فاتحہ کی فرضیت و رکنیت بھی بھول گئے، کیونکہ اس سے تو معلوم ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کو امام کے پیچھے فاتحہ کی فکر نہ تھی بلکہ صرف آمین کی فکر تھی، اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی پہلوان اپنے کپڑے اتار کر اور لنگر لنگوٹ کس کر اکھاڑے میں اتر جائے اور وہ کشتی جیتنے کے خیال میں ایسا محو ہو کہ اس کو اپنے کپڑوں کا بھی خیال نہ رہے خواہ ان کو کوئی اٹھا کر ہی لے جائے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا اثر

حضرتؒ کا ارشادِ گرامی اس لئے بھی زیادہ اہم ہو جاتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اپنے رسالہ جزء القرائۃ خلف الامام ص ۱۷ میں اپنے مسلک کی تائید میں خاص طور سے حضرت ابو ہریرہؓ کا اسمِ گرامی پیش کیا ہے کہ وہ قرائۃ خلف الامام کو ضروری و فرض سمجھتے تھے۔

یہاں تو صاف طور سے ثابت ہوا کہ حضرت ابو ہریرہؓ امام کی قرائۃِ فاتحہ کو مقتدی کے لئے کافی سمجھتے تھے، اور وہ صرف اس امر کا اہتمام فرماتے تھے کہ امام کے ساتھ آمین میں شرکت فرمائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اگر کہا جائے کہ حضرت ابو ہریرہؓ اقامتِ صفوف وغیرہ کے کام میں مصروف ہوتے تھے، اس لئے وہ امام کے ساتھ فاتحہ نہ پڑھ سکتے تھے، تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ وہ عذر کر دیتے کہ مجھے تکبیر کے بعد کے وقفہ میں فاتحہ پڑھنی ہے، بغیر اس کے میری نماز امام کے پیچھے نہ ہوگی، لہٰذا اقامتِ صفوف وغیرہ کا کام ایسے حضرات کے سپرد کرا دیتے جو امام کے پیچھے قرائۃ فاتحہ کو رکن و فرض نہیں سمجھتے تھے، اور ایسے صحابہ کی تعداد زیادہ بھی تھی کیونکہ خود امام بخاری نے ہی ص ۱۷ میں اسی مقام پر کئی صحابہ کے نام ذکر کئے ہیں جو امام کے پیچھے قرائۃ کو ضروری نہ سمجھتے تھے (حضرت ابن عمر وغیرہ) اور ضروری سمجھنے والوں میں صرف حضرت ابو ہریرہؓ کا نام پیش کیا ہے، اور ان ہی کا یہ حال تھا کہ خود امام بخاریؒ کے اقرار مذکور ہی سے ثابت ہو گیا کہ ان کو امام کے پیچھے فاتحہ کی نہیں بلکہ صرف آمین کی فکر تھی۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے امرت سر اور کلکتہ میں بڑے مجمع میں برسرِ منبر اعلان کر دیا تھا کہ ذخیرۂ نقل میں کہیں بھی

مقتدیوں کے لئے جہر کا حکم ثابت نہیں ہے۔

ایک ہزار برس کا اشکال اور جواب

حضرتؒ نے فرمایا: اتنی مدت سے یہ اشکال حل نہ ہو سکا کہ اذا امن الامام کی صحیح غرض کیا ہے؟ امام مالکؒ نے فرمایا کہ حدیث اذا قال الامام و لا الضالین فقولوا آمین سے مقتدیوں کے لئے آمین کا مقام ووقت بتلا دیا گیا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تقسیم ہے، لہٰذا امام امین نہ کہے گا جس طرح خارج صلوٰۃ میں بھی امام یا مقتداء دعائیں کرتا ہے اور سب لوگ ان پر آمین کہتے ہیں۔ دعائیں پیش کرنا امام کا کام ہے اور آمین کہنا سننے والوں کا کام ہے۔

حنفیہ میں سے امام محمدؒ نے امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول نقل کیا ہے کہ امام پر آمین نہیں ہے (کمافی موطأ الامام محمدؒ) مالکیہ نے حدیث اذا امن الامام فامنوا کا جواب یہ دیا جب امام آمین کی جگہ پہنچے تو تم آمین کہو، جیسے انجد، ایمن، اعرق اتہم وغیرہ بولتے ہیں کہ نجد، یمن، عراق یا تہامہ کے قریب پہنچا، شافعیہ نے دوسری حدیث (اذا قال الخ) میں پس وپیش کیا ہے اور حافظ نے فتح الباری میں خاصی تقریر کی ہے مگر شفا نہیں ہے، میں نے فصل الخطاب وغیرہ میں کشفِ حقیقت کی ہے اور جواب اشکال دیا ہے۔

خلاصۂ تحقیق انور: ایک حدیث ہے انما جعل الامام لیؤتم به اور اس کو راوی حدیث کہیں پوری نقل کرتے ہیں اور کہیں اس کے کچھ ٹکڑے لاتے ہیں اور دوسرے ذکر نہیں کرتے، امام مسلم نے باب ایتمام الماموم بالامام کے تحت حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی حضور علیہ السلام ہمیں نماز سکھاتے تھے، جس میں یہ بھی فرماتے تھے کہ امام سے پہلے کوئی رکن ادا نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے، تم بھی کہو، جب وہ و لا الضالین کہے تو تم آمین کہو، جب رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم اللهم ربنا لک الحمد کہو،

نیز امام مسلم نے اس سے پہلے باب التسمیع والتحمید والتامین میں بھی حضرت ابو ہریرہؓ سے حدیث نقل کی کہ جب قاری غیر المغضوب علیهم و لا الضالین کہے اور اس کے پیچھے مقتدی آمین کہیں، اور ان کی آمین آسمان والوں کے ساتھ ہو جائے تو ان کے سب گناہ معاف ہو جائیں گے۔

امام بخاری بھی آگے باب جهر الماموم بالتامین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث نمبر ۷۴۳ ان الفاظ سے لائیں گے کہ جب امام غیر المغضوب علیهم و لا الضالین کہے تو تم آمین کہو کیونکہ جس کا قول (آمین) فرشتوں کے قول آمین کے ساتھ موافق ہو جائے گا تو اس کے گذشتہ گناہ سب معاف ہو جائیں گے۔

اس سلسلہ کی تمام روایات سے معلوم ہوا کہ ان میں جہاں نماز کے سارے طریقے سکھائے گئے ہیں وہاں آمین کی جگہ بھی بتلائی گئی ہے، ان احادیث میں امام کی آمین کا حوالہ دینا غیر ضروری تھا، بس اتنا ہی بتلانا تھا کہ سورہ فاتحہ ختم ہو گئی، اب موقع ہے آمین کہنے کا۔

دوسری حدیث آئی ہے اذا امن الامام فامنوا چونکہ یہ اسی قدر ٹکڑا ہے، اور کسی بڑی حدیث کا اوپر والی حدیث کی طرح جزو نہیں ہے اور یہ حدیث صرف آمین کی فضیلت بتلانے کے لئے ہے اس لئے یہ بتلانا ضروری ہو گیا کہ آمین کس وقت کہو، اور اشارہ کیا امام کی آمین کی طرف۔ پہلی کا مقصد بیانِ موضع ہے کہ آمین کا تلفظ کس وقت کرو۔ یہ حقیقت ہے دونوں الگ الگ حدیثوں کی، جن کی وجہ سے اختلاف مذاہب پیدا ہوا جس کی تفصیل اوپر گزری ہے مگر دونوں حدیثوں میں جہر نہیں ہے، کسی نے کہا کہ اگر امام جہر نہ کرے تو پتہ کیسے چلے گا؟ میں کہتا ہوں کہ جب یہ بتلا دیا گیا کہ امام کے و لا الضالین کے بعد آمین کہنی ہے تو اس کے جہر کی کیا ضرورت باقی رہی؟

اس کے علاوہ ایک حدیث اور ہے اذا امن القاری فامنوا جس کو امام بخاری کتاب الدعوات میں لائیں گے بظاہر وہ ان دونوں

کے ایک ہونے کا فیصلہ نہ کر سکے، اس لئے حسب عادت دو جگہ لائے ہیں، حالانکہ یہ دونوں سنداً و متناً ایک ہی ہیں، میرے نزدیک ایک پیغمبر علیہ السلام کا قول ہے اور دوسری میں روایت بالمعنیٰ ہے، امام بخاری نے وہ سمجھ کر داخلِ صلوٰۃ اور خارجِ صلوٰۃ کا حکم عام ظاہر کیا ہے۔ اور **اذا امن الامام** کو صرف داخلِ صلوٰۃ کے لئے سمجھا ہے۔

پھر یہ کہ میرے نزدیک **اذا امن الامام** سے اتحادِ وقت بتلایا گیا ہے کہ سب ساتھ کہیں امام، مقتدی و ملائکہ حدیث میں ہے کہ احب الکلام عنداللہ وہ ہے جو اس نے اپنے بندوں فرشتوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ **سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم** اور **سبحان الملک القدوس**، معلوم ہوا کہ ملائکہ کی نماز بھی حنفیہ کے موافق ہے اور وعدۂ مغفرت بھی وہیں جہاں حنفیہ کے موافق چیز ہے "**اذا وافق تامینہ ...... غفر لہ ما تقدم من ذنبہ**" اور امام کی آمین بمدِ امامت نہیں ہے، بلکہ وہ بمدِ مصلی ہے، وہ بھی مقتدیوں کے درجہ میں ہو کر ان کے ساتھ کہتا ہے۔

احادیث جہر کا جواب

ابوداؤد و ترمذی میں جو یہ آیا ہے کہ جہر بہا صوتہ اس کے بارے میں حنفیہ نے کہا کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے، تعلیم وغیرہ کے لئے، جیسا کہ محدث ابن جریر نے بھی کہا کہ اکثر صحابہ و تابعین کا عمل آمین کا اخفاء ہی تھا۔ (الجوہر النقی ص ۱/۱۳۲) جو امام مالک کے مسلک سے بھی ثابت ہوا ہے، کیونکہ وہ حتی الامکان تعامل صحابہ و تابعین کو ہی لیا کرتے ہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نے کشف الستر میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جہاں جہر ہوا ہے وہ بھی خفیف ہوا ہے، جو اخفاء ہی کے حکم میں ہے کہ کسی پاس والے نے یا صفِ اول والوں نے سن لیا۔ جیسا کہ نسائی میں ہے اور پوری بات نہ شعبہ نے نقل کی نہ سفیان نے، شاید اسی لئے بخاری و مسلم نے ان کی روایت کو نہیں لیا۔ اور امام شافعیؒ کا مذہب متون میں ہے کہ جہرِ قرأۃ سے جہرِ آمین کو پست کرے۔

حضرت ابو ہریرہ کی جس حدیث میں ہے کہ مسجد گونج اٹھتی تھی اور اس سے غیر مقلد استدلال کرتے ہیں، وہ حدیث ضعیف ہے، دوسرے اس میں بھی یہ ہے کہ پہلی صف والے سنتے تھے، (ابوداؤد)

ابن ماجہ میں جو **حتی یسمع بہا اہل الصف الاول ویرتج بہا صوتہ**. اس میں دونوں بے جوڑ لفظوں کو جمع کر دیا ہے، یہ راوی ضعیف ہے اور شاید وہ آج کل کے عامل بالحدیث کی طرح ہوگا۔

وائل کی حدیث میں یہ لفظ بھی ہے "**فسمعناہا منہ**" جس سے معلوم ہوا کہ کبھی سن پایا ہے۔

حاصل مطالعہ: آخر میں حضرتؒ نے فرمایا کہ خارج موضوع سے جو پتے ملتے ہیں، ان سے مجھے یہی سانح ہوا ہے کہ فاتحہ خلف الامام نہیں ہے، نہ رفع یدین ہے یعنی سلسلۂ ارتباط (دائیں بائیں کڑیوں کا) اور تفریع و تاصیل نہیں ہے کہ رفع یدین یا قرأۃ خلف الامام پر کسی نے مسائل کی بنا رکھی ہو۔

رفع یدین کے لئے تو قولی حدیث بھی نہیں ہے البتہ آمین کے بارے میں خارج سے بنا نکلتی ہے، جس میں خارجی حدیث سے غیر قوم کا آمین پر حسد کرنے سے جہر کی بات نکلتی ہے، مسندِ احمد میں ہے کہ یہود نے تم پر کسی بات میں اتنا حسد نہیں کیا جتنا کہ آمین پر کیا ہے لہٰذا اس کی کثرت کیا کرو، میں نے اس کا جواب بھی کشف الستر میں دے دیا ہے۔

ایک استدلال پر نظر: جہرِ آمین کے قائلین نے **اذا امن الامام** سے استدلال کیا کہ امام کا جہر تو مقتدیوں کو باخبر کرنے کے لئے ہے اور چونکہ مقتدیوں کو بھی اسی لفظ سے حکم ہوا اس لئے وہ بھی جہر کریں گے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر یہی اصول ہے تو حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ جب موذن اذان دے تو تم بھی اسی طرح کہو جس طرح وہ کہتا ہے، یہاں تو مثل کا لفظ بھی وارد ہوا ہے لہٰذا اس سے یہ حکم نکال لو کہ سارے اذان سننے والے موذن کی طرح مینارہ پر چڑھ کر اذان دیا کریں اور حدیث میں ہے کہ امام تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، لہٰذا جس طرح وہ زور

سے تکبیر کہتا ہے تم بھی بلند آواز سے کہو، حدیث میں ہے کہ جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو، لہٰذا اس کے جواب میں تم بھی ربنا لک الحمد زور سے کہا کرو۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت سفیان سے روایت جہرِ آمین کی ہے اور شعبہ سے پست آواز سے کہنے کی ہے، حالانکہ حدیث ایک ہی ہے اور خود سفیان کا مذہب بھی اخفاءِ آمین کا ہے، لہٰذا ترجیح اخفاء کے لئے ہی ہوگی۔

پھر قرآن مجید کی آیاتِ مبارکہ بھی یہی تلقین کر رہی ہیں کہ دعا میں اخفاء بہتر ہے، علامہ ابن تیمیہ وابن القیم نے کہا کہ آمین کے جہر و اخفا کے مسئلہ میں اختلاف مباح کا ہے۔ اور بعض مواضع میں جہر کو ترجیح بھی دی ہے، لہٰذا اختلاف زیادہ اہم نہیں ہے

حافظ ابن حجر کی غلطی: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ حافظ نے فتح میں جو جمہور کا قول جہرِ آمین کا قرار دیا ہے وہ قابلِ تعجب ہے، کیونکہ امام مالک بھی اور مالکیہ سب ہی اخفا کے قائل ہیں اور جہر کی صراحت کہیں بھی نہیں ہے۔ (معارف ص ۲\۳۹۷)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام شافعیؒ کی آخری تالیف کتاب الام ہے، جیسا کہ پہلے بھی اس کی تفصیل گذر چکی ہے اور اس کے ص ۱\۱۹۵ میں ہے کہ جب امام سورۂ فاتحہ سے فارغ ہو تو آمین بلند آواز سے کہے تا کہ اس کے پیچھے والے مقتدی اس کو سن کر اقتدا کریں، اور جب امام کہے تو وہ بھی کہیں، لیکن اس طرح پست آواز سے کہ وہ اپنے آپ کو سنائیں، اور مجھے پسند نہیں کہ بلند آواز سے آمین کہیں۔ اور اگر کہہ لیں تب بھی کوئی حرج نہیں۔ حیرت ہے کہ امام شافعیؒ کے جدید اور آخری قولِ فیصل کے باوجود شافعیہ نے ان کے منسوخ شدہ قدیم قول کو اختیار کر کے نزاع کو باقی رکھا، اور امام بخاری نے اس اختلاف کو اور بھی ہوا دی، پھر اس زمانہ کے غیر مقلدین تو "دیوانہ را ہوے بس است" کے مصداق ہیں ہی۔ ان کو تو مقلدین کے خلاف پروپگینڈہ مشنری تیز کرنے کا بہانہ چاہئے، حالانکہ بقول ان کے امام ابن تیمیہ وغیرہ کے بھی اختلاف صرف مباح کا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح شافعیہ کا امامِ صلوٰۃ مقتدیوں کی صحت وفساد کا ضامن نہیں بلکہ صرف ظاہری اتباع ہے، اسی طرح شاید ان کا اپنے امامِ مذہب کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہے کہ جس بات میں چاہا ان کا قولِ قدیم اختیار کر لیا اور جب چاہا قولِ جدید لے لیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ وائل کی حدیث میں بھی اضطراب ہے، اور غالبًا اسی وجہ سے امام بخاریؒ اس کو اپنی صحیح میں نہیں لائے، حالانکہ وہ اثباتِ جہرِ آمین کے لئے نہایت حریص تھے، اور امام مسلم نے بھی اسی کی تخریج نہیں کی۔ تاہم وائل نے یہ بھی کہا ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں سنتِ آمین سکھانے کے لئے جہر کیا ہوگا، (اخرجہ ابو بشر الدولابی فی کتاب الاسماء والکنی ص ۱\۱۹۷) انور المحمود ص ۱\۳۲۰ میں رجال کی بحث بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

جمہور کا اخفاءِ آمین: "الزوائد" ص ۲\۱۰۸ میں حضرت علی وعبداللہ بن مسعودؓ سے نقل ہوا کہ وہ بسم اللہ، تعوذ اور آمین کا جہر نہ کرتے تھے اور کنز العمال ص ۴\۲۴۹ میں حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ امام چار چیزوں کا اخفا کرے:۔ تعوذ، بسم اللہ، آمین اللّٰھم ربنا ولک الحمد. غرض حضرت عمر، علی، عبداللہ بن مسعود، ابراہیم نخعی، جمہور صحابہ وتابعین اور سارے اہلِ کوفہ کا مذہب اخفاءِ آمین ہے۔ (معارف السنن ص ۲\۴۱۳)

محقق امت حافظ ابو عمر ابن عبد البر کا ارشاد

آپ نے حدیث اذا امن الامام فامنوا سے استنباط کیا کہ امام کے پیچھے قرائۃ نہیں ہے کیونکہ حدیث نے بتلایا ہے کہ مقتدی امام کے آمین کہنے کا منتظر ہے، اور منتظر کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ خاموش رہے نہ کہ قرأت کرتا رہے۔ (معارف ص ۲\۴۲۶)

افاداتِ علامہ عینیؒ: آپ نے لکھا کہ امام مسلم نے اذا قال احد کم فی الصلوۃ کی روایت کر کے فی الصلوۃ کی زیادتی بتلائی جو اچھی

زیادتی ہے اور اس پر شیخ عبدالحقؒ نے الجمع بین الصحیحین میں متنبہ کیا ہے، اس سے منفرد بھی فضیلت میں شامل ہو گیا، ورنہ امام بخاری وغیرہ نے اس زیادتی کو نہیں لیا ہے، ان کی روایات امام کے لئے یا مقتدی کے لئے یا دونوں کے لئے ہیں۔ پھر لکھا کہ ملائکہ سے کون سے مراد ہیں؟ بعض نے کہا کہ حفاظت کرنے والے، کسی نے کہا صبح و شام کی نمازوں میں آنے والے اور بعض کی رائے یہ ہے کہ سارے فرشتے مراد ہیں حفاظت کرنے والے بھی اور جوان کے اوپر ہیں وہ بھی حتی کہ ملاء اعلیٰ تک اور آسمانوں میں بھی جتنے ہیں۔ (عمدہ ص۳/۱۰۹) آگے بخاری کی حدیث میں وقالت الملائکۃ فی السماء پر عینی لکھا کہ اس سے بھی معلوم ہوا کہ صرف حفظ مراد نہیں ہیں۔ (۔۔ص۳/۱۱۲)

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کا حدیث الباب سے جہر آمین کے لئے استدلال تو نہایت ہی عجیب و غریب ہے، کیونکہ اس کے کسی لفظ سے بھی ان کا مقصد نہیں ثابت ہوتا، اس پر محشی علام دامت برکاتہم نے لکھا کہ حدیث اذا امن الامام سے تو جہر کا ثبوت کسی طرح ہوتا ہی نہیں نہ دلالۃ نہ اشارۃ۔ (لامع ص۱/۳۱۲)

باب فضل التامین

آمین کہنے کی فضیلت

۷۴۲: حدثنا عبداللہ بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابی الزناد عن الاعرج عن ابیؓ ھریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اذاقال احدکم امین وقالت الملٰئکۃ فی السمآء امین فوافقت احدھما الاخریٰ غفرلہ' ما تقدم من ذنبہ

ترجمہ ۷۴۲: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی آمین کہتا ہے، اور ملائکہ آسمان میں آمین کہتے ہیں، پھر ان دونوں میں (جس کی) ایک دوسرے کے موافق ہو گئی تو اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح: حافظ ابن حجرؒ نے لکھا:۔ یہاں امام بخاریؒ اعرج کے واسطہ سے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث لائے ہیں، جو مطلق ہے، اور حالت نماز کے ساتھ مقید نہیں ہے اور فضیلت کے لئے حسب قول ابن المنیرؒ یہی کافی ہے کہ ایک مختصر سے لفظ کے کہنے پر جس میں کوئی بھی کلفت نہیں ہے۔ مغفرت ذنوب کا وعدہ الٰہیہ حاصل ہو جاتا ہے، اس اطلاق سے یہ ثابت ہوا کہ جو بھی قراءت فاتحہ کے بعد آمین کہے گا، خواہ وہ نماز میں پڑھے یا خارج میں اس کو یہ فضیلت مل جائے گی، مگر مسلم شریف کی اسی سند سے روایت میں "اذا قال احدکم فی الصلوٰۃ آمین و الملائکۃ فی السماء آمین" ہے جس سے نماز کی قید معلوم ہوتی ہے، لہٰذا مطلق والی روایات کو بھی مقید پر محمول کرنا چاہئے، البتہ ایک روایت ہمام عن ابی ہریرہ امام احمد کے یہاں ہے جس میں اذا امن القاریٔ فامنوا ہے، اس کو مطلق پر اتار سکتے ہیں اور ہر قاری کی قراءت فاتحہ پر آمین کہنے کی یہ فضیلت ہو جائے گی، خواہ نماز میں ہو یا خارج میں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حدیث مذکور میں قاری سے مراد بھی امام ہی ہو، کیونکہ حدیث ایک ہی ہے، جس کے الفاظ رواۃ کے ذریعہ مختلف ہو کر نقل ہوئے ہیں۔ (فتح الباری ص۲/۱۸۰)

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا کہ اگر ترجمۃ الباب کو اطلاق پر رکھا جائے تو پھر اس سے روایت ابی داؤد کی تقویت ہوگی، جس میں ہے کہ "آمین" مثل طابع اور مہر کے ہے صحیفہ کے لئے الابواب والتراجم للبخاریؒ ص۲/۲۸۹)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ امام ابوداؤدؒ اس حدیث کو باب التامین وراء الامام کے تحت آخر میں لائے ہیں، اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قراءت فاتحہ کے بعد ہی نہیں بلکہ جو دعا بھی کی جائے۔ اس کے بعد آمین کی مہر اس پر ضرور لگانی چاہیے، کہ اس سے بشارت قبولیت ملتی ہے۔ (بذل المجہود ص۲/۱۰۶)

اسی کے ساتھ یہ بھی گذارش ہے کہ حافظ نے جو کہا کہ مسلم میں اسی سند فی الصلوٰۃ کی روایت ہے، یہ تسامح ہے کیونکہ اس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ سے دوسرے ہیں، نیز یہ کہ امام بخاری کا رجحان بھی اطلاق کی طرف ہی معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ کتاب الدعوات کے باب التامین ص ۹۴۷ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث لائیں گے کہ جب قاری آمین کہے تو تم بھی آمین کہو الخ وہاں بھی نماز کی قید نہیں ہے۔ لہٰذا یہاں بھی امام بخاریؒ نے ارادہ مطلق کا ہی کیا ہوگا، غرض اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ حدیثیں دونوں قسم کی ہیں اطلاق والی بھی اور مقید بھی، اور فضیلت دونوں ہی کے واسطے معلوم ہوتی ہے بلکہ حدیث ابوداؤد مذکور کے ذریعہ نہ صرف قراءت کے بعد بلکہ ہر دعاء حاجت پر آمین کہنے سے بشارت قبول ملتی ہے مگر اس کے لئے تامین ملائکہ کی موافقت کی صراحت ابوداؤد میں نہیں ہے۔ واللہ تعالے اعلم

باب جهرالماموم بالتامين

مقتدی کا بلند آواز سے آمین کہنے کا بیان

۷۴۳: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن سمی مولیٰ ابی بکر عن ابی صالح اسمان عن ابی هريرة ان رسول الله صلی الله عليه وسلم قال اذا قال الامام غير المغضوب عليهم و لاالضآلين فقولوا آمين فانه' من وافق قوله' قول الملٰئكة غفرله' ماتقدم من ذنبه

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب امام **غير المغضوب عليهم ولا الضالين** کہے، تو تم آمین کہو، کیونکہ جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے سے مل جائے گا اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔

تشریح: علامہ عینیؒ نے لکھا: ابن المنیر نے حدیث الباب سے ترجمۃ الباب کی مناسبت اس طرح بتلائی کہ حدیث میں آمین کہنے کو کہا گیا ہے اور قول کا اطلاق خطاب کے ساتھ جب ہوتا ہے تو وہ جہر ہی پر محمول ہوتا ہے کیونکہ اگر اسرار مقصود ہو تو اس کی قید لگادی جاتی ہے، علامہ عینی نے اس تاویل پر نقد کیا کہ مطلق کا اطلاق تو جہر و اخفاء دونوں پر ہوتا ہے، لہٰذا اطلاق کی صورت میں جہر کی تخصیص بلا وجہ کا فیصلہ ہے، جو کسی طرح درست نہیں۔

ابن رشید نے یہ تاویل کی کہ **اذا قال الامام فقولوا** میں مقابلہ قول کا قول سے ہے اور امام جہرا کہے گا تو ظاہر یہی ہے کہ اس کی موافقت صفت جہر میں بھی ہونی چاہیئے، علامہ عینی نے لکھا کہ یہ تاویل پہلی سے بھی زیادہ بعید تر ہے کیونکہ ظاہر کلام تو یہ ہے کہ امام آمین بھی نہ کہے جیسا کہ امام مالکؒ نے سمجھا کہ یہاں تقسیم کی گئی ہے کہ امام **ولا الضالين** کہے تو تم آمین کہو اور تقسیم شرکت کے منافی ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ امام تو جہرا کہے گا ہی، سرے سے بے محل ہے کیونکہ حدیث کا ظاہر تو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ کہے گا ہی نہیں، پھر جہر سے کہنا کیونکر مراد ہوگا؟ اور اس کی صفت جہر میں مقتدی کا اتفاق کیونکر ثابت ہوگا؟ جب کہ ذات قول کا ہی ثبوت نہیں ہے۔

ابن بطال نے کہا کہ پہلے یہ گزر چکا کہ امام جہر سے آمین کہے گا، اور یہ بھی گذرا کہ مقتدی کو امام کی پیروی کرنی چاہئے، لہٰذا اس کو بھی امام کی طرح جہر کرنا چاہئے، علامہ عینی نے فرمایا کہ یہ تاویل پہلی دو سے بھی زیادہ ابعد ہے، اور جو تلازم بتلایا ہے وہ بھی نا قابل تسلیم ہے کیونکہ اس سے تو یہ بھی لازم آئے گا کہ مقتدی امام کی طرح قرأتہ کا بھی جہر کرے، حالانکہ اس کا قائل کوئی بھی نہیں ہے، اور کرمانی نے بھی یہی تاویل کی ہے، شاید انہوں نے اس کو ابن بطال سے ہی لیا ہو اور ان کی تاویل باطل میں شرکت کر لی۔

غرض حدیث الباب سے کسی درجہ میں امام کا آمین کہنا تو نکل سکتا ہے، جس کو امام مالکؒ کے علاوہ حنفیہ وغیرہ نے مانا ہے لیکن جہر کا اثبات نہیں ہوسکتا۔ (عمدہ ص ۱۱۲/۳)

حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح ص ۲/۱۸۱ میں ابن بطال کی تاویل پر یہی اعتراض کیا ہے جو علامہ عینیؒ نے کیا ہے اور دوسری تاویل کر کے کچھ بات بنانے کی سعی کی ہے، پوری بحث پہلے آ چکی ہے، اس لئے اس کے جواب کی ضرورت نہیں۔

باب اذارکع دون الصف

صف میں پہنچنے سے پہلے رکوع کر لینے کا بیان

۷۴۴: حدثنا موسی بن اسمٰعیل قال حدثنا ھمام عن الاعلم وھو زیاد عن الحسن عن ابی بکرۃ انه انتھیٰ الی النبی صلے اللہ علیه وسلم وھو راکع فرکع قبل ان یصل الی الصف فذکر ذٰلک للنبی صلے اللہ علیه وسلم فقال زادک اللہ حرصاً ولاتعد

ترجمہ: حضرت ابوبکرہؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ نبی کریم ﷺ کے قریب اس حالت میں پہنچے کہ آپ رکوع میں تھے تو انھوں نے اس سے قبل کہ صف میں شامل ہوں رکوع کر دیا، پھر اس کا ذکر نبی کریم ﷺ سے کیا، آپ نے فرمایا:۔ اللہ تمہاری شوق زیادہ کرے، مگر اب ایسا نہ کرنا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ امام بخاریؒ کے نزدیک چونکہ مدرک رکوع مدرک رکعت نہیں ہوتا، کیونکہ اس نے فاتحہ نہیں پڑھی، اس طرح انھوں نے تواتر سلف کے خلاف اپنی الگ رائے بڑی سختی کے ساتھ قائم کر لی ہے، لہٰذا یہاں حضرت ابوبکرہؓ صحابی کے واقعہ کی حدیث لائے ہیں اور عنوان باب میں حکم کو حذف کر دیا ہے، کہ ایسی رکعت معتبر ہوگی یا نہیں، وہ جانتے تھے کہ سارے علماء سلف معتبر مانتے ہیں، پھر صاف طور سے کیونکر کہہ دیں کہ معتبر نہ ہوگی۔

حافظؒ نے یہاں امام بخاریؒ پر نقد کیا کہ اس بات کو بہت پہلے ابواب امامۃ کے ساتھ لانا تھا، جہاں عورت کو مردوں کی صفوف کے پیچھے الگ سے تنہا کھڑے ہونے کا حکم بھی مستقل باب قائم کر کے بتلایا تھا، علامہ عینیؒ نے لکھا کہ امام بخاری نے کسی کتاب کے بھی ذیلی ابواب میں باہم مناسبت تامہ کی رعایت نہیں کی ہے، اسی لئے ہر باب کو سابق باب سے یک گونہ مناسبت کافی ہے، اور یہاں بھی پہلے باب میں قراءۃ فاتحہ کے بعد آمین کا باب لائے تھے کہ فاتحہ اس پر ختم ہوتی ہے اس کے بعد رکوع کو لے آئے، اتنی مناسبت کافی ہے۔

علامہ عینی نے متعدد احادیث ذکر کر کے حضرت ابوبکرہؓ کا واقعہ تفصیل سے دکھایا ہے اور یہ بھی بتلایا کہ بہت سے صحابہ نے ان کے علاوہ بھی اسی طرح جماعت میں شرکت کی ہے، اور اس رکعت و رکوع کو بغیر فاتحہ کے معتبر سمجھا ہے، بلکہ ایک واقعہ دو صحابی کا یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دونوں نے اسی طرح رکوع میں شرکت کی تو ایک یہ سمجھ کر کہ رکوع سے رکعت نہیں ملی، کھڑا ہونے لگا کہ اس رکعت کو پڑھے، دوسرے ساتھی نے اس کو بٹھلا دیا اور کہا کہ تم نے تو رکعت پالی تھی ان سب واقعات کو پڑھ کر امام بخاری کا رسالہ جزء القراءت پڑھا جائے کہ کسی طرح اس رکعت کو معتبر ماننے پر تیار نہیں ہوئے، اور جمہور و سلف کے خلاف اپنی رائے پر مصر رہے۔

اس کے بعد یہ مسئلہ آتا ہے کہ صفوف رجال کے پیچھے اگر کوئی تنہا کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو اس کا حکم کیا ہے، حافظ عینیؒ نے لکھا کہ امام ابوحنیفہ، ابن المبارک، حسن بصری، امام مالک، شافعی، ابو یوسف، محمد، اوزاعی و ثوری وغیرہ کے نزدیک صحیح ہوگی مگر کراہت کے ساتھ، اور جس حدیث میں ہے کہ ایک شخص کی نماز صف کے پیچھے نہیں ہوتی اس کا مقصد یہ ہے کہ کامل نہیں ہوتی جیسے **لا وضوء لمن لم یسم** اور **لا صلٰوۃ لجار المسجد الا فی المسجد** وغیرہ میں کمال کی نفی ہے، اور ابن ماجہ اور وابصہ کی حدیث ضعیف ہے۔ امام شافعیؒ نے بھی فرمایا کہ اگر اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ہوتی تو میں اسی پر عمل کرتا۔ علامہ خطابی نے کہا کہ رکوع نماز کا جزو ہے، جب وہ صحیح ہو گیا ساری قوم سے الگ ہو کر تو اسی طرح باقی اجزاء بھی صحیح ہوں گے البتہ نماز مکروہ ہوگی، کیونکہ حضور علیہ السلام نے لاتعد فرمایا، کہ وہ ناپسندیدہ اور غیر افضل ہے۔

امام احمد، اسحٰق و ابن المنذر رشافعی، ابراہیم نخعی وغیرہ کے نزدیک اس کی نماز باطل ہوتی ہے۔ علامہ عینی نے یہاں دوسری احادیث بھی ذکر کریں، جن سے تنہا صف کے پیچھے نماز صحیح نہ ہونے کا ذکر ہے اور علامہ نے ان کے رجال رواۃ کا ضعف ثابت کیا۔ (عمدہ ص ۳/۱۱۶) اس سے بھی معلوم ہوا کہ بقول امام شافعیؒ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح قوی نہیں ہے۔

باب اتمام التکبیر فی الرکوع قاله ابن عباس عن النبی ﷺ و فیه مالک بن الحویرث

۷۴۵: حدثنا اسحٰق الواسطی قال حدثنا خالد عن الجریری عن ابی العلآء عن عمران بن حصین قال صلی مع علی بالبصرة فقال ذکرنا هذا الرجل صلوٰة کنا نصلیها مع رسول الله صلی الله علیه وسلم فذکر انه' کان یکبر کلما رفع و کلما وضع

۷۴۶: حدثنا عبدالله بن یوسف قال اخبرنا مالک عن ابن شهاب عن ابی سلمة عن ابی هریرة انه' کان یصلی بهم فیکبر کلما خفض ورفع فاذا انصرف قال انی لاشبهکم صلوٰة برسول الله صلی الله علیه وسلم

ترجمہ۷۴۵: حضرت عمران بن حصینؓ کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ میں حضرت علیؓ کے ساتھ نماز پڑھی، عمران کہتے ہیں کہ انھوں نے (یعنی علی مرتضیٰؓ) نے ہمیں وہ نماز یاد دلا دی، جو ہم رسول خدا ﷺ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ پھر عمرانؓ نے کہا کہ وہ جب اٹھتے تھے، اور جب جھکتے تھے، تکبیر کہتے تھے۔

ترجمہ۷۴۶: ابوسلمہ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے تو جب جھکتے تھے، اور اٹھتے تھے، تو تکبیر کہتے تھے، اور جب (نماز سے) فارغ ہوتے تھے تو کہتے تھے کہ میں نماز میں رسول خدا ﷺ کے ساتھ تم سب سے زیادہ مشابہ ہوں:۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ترجمۃ الباب کے لفظ اتمام میں دو معنی لئے جا سکتے ہیں، ایک یہ کہ تکبیر کو لمبا کر کے پوری حرکت انتقالیہ پر بچھا دیا جائے، دوسرے یہ کہ تکبیرات صلوٰۃ کا عدد پورا کیا جائے جس میں ایک تکبیر رکوع کی بھی ہے اور اگرچہ لفظ پہلے معنے کے لئے زیادہ مناسب ہے، مگر امام بخاری کی مراد دوسرے معنے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بنی امیہ کے بارے میں یہ بات شہرت کو پہنچ چکی تھی کہ وہ تمام تکبیرات کا اہتمام نہ کرتے تھے، مثلاً خفض کی حالت کے لئے تکبیر نہ کہتے تھے، اور عام طور سے بنی امیہ کے فسق و فجور پر نظر کرتے ہوئے، ان کے اس فعل کی تاویل بھی ضروری نہیں، مگر حضرت عثمانؓ سے بھی ایسی بات نقل ہوئی ہے۔ اس لئے اس کی وجہ پیش کرنی ضروری ہوگی۔

حدیث الباب میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نماز کا ذکر مدح کے ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ وہ تکبیرات پوری کرتے تھے، اور حضرت ابوہریرہؓ کا بھی ذکر دوسری حدیث میں آیا کہ وہ بھی ہر خفض و رفع کے وقت تکبیر کہا کرتے تھے۔

پھر یہ کہ حدیث میں جو یہ آتا ہے کہ حضور علیہ السلام ہر خفض و رفع پر تکبیر کہتے تھے، حالانکہ قومہ کی حالت میں بجائے تکبیر کے تسمیع و تحمید بھی مروی ہے، اس کی مزید وضاحت بھی حضرت ابوہریرہؓ کے عمل سے آگے کر دی گئی ہے کہ وہ پوری (چار رکعت کی) نماز میں ۲۲ مرتبہ تکبیر کہتے تھے۔ یعنی ہر رکعت میں پانچ کے حساب سے بیس اور ایک تکبیر تحریمہ اور ایک دو رکعت کے تشہد سے اٹھنے کی، کل ۲۲ ہو گئیں علاوہ ہر رکعت کی تسمیع و تحمید کے۔ کیونکہ حدیث تکبیر کل خفض و رفع کا عموم غیر مقصود ہے، اس کا مقصد ترک تکبیر عند الخفض کا رد ہے، تسمیع و تحمید کی نفی نہیں ہے۔

افادۂ انور: حضرتؒ نے فرمایا کہ خفض یعنی جھکنے کے وقت ترک تکبیر کی بات حضرت ابن عمرؓ سے بھی نقل ہوئی ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ اس وقت رفع یدین بھی نہ کرتے ہوں گے، کیونکہ تکبیر و رفع یدین کا ساتھ ہے، اور غالباً ان کے ترک کا منشأ ابوداؤد کی حدیث جہاد ہے، جس میں

ہے کہ حضور علیہ السلام اور آپ کے ساتھی لشکر والے جب کسی اونچے مقام پر چڑھتے تھے تو تکبیر کہتے تھے، اور کسی وادی میں اترتے تھے تو تسبیح کرتے تھے، پھر راوی نے کہا کہ اسی طریقہ پر نماز بھی مشروع ہوئی ہے۔

میرے نزدیک یہ آخری بات راوی کا اجتہاد ہے، اور جماہیر صحابہؓ کے مخالف ہے۔ نیز فرمایا کہ ایسی صورت میں ان کو اجتہاد نہ چاہئے تھا کیونکہ حضور علیہ السلام کو ۲۳ سال تک نماز پڑھتے دیکھا تھا اسی طرح کرتے ہوئے۔ ٹیلہ کی چوٹی پر پہنچ کر تکبیر کہے اور بار بار کہے، پھر انحدار کے وقت اگر ابتدا اوپر ہی ہوئی ہے۔ عند الاستواء تو اسی کا اعتبار ہے خواہ کچھ حصہ انحدار کا بھی بحالت تکبیر ہو جائے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک نماز میں بھی بعد الرکوع اور بعد السجود اسی طرح ہے، لیکن ابن عمرؓ مخالف سمجھے، یہاں تسلسل ہے اور کڑیاں ہیں جو سفر والی صورت کی کڑیوں سے ملتی ہیں۔ فتامل فیہ' اور بصورت تسلیم ہم کہیں گے کہ انحطاط کے وقت کی تکبیر صلوٰۃ اگرچہ ظاہر وحس کے لحاظ سے تو پستی کے وقت ہے مگر شرعاً وہ بلندی کی ہی ہے، کیونکہ قومہ کی تکبیر مثلاً اس کی ابتدا بھی قومہ کی حالت میں ہو جاتی ہے، اگرچہ وہ پھیل کر انحدار میں بھی پہنچ جاتی ہے۔ تو یہ درحقیقت ابقاء کی کیفیت ہے ابتدا کی نہیں۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عمرؓ سے جو ترک رفع بین السجدتین منقول ہے، وہ بھی شاید اسی لئے ہوگا کہ وہ خفض کی حالت میں تکبیر کو بہتر خیال نہ کرتے ہوں گے اس لئے رفع بھی ختم کیا، اگرچہ رفع یدین بین السجدتین کا ثبوت بھی ضرور ہے اور وہ کسی طرح قابل رد نہیں ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ امر تکبیر عند الخفض بھی جب ان کے اپنے اجتہاد کے تحت تھا، ایسے ہی رفع یدین میں بھی ان کا اجتہاد تھا کہ کہیں اختیار کیا اور کہیں ترک کر دیا۔

علامہ بنوریؒ نے معارف السنن ص ۲/۴۴۶ میں تکبیر عند کل خفض ورفع کی مختصر مگر عمدہ بحث کر دی ہے، اس میں بھی امراء بنی امیہ کی طرف ترک تکبیرات عند الخفض کا ذکر کیا گیا ہے، اور لکھا کہ اکابر امت نے بڑوں کے اس فعل کو ترک احیاناً اور بیان جواز پر محمول کیا ہے، اور فتح الباری میں جو مسند احمد سے حضرت عثمانؓ کو اول من ترک التکبیر کہا گیا ہے، اس کے مقابلہ میں طبرانی وغیرہ سے اول حضرت معاویہ یا زیاد کو دکھلایا ہے۔ اور لکھا کہ ایک جماعت اہل علم نے اس کو اخفاء پر محمول کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ کنز العمال ص ۴/۲۰۳ میں مصنف عبد الرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ سے حضرت انس کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ نبی کریم ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر و عثمان، تکبیروں میں کمی نہ کرتے تھے اور ایک لفظ میں یہ ہے کہ یہ سب تکبیروں کو پورا کرتے تھے، رکوع کے وقت بھی اور جب اٹھتے تھے اور جب بھی جھکتے تھے۔

اور ابوداؤد کی حدیث کو (جس میں حضور علیہ السلام سے تکبیر پوری نہ کرنے کا ذکر ہے) امام طحاوی نے دوسری احادیث و آثار کے مقابلہ میں گرایا ہے، حافظ نے بھی فتح ص ۲/۲۲۳ میں اس کو ضعیف قرار دیا ہے، اور امام بخاری کا قول ان کی تاریخ سے نقل کیا ہے کہ یہ حدیث ہمارے نزدیک باطل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ امام بخاری یہاں بخاری میں اتمام کی احادیث اسی لئے لائے ہیں کہ ابوداؤد کی حدیث مذکور کا رد ہو جائے۔ اور اس کا ناقابل استدلال ہونا واضح کر دیں۔ پھر بشرط تسلیم علماء نے کہا ہے کہ شاید حضور علیہ السلام نے ایسا بیان جواز کے لئے کیا ہو، یا پوری طرح جہر نہ کیا ہو، یا زیادہ کھینچ کر تکبیر نہ کہی ہو جس کو راوی نے عدم اتمام سے تعبیر کر دیا۔ (فتح ص ۲/۱۸۳)

امام طحاوی کا ارشاد

حافظؒ نے آخر میں یہ بھی لکھا کہ امام طحاویؒ نے نقل کیا کہ کچھ لوگ صرف رفع کے وقت تکبیر کہتے تھے اور خفض کے وقت نہ کہتے تھے، اور بنو امیہ بھی ایسا کرتے تھے، ابن المنذر نے حضرت ابن عمر اور بعض سلف سے بھی اس کو نقل کیا کہ وہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ تکبیرات نہ کہتے تھے، اور بعض نے منفرد و غیر منفرد کا فرق کیا کہ تکبیر مقتدیوں کے خبر دینے کے لئے تھی تاکہ انتقالات میں امام کا اتباع کریں لہٰذا منفرد کو ضرورت

نہیں، لیکن بالآخر مشروعیت تکبیرات عند کل خفض و رفع پر ہی استقرار ہو گیا ہے اسی لئے جمہور کے نزدیک علاوہ تکبیر تحریمہ کے سب تکبیرات مستحب قرار پا گئیں۔ صرف امام احمد اور بعض اہل ظاہر نے ان سب کو واجب کہا ہے۔

باب اتمام التکبیر فی السجود

سجدوں میں تکبیر کے پورا کرنے کا بیان

۷۴۷: حدثنا ابو النعمان قال حدثنا حماد بن زید عن غیلان بن جریر عن مطرف بن عبداللہ قال صلیت خلف علی بن ابی طالب انا و عمران بن حصین فکان اذا سجد کبر واذا رفع راسہ' کبر واذا نھض من الرکعتین کبر فلما قضی الصلوٰۃ اخذ بیدی عمران بن حصین فقال قد ذکرنی ھذا صلوٰۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم او قال لقد صلے بنا صلوٰۃ محمد صلے اللہ علیہ وسلم

۷۴۸: حدثنا عمرو بن عون قال اخبرنا ھشیم عن ابی بشر عن عکرمۃ قال رایت رجلاً عند المقام یکبر فی کل خفض و رفع واذا قام واذا وضع فاخبرت ابن عباسؓ فقال اولیس تلک صلوٰۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم لاام لک

ترجمہ ۷۴۷: مطرف بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اور عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو (میں نے ان کو دیکھا کہ) جب وہ سجدہ کرتے تھے، تکبیر کہتے تھے، اور جب اپنا سر (سجدے سے) اٹھاتے تھے، تکبیر کہتے تھے اور جب دو رکعتوں سے (فراغت کر کے تیسری رکعت کے لئے) اٹھتے تھے، تکبیر کہتے تھے، چنانچہ جب ہم نماز پڑھ چکے، تو عمران بن حصین نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، اور (مجھ سے) کہا کہ اس شخص (یعنی علی مرتضیٰؓ) نے مجھے حضرت محمد ﷺ کی نماز یاد دلا دی، یا یہ کہا کہ بے شک انھوں نے ہمیں حضرت محمد ﷺ کی سی نماز پڑھائی:۔

ترجمہ ۷۴۸: حضرت عکرمہ کا بیان ہے کہ میں نے ایک شخص کو مقام (ابراہیم) کے پاس دیکھا کہ وہ ہر جھکنے اور اٹھنے میں، اور جب کھڑا ہوتا تھا، اور جب بیٹھتا تکبیر کہتا تھا، میں نے حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا (کہ یہ کیسی نماز ہے) انھوں نے کہا، تیری ماں نہ رہے، کیا یہ نبی ﷺ کی (سی) نماز نہیں ہے۔

تشریح: یہاں بھی اتمام تکبیر کی تشریح مثل سابق ہے، حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ ہو سکتا ہے اس باب اور سابق میں بھی اتمام سے مراد صرف اتیان ہو، کہ نفس تکبیر کا کہنا ہی اتمام ہے اور اس کا ترک تقصیر ہے، لہٰذا دوسری تاویلوں کی ضرورت نہ ہوگی، حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس پر حاشیہ میں کچھ تائیدی وجوہ بھی پیش کیں، لیکن یہ بھی لکھا کہ ظاہر ہے اتمام کے اپنے اصل معنی ہی امام بخاری کی مراد معلوم ہوتے ہیں، جس کی تفصیل پہلے گذری ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم (لامع ص ۱/۳۱۵)

قولہ او لیس تلک صلوٰۃ النبی ﷺ. اس پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا دیکھا جائے کہ حضرت عکرمہ کتنی غلط فہمی میں پڑ گئے تھے کہ ایک امر منکر (ترک تکبیر) کو سنت اور سنت (تکبیر ہر رکن) کو منکر سمجھے ہوئے تھے اسی لئے حضرت ابن عباسؓ نے سختی کے ساتھ اس کا رد کیا اور بتلایا کہ اصل سنت نبویہ تو تکبیرات کو پورا کرنا ہی ہے، تراجم بخاری بھی اسی طرف مشیر ہیں کہ ابوداؤد کی حدیث عدم اتمام تکبیر والی

سے غلط فہمی نہ ہواور امام بخاری نے اپنا مختار بھی اہتمام ہی بتلایا اور اس کو متعدد تراجم سے ظاہر کیا۔

باب التكبير اذا قام من السجود

سجدوں سے جب (فارغ ہوکر) کھڑا ہو تو اس وقت تکبیر کہنے کا بیان

۷۴۹: حدثنا موسیٰ بن اسماعيل قال حدثنا همام عن قتادة عن عكرمة قال صليت خلف شيخ بمكة فكبر ثنتين و عشرين تكبيرةً فقلت لابن عباسؓ انه' احمق فقال ثكلتک امک سنة ابی القاسم صلے الله عليه وسلم وقال موسیٰ حدثنا ابان قال قتادة حدثنا عكرمة

۷۵۰: حدثنا يحيى بن بكير قال حدثنا الليث عن عقيل عن ابن شهاب قال اخبرنی ابوبكر بن عبدالرحمٰن بن الحارث انه' سمع اباهريرة يقول كان رسول الله صلے الله عليه وسلم اذاقام الیٰ الصلوٰة يكبر حين يقوم ثم يكبر حين يركع ثم يقول سمع الله لمن حمده' حين يرفع صلبه' من الركعة ثم يقول وهو قآئم ربنا لک الحمد ثم يكبر حين يهوی ثم يكبر حين يرفع راسه' ثم يكبر حين يرفع راسه' ثم يفعل ذلک فی الصلوٰة كلها حتیٰ يقضيها ويكبر حين يقوم من الثنتين بعد الجلوس وقال عبدالله بن صالح عن الليث ولک الحمد

ترجمہ ۷۴۹: حضرت عکرمہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کے پیچھے نماز پڑھی۔ تو اس نے بائیس ۲۲ تکبیریں کہیں، میں نے حضرت ابن عباسؓ سے کہا کہ وہ احمق ہے، حضرت ابن عباسؓ بولے، کہ تیری ماں تجھے روئے، ابوالقاسم ﷺ کی سنت یہی ہے، اور موسیٰ نے کہا ہم سے ابان نے بہ سندِ قتادہ وعکرمہ روایت کیا۔

ترجمہ ۷۵۰: حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن حارثؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ رسول خدا ﷺ جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے تھے تو کھڑے ہوتے وقت تکبیر کہتے تھے، پھر جس وقت رکوع کرتے تھے۔ تکبیر کہتے تھے، پھر رکوع سے اپنی پیٹھ اٹھاتے تو سمع الله لمن حمده کہتے تھے، پھر کھڑے ہوتے ہی ربنا لک الحمد کہتے تھے پھر جب (سجدہ کے لئے) جھکنے لگتے، تکبیر کہتے تھے، پھر جب اپنا سر (سجدے سے) اٹھاتے، تکبیر کہتے تھے، پھر جب سجدہ کرتے تھے تکبیر کہتے تھے، پھر جب اپنا سر (سجدے سے) اٹھاتے، تکبیر کہتے تھے، پوری نماز میں اسی طرح کرکے ختم کر دیتے، اور جب دو رکعتوں سے بیٹھ کر اٹھتے تھے، (تب بھی) تکبیر کہتے تھے۔

تشریح: قولہ احمق پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایسی دو روایات ہیں، ایک میں حضرت ابوہریرہؓ ہیں دوسرے میں کوئی اور ہے۔ لہٰذا یہ ضروری نہیں کہ حضرت عکرمہ نے احمق کا لفظ حضرت ابوہریرہؓ کے لئے ہی کہا ہو، اور بخاری ص ۱۰۸ بین السطور میں جو خلف شیخ بمکۃ کے نیچے امام طحاوی کے حوالہ سے حضرت ابوہریرہؓ کو متعین کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ امام طحاوی نے اس کی تصریح نہیں کی ہے۔ پھر کیا مناسب ہے کہ یہ نسبت کی جائے، اور حضرت ابوہریرہؓ ایسے جلیل القدر صحابی کو احمق کہلوایا جائے۔

ایک لفظ میں یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا تذکرہ کیا گیا حضرت ابن عباسؓ کے پاس تو فرمایا او ليس تلک صلوة رسول الله صلى الله عليه وسلم اور سارو روایت میں احمق کا لفظ نہیں ہے، دوسری حدیث خلف شیخ والی ہے اور اس میں احمق کا لفظ ہے، مگر امام طحاویؒ نے تصریح نہیں کی کہ وہ شیخ کون تھے۔

قوله ویکبر حین یقوم من الثنتین. حضرتؒ نے فرمایا کہ امام مالکؒ کے یہاں قاعدۂ اولیٰ کے لئے تکبیر نہیں ہے بلکہ مثل رکعت اولیٰ کے کھڑے ہوکر ہے، ممکن ہے امام بخاری نے یہاں اسی کی طرف اشارہ کیا ہو اور ثابت کیا کہ یہاں بھی تکبیر ہے۔

قوله فکبر لنتین و عشرین تکبیرة پر الابواب ص۲\۲۹۱ میں قسطلانی سے لکھا:۔ ہر رکعت میں پانچ تکبیر ہیں لہٰذا چار رکعت والی نماز میں ۲۰ ہوئیں علاوہ تکبیر تحریمہ و تکبیر قیام من التشہد الاول کے اور تین رکعات والی میں سترہ دو والی میں گیارہ ہوئیں اور پانچوں وقت میں ۹۴ چورانوے تکبیر ہوئیں۔

اذا قام من السجود تحقیق انیق

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو فرمایا کہ جس نے امام طحاویؒ کی طرف یہ نسبت کی کہ انہوں نے شیخ ابو ہریرہؓ کو قرار دیا، وہ صحیح نہیں ہے، اس کی گرہ عمدة القاری ص۳\۱۲۳ سے کھلتی ہے، کیونکہ اصل مغالطہ علامہ عینی ہی کو ہوا ہے، انہوں نے قولہ خلف شیخ پر لکھ دیا کہ اس کو امام طحاوی نے اپنی روایت میں ابر ہریرہ بیان کیا ہے۔ اور پھر ان کی روایت بھی نقل کی مگر اس میں شیخ کا لفظ نہیں ہے۔ بلکہ حضرت ابو ہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھنے کا ذکر ہے اور ان کے لئے عکرمہ نے احمق کا لفظ نہیں کیا ہے غرض روایات دو ہیں اور اس طرح کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔ فللّٰہ در الشیخ الانورؒ.

دوسری روایت مذکورہ کا حوالہ عینی و حافظ دونوں نے طحاوی کے علاوہ مسندِ احمد و طبرانی کا بھی دیا ہے۔ (فتح ص۲\۱۸۴)

باب وضع الاکف علے الرکب فی الرکوع وقال ابوحمید فی اصحابه امکن النبی صلے الله علیه وسلم یدیه من رکبتیه

۷۵۱: حدثنا ابوالولید قال حدثنا شعبة عن ابی یعفور قال سمعت مصعب ابن سعد صلیت الیٰ جنب ابی فطبقت بین کفی ثم وضعتهما بین فخذی فنهانیؔ ابی وقال کنا نفعله فنهینا عنه وامرنآ ان نضع ایدینا علیٰ الرکب

ترجمہ: حضرت معصب بن سعدؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے باپ کے پہلو میں (ایک مرتبہ) نماز پڑھی، تو میں نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر اپنی رانوں کے درمیان میں دبالیا، مجھے میرے باپ نے منع کیا، اور کہا کہ ہم ایسا کرتے تھے، تو ہمیں اس سے منع کر دیا گیا، اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنے ہاتھ (رکوع میں) گھٹنوں پر رکھ لیا کریں۔

تشریح: امام بخاریؒ نے اس باب میں رکوع کے وقت ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنے کی سنیت بتلائی ہے، اور تطبیق کا رد بھی کیا ہے جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے، امام ترمذیؒ سے نقل ہوا کہ تطبیق اہلِ علم کے نزدیک منسوخ ہوگئی ہے اس میں کوئی خلاف نہیں بجز اس کے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور آپ کے بعض اصحاب ایسا کرتے تھے۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ شاید حضرت ابن مسعودؓ کو نسخ کی خبر نہیں ہوئی۔ لیکن یہ بات حضرت ابن مسعودؓ سے مستبعد ہے کیونکہ وہ قدیم الاسلام ہیں اور حضور اکرم ﷺ کی خدمتِ مبارکہ میں اکثر اوقات گزارتے تھے اور آخر تک حضور علیہ السلام کے ساتھ رہے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کو نسخ کی خبر نہ ہوئی ہو۔ اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ تھی کہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے میں سہولت تھی اور اس کی اجازت بطور رخصت بعد کو دے دی گئی تھی جب لوگوں پر تطبیق شاق ہونے لگی تھی۔ اور حضرت ابن مسعودؓ بجائے رخصت کے عزیمت پر عامل تھے، کیونکہ عبادت میں جتنی مشقت زیادہ اتنا ہی ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا جن لوگوں نے حضرت ابن مسعودؓ پر اس بارے میں طعن کیا ہے، وہ افراط فی التعصب ہے، ؛ (کیونکہ حنفیہ کے بہت سے مسائل میں ان کی تائید دیکھ کر وہ ان کے ساتھ بھی تعصب برتنے لگے تھے، واللہ اعلم)۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ تطبیق کا ثبوت تو حضرت علیؓ سے بھی ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں آپ کا ارشاد مروی ہے کہ جب تم رکوع کرو تو

چاہے تطبیق کرو، چاہے گھٹنوں پر ہاتھ رکھو۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ بھی دونوں کو برابر سمجھتے تھے، لہٰذا تطبیق کو مکروہ بہ کراہت تنزیہ بھی نہیں کہہ سکتے، نیز علامہ عینیؒ نے لکھا کہ حضرت عمرؓ نے بھی تطبیق کرنے والوں کو نماز لوٹانے کا حکم نہیں دیا۔ (عمدہ ص ۳\۱۲۶)

باب اذالم یتم الرکوع

اگر کوئی شخص رکوع کو پورا نہ کرے

۷۵۲: حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا شعبة عن سليمان قال سمعت زيد بن وهب قال رای حذيفة رجلاً لا يتم الركوع والسجود وقال ماصليت ولومت مت علىٰ غير الفطرة التی فطر الله محمداً صلے الله عليه واله وسلم

ترجمہ۷۵۲: حضرت زید بن وہب کا بیان ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ رکوع اور سجدوں کو پورا نہ کرتا تھا، انہوں نے (اس سے) کہا کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اور اگر تو مرے گا، تو اس دین کے خلاف پر مرے گا، جس پر اللہ نے محمد ﷺ کو پیدا کیا تھا۔

تشریح: یہاں سے امام بخاریؒ نے متعدد ابواب تعدیلِ ارکان کی ضرورت و اہمیت بتلانے کے لئے باندھے ہیں، اور حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ جس قدر تاکید تعدیلِ ارکان کی نماز میں ہے اور کسی کی نہیں ہے، تقریباً پچاس حدیثیں اس میں وارد ہیں، اور اس کو فطرۃ نبی بتایا ہے، جو اظہار اہمیت کے لئے کافی ہے۔

تعدیلِ ارکان یہ ہے کہ بدن ہیئت طبعی پر پہنچ جائے اور حرکت انتقال مبدل بہ سکون ہو جائے۔ حافظ ابن حجر نے لکھا کہ طمانینتِ مطلوبہ فی الصلوٰۃ یہ ہے کہ حرکت جاتی رہے، جیسا کہ اس کی تفسیر حدیث ابی حمید (ص ۲\۱۹۵) میں آنے والی ہے (فتح ص ۲\۱۸۷) **باب الطمانينة حين يرفع راسه من الركوع** میں ابوحمید نے کہا کہ حضور علیہ السلام اپنا سر مبارک اٹھا کر مستوی ہو جاتے حتی کہ ہر عضو اپنی جگہ قرار پکڑ لیتا تھا۔ (فتح ص ۲\۱۹۵)

قوله ما صليت پر حافظ نے لکھا کہ یہ حضور علیہ السلام کے ارشادِ مسیئی للصلوٰۃ کی نظیر ہے، آپ نے اس کو فرمایا تھا کہ تم نے نماز نہیں پڑھی (فتح ص ۲\۱۸۶) علامہ عینیؒ نے حافظ کا قولِ مذکور نقل کر کے پھر علامہ تیمی کا قول نقل کیا کہ مراد صلوٰۃِ کاملہ کی نفی ہے، لہٰذا نفی کمالِ صلوٰۃ کی ہوئی، حقیقتِ صلوٰۃ کی نہیں، اور یہی مذہب امام ابوحنیفہ و امام محمدؒ کا ہے کہ رکوع میں طمانینت فرض نہیں ہے، بخلاف امام ابو یوسفؒ کے (عمدہ ص ۲\۱۲۶) (کیوں کہ وہ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ وغیرہ کے ساتھ ہیں) حنفیہ کے نزدیک اگر تعدیل ارکان نہ کرے تو اس کا یہ فعل مکروہ تحریمی ہوگا کیونکہ دوسری حدیث سے نماز کا درست ہونا مع نقصان کے ثابت ہوا ہے جس سے وجوب کا درجہ نکلتا ہے اور ترکِ واجب سے اعادہ واجب ہوتا ہے، نہ کرے گا تو ترکِ واجب کا گناہ ہوگا۔ دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ نماز ہی سرے سے نہیں ہوتی۔

باب استوآء الظهر فے الركوع وقال ابوحميد في اصحابه ركع النبی صلی الله عليه وسلم ثم هصر ظهره

(رکوع میں پیٹھ کر برابر کرے کا بیان) اور ابوحمیدؓ نے اپنے دوستوں کے جلسہ میں یہ بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع فرمایا، اس کے بعد اپنی پیٹھ کر جھکا دیا۔

تشریح: علامہ عینی نے لکھا کہ استواءِ ظہر سے مراد یہ ہے کہ پیٹھ کو رکوع میں سیدھا کر لے، اور سر کو بھی اس کے برابر کر لے نہ اونچا کرے نہ نیچا کرے۔ اس تعلیق کو امام بخاری آگے باب سنته الجلوس فی التشهد میں موصولاً بھی لائیں گے۔ (عمدہ ص ۱۲۷\۳)

باب حد اتمام الركوع و لا اعتدال فيه والطمانينة

رکوع کے پورا کرنے اور اس میں اعتدال واطمینان کی حد کا بیان

۷۵۳: حدثنا بدل بن المحبر قال حدثنا شعبة قال اخبرنی الحكم عن ابن ابی ليلیٰ عن البرآء قال كان ركوع النبی صلی الله عليه وسلم وسجوده و بين السجدتين واذا رفع من الركوع ماخلا القيام والقعود قريباً من السوآء

ترجمہ ۷۵۳: حضرت براء روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ کا رکوع اور آپ کے سجدے اور سجدوں کے درمیان کی نشست اور (وہ حالت) جب کہ آپ رکوع سے اپنا سر اٹھاتے تھے، تقریباً برابر ہوتے تھے بجز قیام اور قعود کے (کہ یہ طویل ہوتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا کہ راوی نے یہاں چار چیزوں کا برابر ہونا بتلایا رکوع، سجود، قومہ وجلسہ، اور قیام وقعود کو مستثنیٰ کیا کیونکہ حضور علیہ السلام کے قیام میں تو تنوع ثابت ہوا ہے کبھی بہت طویل بھی کیا ہے اور کبھی بہت مختصر بھی۔ حسب موقع وضرورت چنانچہ کبھی آپ نے صبح کی نماز میں معوذتین بھی پڑھی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ طویل قرائۃ شروع فرمائی اور کسی بچہ کے رونے کی آواز سنی تو رکوع کر دیا۔ یہ سب کچھ ثابت ہے، مگر رکوع وسجود میں غطر بود کہیں ثابت نہیں ہے، یعنی ان کا پیمانہ تقریباً یکساں ہی رہا ہے، اور مسلم شریف میں جو قیام وقعود اور ان چاروں کی برابر والی روایت ہے وہ بظاہر مسامحت ہے، اور تسویہ صرف چار ہی میں ہے۔

میرے نزدیک مرادِ شارع ظاہر ومتعین ہو جانے کے بعد راویوں کے الفاظ پر جمود کرنا مناسب نہیں، نہ ان میں تاویل کی ضرورت اور جس نے تاویل کی اس نے تناسب کی بات نکالی ہے کہ اگر قرائۃ طویل ہوتی تھی تو باقی افعال میں بھی طوالت ہوتی تھی اور اگر وہ مختصر ہوتی تو باقی افعال میں بھی اختصار ہوتا تھا لیکن میرے نزدیک راجح وہی ہے جو بخاری میں ہے۔ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حدِ اتمام غیر منضبط ہے ترجمۃ الباب میں الطمانینۃ کے لفظ کے جو صحیح بخاری کے حوض میں ہے حضرت شاہ صاحبؒ نے غلط بتلایا، اور فرمایا کہ صحیح طمانیت ہے۔ جو اوپر بطور نسخہ دیا ہے۔

حضرتؒ درسِ بخاری شریف میں فرمایا کرتے تھے کہ اکثر مواضع میں حوض کے لفظ سے حاشیہ کا لفظ زیادہ صحیح اور راجح ہوتا ہے اور بعض اہم مواضع میں اس پر خاص طور سے تنبیہ فرما دیا کرتے تھے، جیسے کہ یہاں فرمائی۔

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ تلمیذ علامہ کشمیریؒ نے تقریباً چالیس سال بخاری شریف مرادآباد میں دیو بند میں پڑھائی ہے، ان کو ایسے مواضع خوب یاد تھے، اور حضرت شاہ صاحبؒ کے ارشادات پر نہایت اعتماد فرمایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ کی صدارتِ دار العلوم دیو بند میں مرادآباد سے دیو بند آئے اور حضرتؒ کے درس بخاری شریف میں شرکت کی، حضرتؒ صحیح اور تیز قرائۃ کرنے کو بہت پسند فرماتے تھے، مولانا فخر الدین صاحب سے قرائۃ کے لئے ارشاد فرمایا، اور اس روز مولانا نے ہی قرائۃ کی۔ مولانا کو اس میں بڑی مہارت حاصل تھی کہ جو صحیح یا راجح لفظ ہوتا وہی پڑھتے تھے خواہ وہ حوض میں ہو یا حاشیہ پر، اور بڑی روانی سے پڑھ جاتے تھے، چنانچہ قرائۃ کے درمیان کئی جگہ مولانا نے حاشیہ کا لفظ پڑھا، حضرتؒ نے ٹوکا تو کہا کہ میرے نزدیک یہی لفظ زیادہ صحیح ہے، اس لئے یہی پڑھوں گا۔ رحمهم الله رحمة واسعة.

باب امر النبی صلے اللہ علیہ وسلم الذی لایتم رکوعہ' بالاعادۃ

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شخص کو جو رکوع کو پورا نہ کرے' نماز کے دوبارہ پڑھنے کا حکم دینے کا بیان)

۷۵۴: حدثنا مسدد قال حدثنا یحیی بن سعید عن عبیداللہ قال حدثنی یحیی بن سعید عن عبیداللہ قال حدثنی سعید المقبری عن ابیہ عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخل المسجد فدخل رجل فصلی ثم جآء فسلم علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فرد علیہ النبی صلے اللہ علیہ والہ وسلم السلام فقال ارجع فصل فانک لم تصل فصلی ثم جآء فسلم علی النبی صلے اللہ علیہ وسلم فقال ارجع فصل فانک لم تصل ثلاثاً فقال والذی بعثک بالحق مآاحسن غیرہ' فعلمنی فقال اذاقمت الی الصلوٰۃ فکبر ثم اقرأ ماتیسر معک من القراٰن ثم ارکع حتیٰ تطمئن راکعاً ثم ارفع حتیٰ تعتدل قآئماً ثم اسجد حتیٰ تطمئن ساجداً ثم ارفع حتیٰ تطمئن جالساً ثم اسجد حتیٰ تطمئن ساجداً ثم افعل ذٰلک صلوٰتک کلھا

ترجمہ ۷۵۴: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ (ایک مرتبہ) نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے، اتنے میں ایک شخص آیا، اور اس نے نماز پڑھی، اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس نے سلام عرض کیا تو نبی کریم ﷺ نے اسے سلام کا جواب دے کر فرمایا، کہ جا نماز پڑھ اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اس نے پھر نماز پڑھی، اس کے بعد پھر آیا اور نبی کریم ﷺ کو سلام کیا۔ آپ نے فرمایا، جا نماز پڑھ، اس لئے کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اسی طرح تین مرتبہ (آپ نے) فرمایا، تب اس نے کہا، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے اس ذات کی قسم! میں اس سے بہتر نہیں پڑھ سکتا لہٰذا آپ مجھے تعلیم فرما دیجئے! تو آپ نے فرمایا کہ جب تو نماز کے لئے کھڑا ہو، تو تکبیر کہہ، بعد اس کے جس قدر قرآن تجھے یاد ہو پڑھ اس کے بعد رکوع کر جب اطمینان سے رکوع کر لے تو اس کے بعد سر اٹھا کر سیدھا کھڑا ہو جا، اس کے بعد سجدہ کر، جب اطمینان سے سجدہ کر چکے تو سا کے بعد سر اٹھا کر اطمینان سے بیٹھ جا، اس کے بعد (دوسرا) سجدہ کر، جب اطمینان سے سجدہ کر چکے تو اپنی پوری نماز میں اسی طرح کر۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: **قولہ علیہ السلام** ارجع فصل سے معلوم ہوا کہ نماز میں کسی مکروہ تحریمی کا ارتکاب ہو جائے تو اس

---

[1] **نماز جماعت کی شرعی حیثیت:** ہدایہ میں جماعت کو سنتِ مؤکدہ لکھا ہے اور حلبی کبیر ص ۵۰۸ میں یہ تفصیل ہے:۔ امام احمدؒ کے نزدیک فرضِ عین ہے بغیر عذر ترک سے نماز نہ ہوگی، اور بعض نے فرضِ کفایہ قرار دیا۔ امام محمدؒ نے الاصل میں کہا کہ جماعت سنتِ موکدہ ہے، بغیر عذر مرض وغیرہ کے اس کے ترک کی اجازت نہیں، ہمارے اکثر مشائخ نے جماعت کو واجب کہا ہے:۔ المفید میں بھی واجب قرار دیا ہے اور اس کو سنت کہنا اس لئے ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے، بدائع میں بھی عقلاءِ بالغین قادرین علی الجماعۃ پر واجب لکھا اور عذر کی حالت کو مستثنیٰ کیا۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ حنفیہ کے یہاں اس کا درجہ سنتِ مؤکدہ قریب بوجوب کا ضرور ہے۔

اوجز ص ۲۱۴ میں علامہ ابن رشد سے نقل کیا کہ جمہور کے نزدیک جماعت کی نماز سنت یا فرضِ کفایہ ہے اور ظاہریہ فرضِ عین کہتے ہیں۔ علامہ عینیؒ سے نقل کیا کہ سنتِ موکدہ ہے، جیسا کہ قدوری میں ہے اور شرح ہدایہ میں ہمارے اکثر مشائخ سے وجوب نقل ہوا ہے، اور بعض نے فرض کفایہ کہا جو امام طحاوی و کرخی وغیرہ کا بھی مختار ہے۔

حافظ نے لکھا کہ امام احمد اوزاعی وغیرہ کے نزدیک فرضِ عین ہے، اور امام احمد کا ایک قول واجب غیر شرط کا ہے، امام شافعی فرض کفایہ کہتے ہیں اور اسی پر ان کے جمہور متقدمین اصحاب ہیں۔ اور اسی کے قائل کثیر حنفیہ و مالکیہ بھی ہیں، باقی حضرات کا مشہور مذہب سنت موکدہ کا ہے۔

اوجز ص ۲۱۵ میں لکھا:۔ مالکیہ کا ظاہر مذہب سنت فی البلد و فی کل مسجد و فی حق کل مصلی ہے اور شہر کے لوگ جماعتِ مسنونہ قائم کرنے میں سستی کریں تو ان سے قتال کیا جائے۔ ابن رشد و ابن بشیر نے کہا کہ شہر کے لوگوں پر جماعت کا قائم کرنا فرضِ کفایہ ہے اور ہر مسجد میں سنت ہے اور ہر شخص کے حق میں مستحب ہے۔

جمہور نے بہت سی احادیث سے استدلال کیا ہے، جن میں دو یہ ہیں ایک تفاضل والی، کیونکہ نماز جماعت اور اس میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نماز کا اعادہ واجب ہے اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر نماز جماعت سے رہ جائے تو گھر میں تنہا پڑھ لے تو اس کا بھی اعادہ ہونا چاہئے، کیونکہ جماعت بھی واجب[1] ہے۔ ترک واجب کی وجہ سے اعادہ ہونا چاہئے۔ جیسا کہ یہاں واجب تعدیلِ ارکان کے ترک کے سبب سے حضور علیہ السلام نے نماز کا اعادہ کرایا ہے، علامہ شامی کو اس میں تردد ہوا کہ کیا حکم ہو کیونکہ نماز کا اعادہ کرائیں تو اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں، دوبارہ بھی تنہا ہی پڑھے گا، اور اگر اعادہ کا حکم نہ کریں تو کلیہ مذکورہ ٹوٹتا ہے۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ مجھے کوئی تردد نہیں ہے بلکہ جزم ویقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اعادہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ کلیہ مذکورہ اس صورت کے لئے ہے کہ اعادہ سے فائدہ ہو یا اس کے تلافی ہو سکے، اور یہاں اعادہ بے سود ہے۔

دوسری طرف یہ بھی ہے کہ حدیث الباب کی وجہ سے تعدیل کو فرض کے درجہ میں بھی نہیں پہنچا سکتے، کیونکہ اعادہ کا حکم تعدیل کی فرضیت پر مبنی نہیں ہے، جیسا کہ امام بخاری نے خیال کیا ہے، بلکہ ممکن ہے کہ وہ حکمِ اعادہ بطور ایک قسم کی تعزیر و تنبیہ کے ہو، اور یہی بظاہر ہے بھی کیونکہ حضور علیہ السلام نے اس شخص کو باوجود غلطی کے بھی اسی عمل کے پھر اعادہ کا حکم دیا۔ تاکہ وہ متنبہ ہو کر اصلاح کر لے، اور اگر سرے سے وہ عمل باطل محض ہی ہوتا جیسا کہ ترکِ فرض کی صورت میں ہونا چاہئے تو اس کو اعادہ کا حکم نہ دیتے، ناقص کے اعادہ کا حکم تو معقول ہو سکتا ہے، باطل محض کا نہیں۔ لہٰذا تعدیل کو فرض قرار دینے والوں کے لئے حدیث میں کوئی حجت نہیں ہے۔

حنفیہ کی ایک غلطی پر تنبیہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ مسئ الصلوٰۃ والی حدیث الباب کو حضرت ابو ہریرہؓ نے بھی روایت کیا ہے اور حضرت رفاعہ ابن رافع نے بھی اور حضرت ابو ہریرہؓ کے تمام طرقِ روایات میں ''ثم اقرأ ما تیسر من القرآن'' ہے، اور اس سے حنفیہ نے عدمِ رکنیتِ فاتحہ پر استدلال کیا ہے، میرے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ فاتحہ اگرچہ حنفیہ کے نزدیک رکن وفرض کے درجے میں نہیں ہے مگر پھر بھی وہ واجب تو ہمارے یہاں بھی ہے۔ اور یہاں تعلیم کا موقع ہے، اگر ہم مان لیں کہ حضور علیہ السلام نے اس شخص کو فاتحہ کی تعلیم نہیں دی تو اس سے لازم آئے گا کہ کراہتِ تحریم کی (جو ترکِ واجب کو لازم ہے) تعلیم دی گئی، جو شارع علیہ السلام کی طرف کسی طرح بھی منسوب نہیں کی جا سکتی۔

دوسرے یہ کہ فاتحہ پڑھنے کا حکم اگرچہ ترمذی وغیرہ کی حدیثِ رفاعہ میں نہیں ہے، مگر وہ روایتِ ابی داؤد میں تو بصراحت موجود ہے، اس کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے، بلکہ میرے نزدیک وہ اجمالی طور سے حدیثِ ابی ہریرہ میں بھی موجود ہے کیونکہ اصل تیسیر کا حکم جو قرآن مجید میں ہے وہ باعتبار حصص شب وطولِ قیام کے ہے، فاتحہ کے لحاظ سے نہیں ہے اور یہاں بھی بدوی کو سہولت اس لئے دی گئی کہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کچھ بھی قرآن مجید پڑھ سکتا ہے یا نہیں، اسی لئے یہ بھی روایت میں ہے کہ یہ بھی نہ ہو سکے تو تحمید وتکبیر کر لے۔ غرض ایسی کچی باتوں سے استدلال حنفیہ صحیح نہیں ہے۔

حضرتؒ کی وسعتِ نظر اور انصاف

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) جو نماز ہی نہ ہو تفاضل نہیں ہو سکتا، دوسری درجات والی حدیث کیونکہ اگر منفرد کی نماز کا کوئی درجہ ہی نہ ہوتا تو نماز جماعت سے اس کو ۲۵ یا ۲۷ درجہ کم بتانا کیسے صحیح ہوتا؟ اور تقدیم عشاء (طعامِ شب) نماز عشاء پر، اور سکینت واطمینان کے ساتھ شرکتِ جماعت کے حکم سے بھی عدمِ فرضیت کا ثبوت ہوتا ہے کیونکہ واجبات و فرائض ایسی چیزوں کی وجہ سے ترک نہیں کئے جا سکتے وغیرہ۔ اوجز میں مکمل ومدلل بحث قابلِ دید ہے۔ پھر اعذارِ ترکِ جماعت جو شامی میں ۲۰ تک لکھے ہیں، ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جماعت کی نماز سنتِ موکدہ یا واجب وفرضِ کفایہ کے قریب تو ہو سکتی ہے مگر شرطِ صحتِ صلوٰۃ یا فرضِ عین نہیں ہو سکتی۔ کیا کسی فرضِ عین کو بارش یا مرض وغیرہ کی وجہ سے ترک کر سکتے ہیں؟ اعذارِ ترکِ جماعت میں سے ہم چند کو یہاں درج کرتے ہیں:۔ بیماری، بارش۔ سخت سردی۔ بڑھاپے کی کمزوری ومعذوری، قصدِ سفر، کھانے کی زیادہ خواہش، رات کی تند وتیز ہوا، تاریکی، کسی بیمار کی خدمت، بول وبراز کا تقاضہ، دینی فقہی مشغولیت۔ بدائع وبحر میں یہ بھی ہے کہ کسی کی جماعت رہ جائے تو اس پر دوسری مسجد میں جا کر نماز جماعت ادا کرنے کی کوشش واجب نہیں ہے، اگر چلا جائے بہتر ہے ورنہ اپنی مسجد میں ہی تنہا پڑھ لے۔ (معارف ص ۱۴۷ ج ۱)

ایسے مواقع میں حضرتؒ کی وسعتِ نظر اور محدثانہ بالغ نظری اور انصاف پسندی کی داد دینی پڑتی ہے، کہ کہیں بھی اور کسی سے بھی کوئی غلطی ہو، خواہ اپنوں سے یا دوسروں سے، حضرتؒ اس کو برداشت نہ کرتے تھے، اور واضح فیصلہ صادر کر دیتے تھے اور حضرتؒ اس پر بھی سختی سے عامل تھے کہ بغیر سارے طرق واسانید ومتونِ احادیث پر نظر کئے ہوئے کوئی فیصلہ نہ کرتے تھے۔

خیال ہوتا ہے کہ شاید علامہ کوثری نے جو خود بھی بے نظیر متبحر حنفی عالم تھے، حضرت شاہ صاحبؒ کے مؤلفہ رسائل کا مطالعہ کر کے یہ فیصلہ صحیح ہی دیا تھا کہ شیخ ابن ہمام کے بعد سے اس پانچ سو برس کے عرصہ میں ایسا محقق محدث عالم پیدا نہیں ہوا۔

خدا کا شکر ہے راقم الحروف کو علامہ موصوف سے بھی تلمذ کا شرف حاصل ہوا ہے، اور ۹-۱۰ ماہ کے قیامِ مصر میں ان کی بیشتر علمی مجالس میں شرکت کا موقع میسر ہوا، وہ بھی حضرت شاہ صاحبؒ کی طرح کبھی کسی کی غلط تعریف نہ کرتے تھے، اور مدح وذم کا معیار دونوں کا یکساں تھا، اس لئے کوئی یہ خیال ہرگز نہ کرے کہ علامہ نے یوں ہی تعریف کر دی تھی۔ اور حضرتؒ کے علوم وکمالات کا ایک ادنیٰ ثبوت خود انوارالباری آپ کے سامنے ہے۔

حضرتؒ نے اس موقع پر شیخ ابن الہمام کی ایک تحقیق پر اصولی وحدیثی نقد بھی کیا ہے، جو اہلِ علم کے لئے نہایت قیمتی علمی تحفہ ہے، وہ فیض الباری ص ۲/۳۰۰ میں بھی ہے اور اس کی تفصیل فصل الخطاب میں ہے وہاں دیکھی جائے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ امام ابن ہمام جیسا حاذقِ فن چاروں مذاہب میں نہیں ہے۔ نیز فرمایا کرتے تھے کہ اصولِ فقہ میں امام ابن ہمام کی نظیر نہیں ہے چاروں فقہ میں علامہ قاسم سے بھی بڑھ کر ہیں۔

باب الدعآء فی الرکوع

(رکوع کی حالت میں دعا کرنے کا بیان)

۷۵۵: حدثنا حفص بن عمر قال حدثنا شعبة عن منصور عن ابی الضحیٰ عن مسروق عن عآئشة قالت کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول فی رکوعه وسجوده سبحٰنک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی

ترجمہ: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنے رکوع اور اپنے سجدوں میں کہا کرتے تھے **سبحانک اللّٰھم ربنا وبحمدک اللّٰھم اغفرلی۔** (اے اللہ میں تیری پاکی بیان کرتا ہوں اے ہمارے پروردگار میں تیری تعریف بیان کرتا ہوں، اے اللہ مجھے بخش دے) جب تک **سبح اسم ربک الاعلیٰ** اور **سبح اسم ربک العظیم** کا نزول نہ ہوا تھا، اس وقت تک حضور انور ﷺ اس قسم کی ادعیہ پڑھتے تھے، اس کے بعد **سبحان ربی العظیم** اور **سبحان ربی الاعلیٰ** مقرر ہو گیا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ میرے نزدیک تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے رکوع میں دعا کی شرعاً اجازت ہے۔ اور حدیث الباب سے بھی ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے دعاءِ مغفرت کی۔ امام بخاریؒ کی نظر حدیثِ مسلم پر ہوگی جس میں ہے کہ رکوع میں تعظیمِ رب کرو، اور بندہ سب سے زیادہ قریب خدا سے سجدہ میں ہوتا ہے، اس لئے زیادہ امید ہے کہ تمہاری دعا سجدہ میں قبول ہو، لیکن تعظیمِ رب دعا کے منافی نہیں ہے، اس لئے رکوع میں تعظیم رب بھی کرے گا اور مختصر دعا بھی کر سکتا ہے۔ تاہم اگر امام بخاری کا ارادہ صحیح مسلم کی حدیث کا اسقاط ہو تو وہ صحیح نہیں، کیونکہ اس میں تقابل مقصود نہیں ہے کہ ایک چیز ہو تو دوسری نہ ہو لہٰذا اگر صرف دفعِ وہم مقصود ہے تو ٹھیک ہے۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

علمی وحدیثی فائدہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے جس حدیثِ مسلم کا حوالہ دیا ہے، اس کی ابتداء میں یہ بھی ہے کہ رکوع وسجود کی حالت میں تلاوتِ قرآن مجید کی ممانعت کی گئی ہے اور علامہ ابن رشدؒ نے لکھا کہ یہی سارے فقہاءِ امصار کا مذہب ہے، لیکن کچھ تابعین نے اس کا جواز کہا ہے اور امام بخاری کا مذہب بھی یہی ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس کیلئے صحیح حدیث نہیں ہے، علامہ نے لکھا کہ اس کیلئے حضرت علیؓ کی حدیث

بھی ہے اور وہ بھی بقول طبری حدیثِ صحیح ہے۔ اور مسلم میں مستقل باب قائم ہوا نہی وممانعت قرآن کا رکوع وسجود میں، اور آٹھ احادیثِ صحیحہ درج کی ہیں اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امام بخاری نے مسلم کی صحیح احادیث کو سا بارے میں ترک کر دیا ہے۔

علامہ ابن رشدؒ نے اسی موقع پر ص ۱\۱۱۰ میں مزید لکھا کہ اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ رکوع میں دعا کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت نے اس کو جائز کہا ہے اور امام بخاری بھی اسی کے قائل ہیں۔ لیکن امام مالک نے اس کو مکروہ کہا ہے (ممکن ہے یہاں امام بخاری نے امام مالک کا رد کیا ہو) پھر لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ نماز کے اندر صرف اس دعا کی اجازت دیتے ہیں جو الفاظِ قرآن مجید میں ہو، امام مالک و شافعی بغیر الفاظِ قرآن کے بھی دعا کو جائز کہتے ہیں، واضح ہو کہ امام مالک رکوع کے علاوہ نماز کے اندر تمام حالتوں میں اور ہر قسم کی دینی و دنیوی حاجات کے لئے دعا کو جائز فرماتے ہیں۔ (کمافی الابواب ۲\۲۹۳)

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا کہ مبسوط سرخسی میں فرض نمازوں کے اندر اذکار وادعیہ سے روکا ہے، مگر میرے نزدیک ابن امیر الحاج کا قول راجح ہے کہ فرض نمازوں میں اور جماعت میں بھی اذکار وادعیہ جائز ہیں بشرطیکہ مقتدیوں پر ان سے گرانی نہ ہو، اور فرمایا کہ ''مواہب لدنیہ'' میں نماز کے مواضعِ ادعیہ کی تفصیل خوب ہے۔ اس کی مراجعت کی جائے۔

باب مایقول الامام ومن خلفه' اذا رفع راسه' من الركوع

۷۵۶: حدثنا ادم قال حدثنا ابن ابی ذئب عن سعید المقبری عن ابی هریرة قال كان النبی صلی الله علیه وسلم اذاقال سمع الله لمن حمده' قال اللهم ربنا ولك الحمد وكان النبی صلی الله علیه وسلم اذا ركع واذا رفع راسه' یكبر واذاقام من السجدتین قال الله اكبر

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ جب **سمع اللّٰہ لمن حمدہ** کہتے تھے، تو (اس کے بعد) **اللّٰھم ربنا ولک الحمد** (بھی) کہتے، اور جب رکوع کرتے اور (رکوع سے) اپنا سر اٹھاتے تکبیر کہتے تھے، اور جب دونوں سجدوں سے (فارغ ہو کر) کھڑے ہوتے تھے، تو اللہ اکبر کہتے تھے۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اس موقع پر لامع ص ۱\۳۱۶ اور الابواب ص ۲\۲۹۳ میں مفید علمی تحقیقات جمع فرما دی ہیں، ضروری واہم یہ ہے کہ حدیث الباب سے ثابت ہوا کہ حضور علیہ السلام نے سمع اللہ لمن حمدہ بھی کہا اور **اللّٰھم ربنا ولک الحمد** بھی، اور جب آپ نے جمع کیا تو آپ کے مقتدی صحابۂ کرام نے بھی جمع کیا ہوگا۔ اور امام ابوحنیفہؒ سے بھی ایک روایت جمع کی ہے، لیکن چونکہ اکثر احادیث میں تقسیم وارد ہے، تو آپ کا مشہور مذہب بھی تقسیم ہی ہے، اور منفرد کے لئے تو ائمہ اربعہ سے جمع منقول ہے، حافظ نے لکھا کہ امام طحاوی و ابن عبدالبر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے، امام کے لئے یہ ہے کہ امام احمد، شافعی، ابو یوسف و محمد جمع کے قائل ہیں، امام ابوحنیفہ و امام مالک کہتے ہیں کہ امام فقط **سمع اللّٰہ لمن حمدہ** کہے اور مقتدی عند الجمہور فقط **ربنا لک الحمد** کہے صرف امام شافعی اس کے لئے جمع کے قائل ہیں اور امام بخاری نے بھی اکثر شارحین کے نزدیک امام شافعی کی موافقت کی ہے الخ یہ عجیب بات ہے کہ امام شافعی کے قولِ جمع کو نقل کر کے حافظ ابن حجر نے لکھا کہ اس بارے میں کوئی صحیح حدیث نہیں ہے (فتح ص ۲\۱۹۳) اس طرح حافظ نے امام شافعی و امام بخاری دونوں کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ **والحق احق ان یقال.** (مؤلف)

دوسری بحث یہ ہے کہ تحمید کن الفاظ میں افضل ہے، اوجز ص ۱\۲۱۰ سے تفصیل ملاحظہ ہو:۔

(۱) حنفیہ: علامہ شامی نے کتب حنفیہ سے لیا کہ سب سے افضل **اللّٰھم ربنا ولک الحمد** ہے۔ پھر **اللّٰھم ربنا لک الحمد**

(بحذف واؤ) پھر ربنا ولک الحمد (بحذف اللھم واثباتِ واو) پھر ربنا لک الحمد (بحذف اللھم وواو) یعنی ان چاروں کلمات میں افضلیت اسی مذکورہ ترتیب سے ہے۔ (غالباً سہولت کے خیال سے مختصر کلمہ کو اختیار کرلیا گیا ہے)

(۲) حنابلہ: صاحب المغنی نے حنابلہ کے نزدیک افضل ربنا ولک الحمد لکھا (جو امام مالک سے بھی منقول ہے) دوسرا اللّٰھم ربنا لک الحمد۔

(۳) مالکیہ: میں سے ابن القاسم نے افضل اللھم ربنا ولک الحمد کو قرار دیا جو حنفیہ کے یہاں بھی نمبر ایک پر ہے، اور مدونہ میں ہے کہ ابن القاسم نے بیان کیا کہ مجھے امام مالک نے ایک دفعہ اللھم ربنا لک الحمد کہا اور ایک مرتبہ اللھم ربنا ولک الحمد کہا اور فرمایا کہ یہ دوسرا کلمہ مجھے زیادہ محبوب ہے۔

(۴) شافعیہ: امام شافعیؒ نے ربنا لک الحمد کو اختیار کیا۔ اور فرمایا کہ واؤ عطف کے لئے ہوتی ہے اور یہاں کوئی صحیح چیز نہیں ہے جس پر عطف کیا جائے، اس بات کا "درایت وروایت دونوں کے اعتبار سے رد کیا گیا ہے کہ اول تو یہ روایات میں ثابت ہے، دوسرے یہ کہ عطف مقدر پر بھی جائز ہے اور خود علامہ نووی شافعی نے لکھا کہ ولک بالواو کی صورت میں وہ ماقبل سے متعلق ہوگا، یعنی "سمع اللّٰہ لمن حمدہ" "ربنا فاستجب دعائنا ولک الحمد علی ھدایتنا"۔ حافظ نے نقل کیا کہ محقق ابن دقیق العید مالکی شافعیؒ نے کہا کہ "اثباتِ واو سے معنی زائد نکلتے ہیں کیونکہ تقدیرِ عبارت مثلاً اس طرح ہوگی:۔ ربنا استجب ولک الحمد، لہٰذا اس میں دعا اور خبر دونوں کا مضمون آجائے گا"۔ اور یہ صورت واو عاطفہ کے لئے ہے، اور باب التکبیر اذا قام من السجود میں اس کو حالیہ قرار دینے کا قول بھی گذر چکا ہے، اور اکثر حضرات نے ثبوت واو ہی کو راجح قرار دیا ہے، اور اثرم نے کہا کہ میں نے امام احمدؒ سے سنا کہ وہ ربنا ولک الحمد میں واو کو ثابت مانتے تھے، اور کہتے تھے کہ اس میں متعدد احادیث ثابت ہیں:۔ (فتح الباری ص ۲/۱۹۲) اور ابن الاثیر نے واو حالیہ کے سوا دوسری صورتوں کو ضعیف قرار دیا ہے۔ غرض امام شافعیؒ ایسے عالمِ عربیت سے یہاں واو کا انکار بہت ہی عجیب ہے۔

علامہ ابن القیم کا تفرد: آپ نے الہدیٰ میں کہا کہ ربنا لک الحمد، یا ربنا ولک الحمد اور اللّٰھم ربنا لک الحمد یہ تین صورتیں تو حدیثِ صحیح سے ثابت ہیں، باقی اللھم ربنا ولک الحمد والی صورت اللھم اور واو کو جمع کرکے صحیح نہیں ہے۔

اول تو اسی حدیث الباب بخاری میں حضور علیہ السلام ہی سے ثابت ہوا کہ آپ اللّٰھم ربنا ولک الحمد کہتے تھے۔ پھر آگے بھی باب فضل اللّٰھم ربنا ولک الحمد میں خود ترجمہ میں بھی بخاری میں واو پر اصیلی، کشمیہنی، اور مستملی تین کاتبینِ صحیح بخاری کے نشانات نسخوں کے لگے ہوئے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان تینوں کے نسخوں میں واو موجود ہے اور اللھم بھی۔ پھر اسی باب کی حدیث الباب میں بھی "اللھم ربنا ولک الحمد" کی واو پر اصیلی کے نسخہ کا نشان ہے، غرض یہاں بخاری میں ہی تین مواضع میں اللھم اور واو کا اجتماع موجود ہے، اور علامہ ابن القیم نے فرمادیا کہ یہ اجتماع صحیح نہیں ہے یا صحیح میں نہیں ہے۔

اوپر بھی ہم نے بیانِ مذاہب کے ذیل میں معتبر حوالوں کے ساتھ واضح کیا ہے کہ امام اعظمؒ اور امام مالک کے نزدیک سب سے زیادہ شرفِ فضیلت کلمۂ اللّٰھم ربنا ولک الحمد ہی کو حاصل ہے۔ جس میں واو بھی ہے اور اللھم بھی۔

حافظ ابن حجرؒ نے قولہ باب فضل اللھم ربنا لک الحمد پر لکھا کہ کشمیہنی کی روایت میں ولک الحمد ہے واو کے ساتھ، اور اس سے ابن القیم کا رد ہوا کیونکہ انہوں نے یقین کے ساتھ دعویٰ کردیا کہ اللھم اور واو کے جمع کے ساتھ کوئی حدیث وارد نہیں ہوئی۔ (فتح ص ۲/۱۹۲۰)

علامۂ محدث زرقانی شارح موطا امام مالکؒ نے لکھا کہ اللھم ربنا لک الحمد میں ایک روایت واو کے ساتھ بھی ہے جس سے ابن القیم کا رد ہوا کہ انہوں نے جزم کے ساتھ اس جمع کو غیر ثابت کہہ دیا ہے۔ (شرح الزرقانی ص ۱/۱۸۲)

التاج الجامع للاصول ص ۱۱۷۰ میں بخاری کی روایت **وکان النبی ﷺ اذا قال سمع اللّٰہ لمن حمدہ قال اللّٰھم ربنا ولک الحمد** نقل کی، اور روایت **اذا قال الامام سمع اللّٰہ لمن حمدہ فقولوا اللّٰھم ربنا ولک الحمد فانہ من وافق الخ** بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد وترمذی پانچوں ائمۂ حدیث سے نقل کی۔

علامہ محدث باجی مالکیؒ نے لکھا کہ روایتِ سعید عن ابی ہریرہؓ میں **اللّٰھم ربنا ولک الحمد** وارد ہے اور امام مالک سے نقل ہوا کہ وہ اسی طرح کہا کرتے تھے۔ اور اسی کو ابن القاسم مالکی نے بھی اختیار کیا ہے۔ (اوجز ص ۱\۲۵۳)

دیکھا جائے کہ حافظ ابن حجر، حافظ زرقانی، علامہ باجی اور صاحب التاج ایسے اکابر محدثین جس کلمۂ تحمید کا ثبوت صحیح بتلاتے ہیں اور صحیح میں مان رہے ہیں، علامہ ابن قیم نے دعویٰ کے ساتھ اس کا انکار کردیا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ان کے استاذ محترم حافظ ابن تیمیہؒ اور خود انہوں نے بھی دعویٰ کیا تھا کہ کسی صحیح حدیث میں درود شریف کے کلمات میں لفظ ابراہیم وآلِ ابراہیم ایک ساتھ جمع ہوکر مروی نہیں ہوئے ہیں، حالانکہ خود بخاری جیسی اصح الکتب میں بھی یہ دونوں لفظ جمع ہوکر آئے ہیں اور اسی غلط دعا کی تردید حافظ ابن حجر نے بھی کی ہے ملاحظہ ہو فتح الباری ص ۱۱\۱۲۴، پوری تفصیل اس سلسلہ کی انوار الباری ص ۱۱\۸۹ تا ص ۱۱\۹۳ میں شائع شدہ ہے اور حافظ نے بھی آٹھ احادیثِ صحاح نقل کر کے ان دونوں حضرات کا رد کیا ہے۔ اور یہاں بھی حافظ ابن حجر کا ردِ ابن القیم آپ کے سامنے ہے۔

ہم نے انوار الباری ص ۱۱\۱۰۹ میں یہ بھی لکھا تھا کہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رجالِ حدیث سے کما حقہ واقف نہ تھے، ورنہ وہ حدیث ثمانیۃ اوعال جیسی احادیثِ منکرہ شاذہ پر اعتماد کر کے عقائد واصول کا اثبات ان سے ہرگز نہ کرتے۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ حافظِ حدیث ابوبکر صامتی حنبلیؒ نے مستقل رسالہ حافظ ابن تیمیہ کی اغلاط فی الرجال پر تالیف کیا تھا اور حافظ ابن القیم کے ضعف وعدم حذاقت فی معرفۃ الرجال کی تصریح تو حافظ ذہبیؒ نے بھی المعجم المختص میں کی ہے جبکہ وہ ان دونوں حضرات کے بڑے مداح ومعتقد بھی تھے۔

اعلام الموقعین کا ذکر

افسوس ہے کہ باوجود اس حدیثی ضعف کے بھی حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین لکھی، جس میں ائمۂ مجتہدین (امام اعظم وامام مالک و شافعیؒ) پر الزامات ترکِ احادیث کے لگائے ہیں، اور یہ خیال نہ کیا کہ ان اکابرِ امت کے پاس ان کی پیش کردہ احادیث سے زیادہ قوی وصحیح احادیث موجود تھیں، جن پر انہوں نے اپنے مسائل مختارہ کی بنیاد رکھی ہے، اور ان حضرات کی حدیث دانی اور محققانہ بصیرت اور علم بالرجال کی شہادت ساری دنیائے اسلام کے محدثینِ کبار نے دی ہے، حافظ ابن تیمیہ اس بارے میں ابن القیم سے غنیمت تھے کہ انہوں نے اعلام الموقعین والی لمبی اڑان سے پرہیز کیا۔ اور انہوں نے ائمہ مجتہدین کی بڑی حد تک عزت بھی کی ہے، یہ اور بات ہے کہ بقول حضرت علامہ کشمیریؒ کے جب وہ کسی مسئلہ میں اپنی الگ دھنتے ہیں تو دوسروں کی نہیں سنتے۔ اور جن مسائل میں تفرد اختیار کیا ہے، ان میں وہ ساری امت سے الگ ہوکر رہ گئے ہیں اس اجمال کی تفصیل بہت ہے اور ہم نے کچھ زیارتِ نبویہ اور توسلِ نبوی کی بحث میں لکھا بھی ہے، ملاحظہ ہو انوارالباری جلد یازدہم۔

اکابرِ امت پر جرح وتنقید

خدا کی شان کہ جو خود معرفتِ رجال میں ضعیف اور غیر معتمد تھے، انہوں نے ائمۂ مجتہدین پر مخالفتِ حدیث کا طعن کیا حالانکہ معرفتِ رجال وعللِ حدیث کا علم، علمِ حدیث کا نصف مانا گیا ہے۔ اور جب تک کوئی اس فن میں کامل دستگاہ نہ رکھتا ہو۔ اس کو ایسے اکابرِ امت پر حرف گیری کسی طرح بھی موزوں نہیں، جن کی حدیثی وفقہی بلند وبرتر شان کو سارے اکابر محدثینِ امت نے تسلیم کرلیا ہے۔

حافظ الدنیا ابن حجر عسقلانی کو دیکھئے کہ بمشکل کوئی اہم اختلافی مسئلہ ایسا ہوگا جس میں وہ امام طحاوی حنفی یا ابن عبدالبر مالکیؒ کی حدیث یا

رائے کا حوالہ نہ دیتے ہوں، اور ابھی آپ نے دیکھا کہ حافظ ابن قیم کی حدیث دانی پر کیسی کڑی تنقید کی ہے، اور اسی طرح فتح الباری میں کتنی ہی جگہ حافظ ابن تیمیہ پر بھی نقد کیا ہے، اور یہ بھی ابھی گزرا کہ خود حافظ ابن حجر ایسے متعصب شافعی المسلک نے اپنے عظیم مقتدا امام شافعیؒ کے اختیار کردہ ایک مسئلہ پر (جس میں امام بخاری بھی ساتھ ہیں) کہہ دیا کہ اس کے لئے ان کے پاس کوئی صحیح حدیث نہیں ہے، لیکن ان ہی جیسوں کو یہ حق پہنچتا بھی ہے، ہر ایک کو نہیں، انہوں نے تو ایک مرتبہ علی وجہ البصیرت فقہِ حنفی کے اصولِ استنباطات کی احقیت کا اعتراف کر کے یہ بھی ارادہ کر لیا تھا کہ حنفی بن جائیں، مگر پھر ایک خواب کی بنا پر اس حقیقت کو بھی خواب میں بدل دیا تھا۔ ولا راد لقضانه.

حافظ ابن تیمیہ وابن القیمؒ کی جلالت قدر

ہم حافظ ابن تیمیہ وابن القیم کی جلالتِ قدر، اور علمی خدمات کا تہِ دل سے اعتراف کرتے ہیں اور امتِ مرحومہ پر جو ان کے احسانات ہیں ان کو کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کر سکتے، مگر ان دونوں کے لئے اکابر امت کی مخالفت اور نقد وجرح کا حق ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اور ان میں بڑی کمی ہے تو یہی کہ جن مسائلِ اصول وفروع میں انہوں نے جمہور سلف وخلف اور خود اپنے مقتدا امام احمدؒ کا بھی خلاف کیا ہے، وہ ان کے لئے موزوں نہ تھا، اور ہمارے نزدیک ان کے دلائل خلاف میں کوئی قوت وجان نہیں ہے۔ بس صرف اتنا سا ہمارا ان سے اختلاف ہے جس پر ہم آخر تک قائم رہیں گے ان شاء اللہ۔ کیونکہ کسی بھی خوف وطمع کے تحت ابن الوقتی اختیار کر لینا ہمارے نزدیک بدترین کردار کا مظاہرہ ہے واللہ یقول الحق وهو يهدى السبيل.

باب فضل اللهم ربنا ولک الحمد (اللهم ربنا ولک الحمد) کہنے کی فضیلت کا بیان

۷۵۷: حدثنا عبدالله بن يوسف قال اخبرنا مالک عن سمى عن ابى صالح عن ابى هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال اذاقال الامام سمع الله لمن حمده' فقولو اللهم ربنا ولک الحمد فانه' من وافق قوله' قول الملّئكة غفر له' ماتقدم من ذنبه

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے، تو تم اللّٰہم ربنا ولک الحمد کہو، کیونکہ جس کا قول ملائکہ کے قول سے موافق ہو جائے گا اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

تشریح: اس مسئلہ پر کافی بحث اوپر آ چکی ہے، یہاں حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ ارشاد لائق ذکر ہے کہ امام کے لئے تسمیع وتحمید کا جمع کرنا امام ابو حنیفہؒ سے بھی ایک روایت میں ثابت ہے۔ اور بعض اکابر فقہائے حنفیہ نے اس پر فتویٰ بھی دیا ہے مثلاً حلوانی، فضل بن محمد اور ابو علی نسفی نے۔ اگرچہ مشہور روایت تقسیم ہی کی ہے۔

قولہ من وافق قولہ قول الملائکہ

قول الملائکہ اس لئے فرمایا گیا کہ فرشتوں کے یہاں قرآن مجید کی قرأۃ نہیں ہے اور ان کیلئے صرف اذکار و اوراد کا باب ہے فقط۔ (قال الشیخ الانورؒ)

۷۵۸: حدثنا معاذ بن فضالة عن هشام عن يحيىٰ عن ابى سلمة عن ابى هريرة قال لاقربن صلوٰة النبى صلى الله عليه وسلم فكان ابوهريرة يقنت فى الركعة الأخرة من صلوٰة الظهر وصلوٰة العشآء وصلوٰة الصبح بعد مايقول سمع الله لمن حمده فيدعو للمؤمنين ويلعن الكفار

۷۵۹: حدثنا عبدالله بن ابی الاسود قال حدثنا اسمٰعیل عن خالد الحذآء عن ابی قلابة عن انس قال کان القنوت فی الفجر والمغرب

۷۶۰: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن نعیم بن عبدالله المجمر عن علی بن یحیٰ بن خلاد الزرقی عن ابیه عن رفاعة بن رافع الزرقی قال کنا یوماً نصلی ورآء النبی صلے الله علیه وسلم فلما رفع راسهٗ من الرکعة قال سمع الله لمن حمده قال رجل ورآءهٗ ربنا ولک الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیه فلما انصرف قال من المتکلم قال انا قال رایت بضعةً وثلثین ملکاً یبتدرونها ایهم یکتبها اول

ترجمہ۷۵۸: حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ میں تمہاری نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز کے قریب کردوں گا، چنانچہ ابوہریرہؓ نماز ظہر اور نماز عشاء اور نماز فجر کی آخری رکعتوں میں سمع اللہ لمن حمدہ کے بعد دعاءِ قنوت پڑھتے تھے۔ مومنوں کے حق میں دعائے خیر اور کفار پر لعنت کرتے تھے۔

ترجمہ۷۵۹: حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (نبی کریم ﷺ کے زمانے میں) فجر اور مغرب (کی نماز) میں قنوت پڑھی جاتی تھی۔

ترجمہ۷۶۰: حضرت یحیٰ بن خلاد روایت کرتے ہیں کہ رفاعہ بن رافع زرقی نے کہا کہ ہم ایک دن نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے، تو (ہم نے دیکھا، کہ) جب آپ نے اپنا سر رکوع سے اٹھایا، تو فرمایا سمع اللہ لمن حمدہٗ، ایک شخص نے آپ کے پیچھے کہا کہ اے ہمارے پروردگار تیرے ہی لئے تعریف ہے، بہت تعریف پاکیزہ جس میں برکت ہے، تو آپ نے فارغ ہو کر فرمایا، کہ یہ کلمات کہنے والا کون تھا، اس شخص نے عرض کیا کہ میں تھا، آپ نے فرمایا کہ میں نے کچھ اوپر تیس فرشتوں کو دیکھا کہ وہ ان کلمات کے لکھنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الابواب والتراجم میں لکھا کہ اکثر نسخوں میں اسی طرح یہ باب بلا ترجمہ ہے، اور بعض میں باب القنوت ہے، چونکہ پہلے باب میں بعد رکوع تسمیع وتحمید کا ذکر آیا تھا، یہاں اس کے بعد قنوت کا ذکر مناسب ہوا کہ وہ بھی بعد رکوع کے اور تسمیع وتحمید کے بعد ہوتی ہے، حضرت علامہ کشمیریؒ نے فرمایا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک دعاءِ قنوت تو صبح کی نماز میں پورے سال ہوتی ہے اور نماز وتر میں فقط آدھے رمضان میں ہے، لیکن یہاں حدیث الباب میں ذکر قنوتِ نازلہ کا ہے اور یہ حنفیہ کے نزدیک جہری نماز میں ہے، اور یہی قول امام احمد وثوری کا بھی ہے، دوسرا قول حنفیہ کا نمازِ فجر کے لئے ہے اور چونکہ احادیثِ صحیح قویہ میں یہ قبل الرکوع بھی ہے اور بعد الرکوع بھی اس لئے اس میں بھی حنفیہ کے دونوں قول ہیں، شافعیہ کے یہاں قنوتِ نازلہ سب نمازوں میں جائز ہے، اور سب ہی میں قنوت کا جہر ہے، حضرتؒ نے فرمایا کہ سری نمازوں میں جہرِ قنوت کی بات بہت ہی عجیب وغریب ہے، اور اس کے لئے انہوں نے جس حدیثِ ابی داؤد سے استدلال کیا ہے وہ ضعیف ہے۔

حافظ نے قولہ فکان ابوھریرۃؓ الخ پر لکھا کہ کہا گیا بخاری کی حدیث الباب کے مرفوع حصہ سے صرف قنوت کا وجود ثابت ہوا، مذکورہ ساری نمازوں میں وقوع ثابت نہیں ہوا۔ کیونکہ وہ موقوف ہے حضرت ابوہریرہؓ پر، اور اس کی وضاحت تفسیر نساء میں آئے گی جس میں مرفوع کی تخصیص ہے نمازِ عشا کے ساتھ۔ اور ابوداؤد کی روایتِ اوزاعی عن یحیٰ میں بھی ایک ماہ تک عتمہ کی نماز میں قنوت کا ذکر ہے اور اس جیسی روایت مسلم میں بھی ہے۔ الخ (فتح الباری ص ۲/۱۹۳)

مزید تفصیل کے لئے فتح الملہم معارف السنن اور معانی الآثار دیکھی جائے۔ امام بخاری کا رجحان سری وجہری سب نمازوں میں قنوتِ نازلہ جائز ہونے کا معلوم ہوتا ہے، جو امام شافعی اور دوسرے بعض اہلِ حدیث کا بھی مذہب ہے، مگر ساری احادیثِ قنوت پر نظر کرنے پر اس کی تائید نہیں ہوتی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام طحاوی نے جو کلام قنوتِ نازلہ کے بارے میں کیا ہے، اس سے متوہم ہوتا ہے کہ وہ اس کے نسخ کے قائل ہیں، مگر وہ صحیح نہیں کیونکہ علامہ عینیؒ نے شرح ہدایہ میں امام طحاوی سے مسئلہ فقہیہ نقل کیا ہے کہ قنوت نازلہ حنفیہ کے یہاں بھی ہے۔ اور فرمایا کہ ہمارے

یہاں قنوت نازلہ جہریہ میں ہے جیسا کہ شرح ہدایا میر اتقانی میں ہے، اور شرح شمس الدین زدی میں مطلقا نمازوں کے اندر جواز نقل ہوا ہے۔

قولہ رایت بضعۃ و ثلاثین پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک روایت میں ۱۲ فرشتوں کا ذکر ہے، میرے نزدیک دو واقعات الگ الگ ہیں۔

تجسّدِ معانی: **قولہ ان یکتبھا:** فرمایا کہ مسلم میں **ایھم یصعد بھا** اول ہے۔ میرے نزدیک معانی کا تجسد (جسد کی صورت اختیار کر لینا) اور اعراض کا تجوہر (جوہر کی صورت اختیار کرنا) عقل و نقل سے ثابت ہے، لہٰذا کلماتِ مذکورہ کا آسمانوں کی طرف چڑھنا کوئی مستبعد امر نہیں ہے۔

نفی علم غیب نبوی کی دلیل

نیز فرمایا کہ نبی کریم ﷺ پر جوامت کے درود شریف پیش ہونے کی حدیث آتی ہے کہ فرشتے مقرر ہیں وہ حضور کی خدمت میں اس کو لے جا کر پیش کرتے ہیں، اس سے بعض لوگوں نے نفی علم غیبِ نبوی کے لئے استدلال کیا ہے، مگر میرے نزدیک وہ صحیح نہیں، اگر چہ یہ بات اپنی جگہ طے ہے اور مسئلہ بھی یہی ہے کہ حضور علیہ السلام کے علم کی نسبت علمِ الٰہی کے لحاظ سے ایسی ہی ہے جیسی ایک متناہی کو غیر متناہی سے ہوتی ہے، کیونکہ فرشتوں کے پیش کرنے کا مقصد بعینہٖ ان کلمات کو بطور تحفہ کے بارگاہِ نبوت میں پیش کرنا ہے خواہ آپ کو ان کا علم پہلے سے ہو یا نہ ہو، جیسا کہ بارگاہِ رب العزت میں ہمارے اعمال فرشتوں کے ذریعہ پیش کئے جاتے ہیں، اور اس سے حق تعالیٰ کے علم کی نفی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا کبھی تو پیش کرنے کی غرض علم ہوتی ہے اور کبھی دوسرے مقاصد ہوتے ہیں۔ اس فرق کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے اور موقعِ استدلال میں کچی بات نہیں اختیار کرنی چاہئے۔

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے نفی علم غیب نبوی کے لئے یہ بھی کہہ دیا گیا کہ علم غیب جزئی تو پاگل و مجنوں کو بھی ہوتا ہے یہ بھی ایک بے محل منطقی طریقہ کا استدلال تھا، جس کے جواب میں دوسری طرف سے یہ بات سنی پڑی کہ علمِ غیب ذاتی، اور کلی تو ہم بھی حضور علیہ السلام کے لئے نہیں مانتے، صرف جزئی اور وہبی ہی مانتے ہیں، مگر فرق یہ ہے کہ وہ لوگ ایسا علمِ جزئی مانتے ہیں جو حضور علیہ السلام کے لئے منقصت کا پہلو رکھتا ہے اور ہم وہ مانتے ہیں جو آپ کے لئے منقبت کا درجہ بنتا ہے۔

غرض حق تعالیٰ عزّ اسمہ کے علمِ غیب کلی و ذاتی کا مسئلہ ہو، یا اس کی قدرتِ کاملہ غیر متناہیہ کا بیان ہو، یا امکانِ کذب امکانِ نظیر و امتناعِ نظیر کی بحث ہو وغیرہ وغیرہ، کسی کے لئے بھی موقعِ استدلال و بحث میں ایسا طریقہ اختیار کرنا جس سے حقائق ثابتہ پر غیر مقصود اور غلط اثرات وارد ہوں موزون و مناسب نہیں۔

حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ امکانِ کذب کی تعبیر مضر ہے، عوام کیا سمجھیں گے کہ امکانِ ذاتی اور وقوعی میں کیا فرق ہے، وہ تو یہی خیال کریں گے کہ خدا جھوٹ بول سکتا ہے۔ نعوذ باللہ۔ امکانِ نظیر کو بھی عوام کیسے سمجھیں گے کہ وہ امتناع بالغیر کے ساتھ جمع ہونے والا امکان ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبوت بالذات اور بالعرض کی تعبیر بھی مجھے اوپری لگتی ہے۔ مشکلات القرآن میں بھی اس پر کلام کیا ہے۔

وفقنا اللّٰہ تعالیٰ لما یحب ویرضیٰ

باب الطمانینۃ حین یرفع راسہ من الرکوع وقال ابو حمید رفع النبی صلے اللہ علیہ وسلم واستویٰ حتی یعود کل فقالیہ مکانہ

۷۶۱: حدثنا ابو الولید قال حدثنا شعبۃ عن ثابتؒ قال کان انس ینعت لنا صلوٰۃ النبی صلے اللہ علیہ وسلم فکان یصلی فاذا رفع راسہ من الرکوع قام حتیٰ نقول قد نسی

۷۶۲: حدثنا ابوالولید قال حدثنا شعبة عن الحکم عن ابن ابی لیلیٰ عن البرآء قال کان رکوع النبی صلے اللہ علیہ وسلم وسجودہ' واذارفع راسہ' من الرکوع و بین السجدتین قریباً من السوآء

۷۶۳: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زید عن ایوب عن ابی قلابة قال کان مالک بن الحویرث یرینا کیف کان صلوٰۃالنبی صلے اللہ علیہ وسلم وذاک فی غیروقت صلوٰۃ فقام فامکن القیام ثم رکع فامکن الرکوع ثم رفع راسہ فانصب ھنیة قال فصلی بناصلوٰۃ شیخنا ھذا ابی یزید وکان ابویزید اذا رفع راسہ' من السجدۃ الاٰخرۃ استویٰ قاعداً ثم نھض

ترجمہ۷۶۱: حضرت انسؓ ہمارے سامنے نبی کریم ﷺ کی نماز کی کیفیت بیان کرتے تھے، تو وہ نماز پڑھ کر بتاتے تھے پس جس وقت وہ اپنا سر رکوع سے اٹھاتے، تو اتنے کھڑے رہتے کہ ہم کہتے، کہ یقیناً یہ (سجدے میں جانا) بھول گئے۔

ترجمہ۷۶۲: حضرت براءؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا رکوع، اور آپ کے سجدے اور جب کہ آپ اپنا سر رکوع سے اٹھاتے تھے، اور دونوں سجدوں کی درمیانی نشست تقریباً (سب ہی) برابر ہوتے تھے۔

ترجمہ۷۶۳: حضرت ابوقلابہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں، کہ مالک بن حویرثؓ ہمیں نماز کے وقت کے علاوہ یہ دکھایا کرتے تھے کہ نبی کریم ﷺ کی نماز اس طرح ہوتی تھی، ایک دن وہ کھڑے ہوئے، اور انہوں نے پورا قیام کیا، اس کے بعد رکوع کیا اور پورا رکوع کیا، اس کے بعد سر اٹھایا اور تھوڑی دیر سیدھے کھڑے رہے، ابوقلابہ کہتے ہیں، کہ (اس وقت) مالک بن حویرث نے ہمیں ہمارے اس شیخ یعنی ابویزید کے مثل نماز پڑھائی، اور ابویزید جب اپنا سر دوسرے سجدے سے اٹھاتے تھے تو سیدھے بیٹھ جاتے تھے، اس کے بعد کھڑے ہوتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ احادیث الباب سے نماز کے اندر ہر رکن کو پوری طرح کرنے کا ثبوت ہے کہ جسم کا ہر عضو اپنی جگہ پر سکون سے ہو جائے، گویا شریعت کی نظر میں طول قیام کی اتنی اہمیت و اعتناء نہیں جتنا کہ مواضع اربعہ میں تعدیل کا ہے۔ اسی لئے قیام کی مقدار حالات و حاجات کے اقتضاء کے موافق قصیر و طویل ہر قسم کی وارد ہوئی ہے، لیکن مواضع اربعہ میں حضور علیہ السلام کا معمول ہمیشہ یکساں رہا ہے۔

اس پر میں نے کشف الستر میں بھی لکھا ہے۔ **قولہ "حتی نقول قد نسی"** پر فرمایا کہ اس سے جہاں قومہ کا طول معلوم ہوا یہ بھی مفہوم ہوا کہ یہ عام عادت حضور علیہ السلام کی نہ تھی۔ پھر حضرتؒ نے ذکر کیا کہ ایک عالم دیوبند آیا کرتے تھے، جو کسی کے یہاں کھانا نہ کھاتے تھے، (لعلہ لشدۃ ورعہ) اور نماز بھی کسی کے پیچھے نہ پڑھتے تھے، اور بخاری کی حدیث الباب سے استدلال کرتے تھے کہ مروجہ قومہ سے نماز نہیں ہوتی، میں نے کہا کہ لفظِ نسی دلالت کرتا ہے کہ بہت کم ایسا پیش آیا ہے، عام عادتِ مبارکہ اس کی نہ تھی، لہٰذا حدیث تو اس کے خلاف بتلا رہی ہے جو وہ سمجھے تھے۔

جلسۂ استراحت: قولہ استوی قاعدا۔ پر فرمایا کہ میرا وجدان نہیں کہتا کہ جلسۂ استراحت سنتِ راتبہ ہو، بلکہ احیاناً بوقتِ حاجت ایسا ہوا ہے، جس کو مستقل سنت سمجھ لیا گیا۔ امام طحاویؒ نے بھی اس کو ضرورت ہی پر محمول کیا ہے۔

میں نے شافعیہ کے مسلک پر یوں بھی کلام کیا ہے کہ نماز کے اندر تکبیرات کا شمار تو ۲۲ نقل ہوا ہے، پھر اگر جلسۂ استراحت کو مان لیں تو یا تو تکبیرات بڑھ جائیں گی، یا تکبیر کا ترک لازم آئے گا، حالانکہ حضور علیہ السلام کا معمول ہر خفض و رفع کے لئے تکبیر کہنے کا تھا، اور شافعیہ نے جو تاویل کی ہے وہ بھی دیکھ لی جائے کس درجہ کی ہے کہ ایک ہی تکبیر کو جو سجدہ سے اٹھنے کے وقت ہوتی ہے اس کو ہم اتنا لمبا کر دیں گے کہ وہ جلسۂ استراحت پر بھی حاوی ہو اور دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے تک بھی چلتی رہے۔

حضرتؒ نے مزاحاً فرمایا کہ یہ اتنی لمبی چکر والی تکبیر شاید مصری لہجہ کی ہوگی؟! میرے نزدیک یہ بالکل منشأ شریعت کے خلاف ہے۔ پس اگر جلسہ کرنا ہی ہے تو قیام و جلسہ کو خالی رکھو تکبیر سے، کیونکہ دو تکبیریں نہیں آئیں۔ اور نہ اس قدر تطویل مشروع ہے تکبیر میں۔

قولہ فانصب ھنیۃ: فرمایااس کے معنی یہ ہیں کہ بہ گئے تھوڑی دیر کے لئے، یعنی جس طرح تھوڑا پانی بہہ کر رک جاتا ہے، اسی طرح رکوع سے سر اٹھا کر اطمینان سے کھڑے ہوگئے، دوسرا نسخہ **فانصت** کا بھی ہے جو کان لگا کر خاموشی سے دوسرے کی بات سننے کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کو راوی نے یہاں سکونِ اطراف کے لئے استعمال کیا۔

علمی فائدہ: علامہ عینیؒ نے لکھا: ۔کرمانی نے کہا کہ روایت لفظِ **فانصت** کا مطلب یہ ہوگا کہ فوراً ہی سجدہ میں جانے اور جھکنے کے لئے تکبیر نہیں کہی اور کچھ دیر خاموش رہے اس پر حافظ نے نقد کیا اور کہا کہ اس سے بہتر یہ ہے کہ انصات کو سکون اعضاء کے لئے کنایہ مان لیا جائے عدمِ حرکت کو انصات سے تعبیر کر دیا گیا، جو طمانینت پر دال ہے، میں کہتا ہوں کہ کرمانی کی توجیہ زیادہ معقول ہے، کیونکہ خود تکبیر کی تاخیر ہی دلیلِ طمانیت بن جاتی ہے، اس لئے اس کو سکونِ اعضاء کیلئے کنایہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں، اور قاعدہ کے مطابق مجاز کو صرف اسی وقت اختیار کر سکتے ہیں جبکہ حقیقت پر محمول کرنا ممکن ہو۔ (عمدہ ص ۱۴۰\)

باب یھوی بالتکبیر حین یسجدوقال نافع کان ابن عمر یضع یدیہ قبل رکبتیہ

۷۶۴: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزھری اخبرنی ابوبکر بن عبدالرحمٰن بن الحارث بن ھشام وابو سلمۃ بن عبدالرحمٰن ان اباھریرۃ کان یکبرفی کل صلوٰۃ من المکتوبۃ وغیرھا فی رمضان وغیرہ فیکبر حین یقوم ثم یکبر حین یرکع ثم یقول سمع اللہ لمن حمدہ' ثم یقول ربنا ولک الحمد قبل ان یسجد ثم یقول اللہ اکبرحین یھوی ساجداً ثم یکبر حین یرفع راسہ' من السجود ثم یکبر حین یسجد ثم یکبر حین یرفع راسہ' من السجود ثم یکبر حین یقوم من الجلوس فی الاثنتین ویفعل ذلک فی کل رکعۃ حتیٰ یفرغ من الصلوٰۃ ثم یقول حین ینصرف والذی نفسی بیدہ انی لاقربکم شبھاً بصلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کانت ھذہ لصلوٰتہ' حتیٰ فارق الدنیا قالا وقال ابوھریرۃ وکان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حین یرفع راسہ یقول سمع اللہ لمن حمدہ' ربنا ولک الحمد یدعولرجال فیسمیھم باسمآئھم فیقول اللھم انج الولید بن الولید وسلمۃ بن ھشام وعیاش بن ابی ربیعۃ والمستضعفین من المؤمنین اللھم اشد دوطأتک علیٰ مضرواجعلھا علیھم سنین کسنی یوسف واھل المشرق یومئذ من مضر مخالفون لہ'

ترجمہ ۷۶۴: حضرت ابوہریرہؓ ہر نماز میں تکبیر کہتے تھے، فرض ہو یا کوئی اور، رمضان میں (بھی) اور غیر رمضان میں (بھی) پس جب کھڑے ہوتے تکبیر کہتے، پھر جب رکوع کرتے تھے، تکبیر کہتے پھر سجدہ کرنے سے پہلے **سمع اللّٰہ لمن حمدہ** کہتے، اس کے بعد **ربنا ولک الحمد** کہتے، اس کے بعد جب سجدہ کرنے کے لئے جھکتے، اللہ اکبر کہتے، پھر جب سجدہ سے اپنا سر اٹھاتے، تکبیر کہتے، پھر جب (دوسرا) سجدہ کرتے، تکبیر کہتے، پھر جب سجدوں سے اپنا سر اٹھاتے، تکبیر کہتے، پھر جب دو رکعتوں میں بیٹھ کر اٹھتے تکبیر کہتے (خلاصہ یہ کہ) اپنی ہر رکعت میں اسی طرح کرکے، نماز سے فارغ ہو جاتے، اس کے بعد جب نماز ختم کر چکتے تو کہتے کہ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ بلاشبہ میں تم سب میں رسولِ خدا ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہت رکھتا ہوں، بلاشبہ آپ کی نماز اس وقت تک بالکل ایسی ہی تھی۔ جب

کہ حضور پرنور ﷺ نے دنیا کو چھوڑا، عبدالرحمٰن اور ابوسلمہ (راویانِ حدیث) کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ رسولِ خدا ﷺ جب اپنا سر (رکوع سے) اٹھاتے تھے تو سمع اللہ لمن حمدہ (اور ربنا ولک الحمد (دونوں) کہتے تھے (اور) کچھ لوگوں کے لئے دعا کرتے تھے، اور ان کے نام لیتے (اور فرماتے تھے کہ اے اللہ ولید بن ولید کو اور سلمہ بن ہشام کو اور عیاش بن ابی ربیعہ اور کمزور مسلمانوں کو (کفارِ مکہ کے پنجۂ ظلم سے) نجات دے۔ اے اللہ اپنی پکڑ (قبیلہ) مضر پر سخت کر دے، اور اس کو ان پر قحط سالیاں بنا دے، جیسے حضرت یوسف علیہ السلام (کے زمانے) کی قحط سالیاں۔ اور اس زمانے میں (قبیلہ) مضر کے مشرقی لوگ آپ کے مخالف تھے۔

۷۶۵: حدثنا علی بن عبداللہ قال حدثنا سفین غیر مرۃ عن الزھری قال سمعت انس بن مالک یقول سقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن فرس وربما قال سفین من فرس فجحش شقہ' الایمن فدخلنا علیہ نعودہ' فحضرت الصلوٰۃ فصلی بنا قاعداً و قعدنا وقال سفین مرۃً صلینا قعوداً فلما قضی الصلوٰۃ قال انما جعل الامام لیؤتم بہ فاذا کبر فکبروا واذا رکع فارکعوا واذا رفع فارفعوا واذا قال سمع اللہ لمن حمدہ' فقولو ربنا ولک الحمد واذا سجد فاسجدوا وکذا جآء بہ محمدٌ قلت نعم قال لقد حفظ کذا قال الزھری ولک الحمد حفظت من شقہ الایمن فلما خرجنا من عند الزھری قال ابن جریج وانا عندہ' فجحش ساقۃ الایمن

ترجمہ۷۶۵:۔ زہری روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک کو فرماتے ہوئے سنا کہ (ایک مرتبہ) رسولِ خدا ﷺ گھوڑے سے گر پڑے اور آپ کی داہنی جانب چھل گئی، ہم لوگ آپ کی خدمت میں عیادت کے لئے حاضر ہوئے، اتنے میں نماز کا وقت آ گیا، تو آپ نے ہمیں بیٹھ کر نماز پڑھائی، اور ہم بیٹھ گئے (اور سفیان نے ایک مرتبہ یہ کہا کہ ہم نے بیٹھ کر نماز پڑھی) جب آپ نماز پڑھ چکے، تو فرمایا کہ امام اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، لہٰذا جب وہ تکبیر کہے، تو تم تکبیر کہو، اور جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو، اور جب وہ (سر) اٹھائے، تو تم (سر) اٹھاؤ، اور جب وہ **سمع اللّٰہ لمن حمدہ** کہے، تو تم (**ربنا ولک الحمد** کہو، اور جب وہ سجدہ کرے، تو تم سجدہ کرو۔

تشریح: حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حضرت ابن عمرؓ جو رکوع کے بعد سجدہ کو جاتے ہوئے اپنے ہاتھ گھٹنوں سے پہلے زمین پر رکھتے تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا بدن بھاری تھا، اگر پہلے گھٹنے زمین پر رکھتے تو بدن کا توزان بمشکل صحیح رہ سکتا تھا۔ اور اسی لئے وہ تشہد میں بھی جوزانو ہو کر بیٹھ سکتے تھے۔ (لامع ص ۱\۳۱۹)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ بھی ایسے آثار کو جن میں ہاتھ پہلے زمین پر ٹیک کر سجدہ کرنے کی بات مروی ہے، حالتِ عذر پر محمول فرماتے تھے، کیونکہ بیماری، کمزوری یا بدن بھاری ہونے کی صورت میں بغیر ہاتھوں کے پہلے زمین پر ٹیکنے کے سجدہ میں جانا دشوار ہوا کرتا ہے۔ اور حضرتؒ نے حدیث ابی ہریرہ ترمذی والی کو بھی اسی پر اتارا ہے، اور فرمایا کہ نماز میں بروک جمل اونٹ کی نہ ہونا چاہئے، کیونکہ نماز کے اندر کسی بھی جانور کی مشابہت نہ آنی چاہئے، لہٰذا ارشادِ نبوی کا منشا یہ ہے کہ اونٹ کی طرح اگلا دھڑ سارا گرا کر باقی پچھلا دھڑ کھڑا رکھ کر سجدہ میں نہ جاؤ، بلکہ معذوری کی حالت میں ایسا کرو کہ زمین پر ہاتھ ٹیک کر سارا دھڑ ساتھ ہی نیچے لے جاؤ، حضرتؒ نے فرمایا کہ ترمذی میں تو حدیث مختصر ہے۔ نسائی وغیرہ میں یہ بھی ہے کہ سجدہ میں جاتے ہوئے اونٹ کی طرح بروک نہ کرو، اور ہاتھوں کو ٹیک کر گھٹنے بھی زمین پر رکھ دو۔ اس طرح حدیث ابی ہریرہؓ کا مطلب لیا جائے تو اس کا مقصد ہاتھوں یا گھٹنوں کا مقدم و موخر کرنا نہ ہوگا، بلکہ صرف بروک ابل کی نفی ہوگی۔ یا دوسرا احتمال یہ ہے کہ گھٹنوں کو زمین پر رکھنے سے قبل ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھنے کا حکم فرمایا گیا ہے۔ اس صورت میں بھی ترتیب یا تقدیم و تاخیر کا بیان نہیں ہوتا، بلکہ نفی ہوگی سقوط بلا اختیار کی کہ اونٹ کی طرح نہ گر جاؤ، ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھ کر احتیاط کے ساتھ سجدہ میں جاؤ۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ ''النہایہ'' اور ''التاج'' کی مراجعت کی جائے اور فرمایا کہ بیٹھتے وقت اونٹ اپنے دونوں ہاتھ، پیرو سے پہلے زمین پر ٹیکتا ہے اگرچہ اس کے دونوں گھٹنے بھی سا کے ہاتھ میں ہی ہوتے ہیں۔

ردِ ابن القیم: علامہ بنوریؒ نے معارف السنن ص ۳\۱۳۰ میں حضرت شاہ صاحب سے ابن القیم کے اس دعویٰ کا رد بھی نقل کیا کہ لغت میں اونٹ کے لئے رکبتین فی الیدین کا کوئی ثبوت نہیں ہے، اور کتب لغتِ معتبرہ سے ثابت کیا کہ یہ بات تو اہلِ لغت کے یہاں بہت معروف ہے، عربی کی مشہور کتابِ لغت ''اللسان'' (ص ۱\۱۳۱۷) میں ہے کہ اونٹ کا گھٹنا اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ کہ ہر چوپایہ کے گھٹنے اس کے دونوں ہاتھوں میں اور ایڑیاں اس کے پیروں میں ہوتی ہیں۔

حدیث ابی ہریرہ ترمذی

معارف السنن ص ۳\۱۳۱ میں لکھا کہ ترمذی کی حدیث الباب سے امام مالکؒ نے استدلال کیا ہے کیونکہ ان کا مسلک جمہور کے خلاف سجدہ کو جاتے ہوئے گھٹنوں سے پہلے ہاتھ ٹیکنا ہے، لیکن یہ حدیث معلول ہے، امام ترمذی نے اس کو غریب کہا اور امام بخاری نے اس کے راوی محمد بن عبداللہ بن الحسن کے لئے لا یتابع علیہ کہا، دارقطنی نے دراوردی کا تفرد بتلایا۔ الخ

امام ترمذی نے اس سے پہلے باب میں حدیثِ وائل ہی ذکر کی ہے، جس میں گھٹنے پہلے لگانے کا ہی ثبوت ہے، اور وہی مذہب امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام احمد، ثوری، اسحاق، عامۂ فقہاء، اور تمام اہلِ کوفہ کا ہے، اور ایک روایت امام مالک سے بھی ایسی ہے۔ پھر یہی حضرت عمرؓ حضرت ابن مسعود وغیرہ کا بھی مختار ہے (معارف ص ۳\۱۲۷) امام مالک سے ایک روایت میں اور امام احمد سے بھی ایک قول تخییر کا بھی ہے، کہ دونوں میں سے جو صورت چاہے اختیار کرے کوئی حرج نہیں (فتح ص ۲\۱۴۱)

معلوم نہیں امام بخاری ترجمۃ الباب میں حضرت ابن عمرؓ کا اثر ان سب کے خلاف کیوں لائے ہیں، ممکن ہے کہ ان کا مختار وہی ہو، واللہ تعالیٰ اعلم، مگر جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ان کا عمل بدن بھاری ہونے کی معذوری پر محمول ہوسکتا ہے اور یوں بھی حضرت عمرؓ کا عمل ان کے مقابلہ میں ارجح ہے۔

قولہ وکان یکبر فی رمضان وغیرہ: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ راوی نے رمضان کا ذکر اس لئے کیا کہ رمضان کی وجہ سے کچھ زیادات کا احتمال تھا، اس کو رفع کیا کہ بابِ تکبیرات میں کوئی اضافہ مشروع نہیں ہوا۔

قولہ یدعو لرجال: فرمایا کہ ''بحر'' میں مسئلہ ہے اگر نماز کے اندر کسی شخص کا نام لے لیا جائے تو اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، لیکن کسی کا نام لے کر اس کے لئے دعا کی جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی، یہ بات بطور معمہ اور چیستان کے ہے کہ جز ءمفسد ہے اور کل مفسد نہیں ہے، جس طرح اطراف کی دیت نفس کے دیت سے بڑھ جاتی ہے، اس کا حل صدرالشریعۃ نے شرح الوقایہ میں کیا ہے۔

باب فضل السجود

سجدہ کرنے کی فضیلت کا بیان

۷۶۶: حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری قال اخبرنی سعید بن المسیب وعطآء بن یزید اللیثی ان اباهریرة اخبرهما ان الناس قالوا یارسول الله صلی الله هل نری ربنا یوم القیمٰة قال هل تمارون فی القمر لیلة البدر لیس دونه سحاب قالوا لا یارسول الله قال فهل تمارون فی الشمس لیس دونها سحاب قالوا لا قال فانكم ترونه كذٰلک یحشر الناس یوم القیامة فیقول من كان یعبد شیئاً فلیتبعه فمنهم من

يتبع الشمس ومنهم من يتبع القمر ومنهم من يتبع الطواغيت وتبقىٰ هذه الامة فيها منافقوها فياتيهم الله فيقول انا ربكم فيقولون هذا مكاننا حتىٰ ياتينا ربنا فاذا جآء ربنا عرفناه فياتيهم الله عزوجل فيقول انا ربكم فيقولون انت ربنا فيدعوهم و يضرب الصراط بين ظهراني جهنم فاكون اول من يجوز من الرسل بامته ولايتكلم يومئذ احدالاالرسول وكلام الرسل يومئذ اللهم سلم سلم وفي جهنم كلاليب مثل شوک السعدان هل رايتم شوک السعدان قالوانعم فانها مثل شوک السعدان غيرانه' لايعلم قدر عظمها الاالله تخطف الناس باعمالهم فمنهم من يوبق بعمله' و منهم من يخردل ثم ينجو حتىٰ اذا اراد الله رحمة من اراده من اهل النار امر الله الملٰئكة ان يخرجوهم ويعرفونهم باثار السجود و حرم الله على النار ان تاكل اثر السجود فيخرجون من النار فكل ابن ادم تاكله النار الا اثر السجود فيخرجون من النار قدامتحشوا فيصب عليهم مآء الحياة فينبتون كماتنبت الحبة في حميل السيل ثم يفرغ الله من القضآء بين العباد و يبقىٰ رجل بين الجنة والنار وهو اخر اهل النار دخولا الجنة مقبلاً بوجهه قبل النار فيقول يارب اصرف وجهي عن النار فقد قشبني ريحها واحرقني ذكاؤها فيقول هل عسيت ان فعل ذٰلک بک ان تسئل غير ذٰلک فيقول لاوعزتک فيعطي الله عزوجل مايشآء من عهد وميثاق فيصرف الله وجهه' عن النار فاذا اقبل به على الجنة راى بهجتها سكت ماشآء الله ان يسكت ثم قال يارب قدمني عندباب الجنة فيقول الله له' اليس قداعطيت العهود والميثاق ان لاتسأل غيرالذي كنت سالت فيقول يارب لااكون اشقىٰ خلقک فيقول فماعسيت ان اعطيت ذٰلک ان لاتسال غيره' فيقول لاوعزتک لااسالک غير ذٰلک فيعطي ربه' ماشاء من عهد و ميثاق فيقدمه' الىٰ باب الجنة فاذا بلغ بابها فراى زهرتها ومافيها من النضرة والسرور فيسكت ماشآء الله ان يسكت فيقول يارب ادخلني الجنة فيقول الله عزوجل و يحک ياابن ادم ما اغدرک اليس قداعطيت العهدوالميثاق ان لاتسأل غيرالذيٓ اعطيت فيقول يارب لاتجعلني اشقىٰ خلقک فيضحک الله منه ثم ياذن له' في دخول الجنة فيقول تمن فيتمني حتىٰ اذا انقطع امنيته' قال الله عزوجل زد من كذاوكذا اقبل يذكره' ربه' حتىٰ اذاانتهت به الاماني قال الله لک ذٰلک و مثله' معه' وقال ابوسعيد الخدري لابي هريرة ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قال الله عزوجل لک ذٰلک وعشرة امثاله قال ابوهريرة لم احفظه' من رسول الله صلى الله عليه وسلم الاقوله' لک ذٰلک ومثله' معه' قال ابوسعيد اني سمعته' يقول ذٰلک لک وعشرة امثاله

ترجمہ ۷۶۶:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا، کہ ایک مرتبہ لوگوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے پروردگار کو دیکھیں گے، آپ نے فرمایا، کیا تم کو شب بدر میں چاند (کے دیکھنے) میں جب کہ اس کے اوپر ابر نہ ہو، کچھ شک ہوتا ہے، ان لوگوں نے کہا، کہ یارسول اللہ! نہیں، آپ نے فرمایا، تو کیا تم کو آفتاب (کے دیکھنے) میں جب کہ اس کے اوپر ابر نہ ہو کچھ شبہ ہوتا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ نہیں آپ نے فرمایا بس تم اسی طرح اپنے پروردگار کو دیکھو گے، قیامت کے دن لوگ اٹھائے جائیں گے، پھر (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا کہ جو (دنیا میں) جس کی پرستش کرتا تھا، وہ اس کے ساتھ ہو جائے، چنانچہ کوئی ان میں سے آفتاب کے ساتھ ہو جائے گا، اور کوئی ان میں سے چاند کے ساتھ ہو جائے گا، اور کوئی ان میں سے بتوں کے پیچھے ہو لے گا، اور یہ (ایمانداروں کا) گروہ باقی رہ جائے گا، اور اسی میں اس

کے منافق (بھی) شامل) ہوں گے، اللہ تعالیٰ (اس صورت میں جس کو وہ نہیں پہنچانتے) ان کے پاس آئے گا، اور فرمائے گا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں تو وہ کہیں گے (ہم تجھے نہیں جانتے) ہم اسی جگہ کھڑے رہیں گے، یہاں تک کہ ہمارا پروردگار ہمارے پاس آجائے، اور جب وہ آئے گا، ہم اسے پہچان لیں گے، پھر اللہ عزوجل ان کے پاس (اس صورت میں) آئے گا (جس کو وہ پہنچاتے ہیں) اور فرمائے گا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں تو وہ کہیں گے کہ ہاں تو ہمارا پروردگار ہے، پس اللہ، انہیں بلائے گا، اور جہنم کی پشت پر (پل بنا کر) ایک راستہ بنایا جائے گا، تمام پیغمبر جو اپنی امتوں کے ساتھ (اس پل سے) گزریں گے، ان میں پہلا میں ہوں گا، اور اس دن سوائے پیغمبروں کے کوئی بول نہ سکے گا، اور پیغمبروں کا کلام اس دن اللّٰھم سلم سلم ہوگا، جہنم میں سعدان کے کانٹوں کے مشابہ آنکڑے ہوں گے کیا تم لوگوں نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں، صحابہ نے عرض کیا، ہاں! آپ نے فرمایا، کہ وہ سعدان کے کانٹوں سے مشابہ ہوں گے البتہ ان کی بڑائی کی مقدار سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا، وہ آنکڑے لوگوں کو ان کے اعمال کے موافق اچکیں گے، تو ان میں سے کوئی اپنے اعمال کے سبب (جہنم میں گر کر) ہلاک ہو جائے گا، اور کوئی ان میں سے (مارے زخموں کے) ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا، اس کے بعد نجات پائے گا، یہاں تک کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخیوں میں سے جن پر مہربانی کرنا چاہے گا، فرشتوں کو حکم دے گا کہ جو اللہ کی پرستش کرتے تھے، وہ نکال لئے جائیں۔ اور فرشتے انہیں سجدوں کے نشانوں سے پہچان لیں گے، اللہ تعالیٰ نے (دوزخ کی) آگ پر حرام کر دیا ہے کہ وہ سجدے کے نشان کو کھائے، چنانچہ سجدوں کے مقام کے علاوہ جہنم کی آگ ابنِ آدم کے تمام جسم کو کھا جائے گی (اسی نشان سجدہ کی علامت سے) جب لوگ نکالے جائیں گے، اس وقت بالکل سیاہ (کوئلہ) ہو گئے ہوں گے، پھر ان کے اوپر آبِ حیات ڈالا جائے گا تو (اس کے پڑنے سے) وہ ایسے نکل آئیں گے، جیسے دانہ سیل کے بہاؤ میں اگتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندوں کے درمیان میں فیصلہ کرنے سے فارغ ہو جائے گا، اور ایک شخص جنت اور دوزخ کے درمیان میں باقی رہ جائے گا اور وہ جنت میں سب دوزخیوں سے آخر میں داخل ہوگا، اس کا منہ دوزخ کی طرف ہوگا، کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میرا منہ دوزخ (کی طرف) سے پھر دے، کیونکہ مجھے اس کی ہوا نے زہر آلود کر دیا ہے، اور مجھے اس کے شعلہ نے جلا دیا ہے، اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ کیا تو (ایسا تو نہ کرے گا، کہ) اگر تیرے ساتھ یہ احسان کر دیا جائے، تو تو اس کے علاوہ اور کچھ مانگے، وہ کہے گا، کہ تیری بزرگی کی قسم نہیں، پھر اللہ عزوجل (اس بات پر) جس قدر وہ چاہے گا، اس سے پختہ وعدہ لے لے گا (اس کے بعد) اللہ تعالیٰ اس کا منہ دوزخ (کی طرف) سے پھیر دے گا، پھر جب وہ جنت کی طرف منہ کرے گا اور وہ اس کی تروتازگی دیکھے گا، تو جس قدر مشیتِ الٰہی ہوگی، وہ چپ رہے گا، اس کے بعد کہے گا کہ اے پروردگار! مجھے جنت کے دروازے کے قریب کر دے، تو اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کیا تو نے اس بات پر قول وقرار نہ کئے تھے، کہ اس کے سوا جو تو مانگ چکا، اور کچھ سوال نہ کرے گا، وہ عرض کرے گا، کہ اے میرے پروردگار! مجھے تیری مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ ہونا چاہئے اللہ تعالیٰ فرمائے گا، کہ ہوسکتا ہے، کہ اگر تجھے یہ بھی عطا کر دیا جائے، تو تو اس کے علاوہ اور کچھ سوال کرے، وہ عرض کرے گا کہ قسم تیری بزرگی کی نہیں، میں اس کے سوال سوال نہ کروں گا۔ پھر اپنے پروردگار کو جس قدر قول وقرار چاہے گا دے گا، تب اللہ تعالیٰ اس کو جنت کے دروازے کے قریب کر دے گا، جب اس کے دروازے پر پہنچ جائے گا، اور اس کی شگفتگی اور وہ تازگی اور سرور جو اس میں ہے دیکھے گا، تو جتنی دیر مشیتِ الٰہی ہوگی، چپ رہے گا، اس کے بعد کہے گا کہ اے میرے پروردگار! مجھے جنت میں داخل کر دے اللہ عزوجل فرمائے گا کہ اے ابنِ آدم تیری خرابی ہو، تو کس قدر عہد شکن ہے، کیا تو نے اس بات پر قول وقرار نہ کئے تھے، کہ اس کے سوا جو تجھے دیا جا چکا اور کچھ نہ مانگے گا، وہ عرض کرے گا، کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ بدنصیب نہ کر، پس اللہ تعالیٰ اس (کی باتوں) سے ہنسنے لگے گا، اس کے بعد اس کو جنت میں لے جانے کی اجازت دے گا، اور فرمائے گا کہ (جہاں تک تجھ سے

ہوسکے) طلب کر، چنانچہ وہ خواہش کرنے لگے گا، یہاں تک کہ اس کی خواہشیں ختم ہو جائیں گی، تو اللہ بزرت وبرتر فرمائے گا، کہ یہ یہ چیزیں اور مانگ، اس کا پروردگار اسے یاد دلانے لگے گا یہاں تک کہ جب اس کی خواہشیں تمام ہو جائیں گی تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا، تجھے یہ بھی (دیا جاتا) ہے، اور اسی کے مثل اس کے ساتھ اور بھی، (یہ حدیث سن کر) ابوسعید خدری نے ابو ہریرہؓ سے کہا، کہ رسولِ خدا ﷺ نے (اس مقام پر) یہ فرمایا تھا، کہ اللہ عزوجل نے فرمایا کہ تجھے یہ اور اس کے (ساتھ اس کے) مثل دس (گنے دیئے جاتے ہیں) ابو ہریرہؓ نے جواب دیا کہ مجھے اس حدیث میں رسولِ خدا ﷺ سے صرف آپ کا یہی ارشاد یاد ہے کہ تجھے یہ بھی (دیا جاتا) ہے اور اسی کے مثل اس کے ساتھ اور (بھی) ابوسعید نے کہا، کہ میں نے خود آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ تجھے یہ اور اسی کے دس مثل (اس کے ساتھ دیئے جاتے) ہیں۔

تشریح: امام بخاریؒ نے سجدہ کی فضیلت میں وہ حدیثِ ابی ہریرۃؓ پیش کی ہے، جس میں سجدہ کی وجہ سے سجدہ کرنے والے کے جسم کے کچھ حصہ پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی یعنی اس پر کچھ اثر نہ کرے گی، تمام بدن اس کی آگ میں جلے گا مگر وہ حصہ محفوظ رہے گا، اور یہ صرف سجدہ اور نماز کی برکت سے ہوگا، حافظ نے لکھا کہ یہ حدیث آگے کتاب الرقاق میں بھی آئے گی، اور ہم وہاں تفصیل سے بحث کریں گے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے درسِ بخاری میں فرمایا کہ یہاں ایک مسئلہ میں امام نووی اور قاضی عیاض کا کچھ اختلاف بھی ہے، جس پر حافظ نے اچھا کلام اور تبصرہ کیا ہے، وہ دیکھ لیا جائے، چونکہ بعض امالی میں ضبط وتحریر کی غلطی ہوگئی ہے، اس لئے ہم یہاں اس کو صحیح طور سے اور حافظ کی بات کو بھی مختصر کر کے لکھتے ہیں۔ وبہ نستعین:۔

حافظ نے لکھا کہ اس بارے میں اختلاف ہوا کہ دوزخ کی آگ سے کون سا حصہ محفوظ رہے گا، علامہ نووی شارح مسلم شریف کی رائے یہ ہے کہ ساتوں اعضاءِ محفوظ رہیں گے، جن پر ٹکا کر سجدہ ہوتا ہے، یعنی پیشانی، دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے اور دونوں قدم۔ قاضی عیاض نے کہا کہ صرف پیشانی جس سے سجدہ ہوتا ہے وہی محفوظ ہوگی، کیونکہ مسلم وغیرہ میں یہ بھی مروی ہے کہ گنہگار لوگوں میں کچھ لوگ آدمی پنڈلی تک آگ میں رہیں گے، کچھ گھٹنوں تک، کچھ کمر تک۔ تو ظاہر ہے کہ قدم اور گھٹنے بھی محفوظ نہ رہ سکیں گے، اس لئے صرف پیشانی کو محفوظ کہہ سکتے ہیں، اور حافظ نے لکھا کہ ایک دوسری حدیثِ مسلم سے بھی قاضی عیاض کی تائید ہوسکتی ہے، جس میں ہے کہ کچھ لوگوں کو دوزخ میں عذاب ہوگا، مگر ان کے چہروں کے دائرے اس سے محفوظ ہوں گے۔

علامہ نووی کا جواب حافظ نے ذکر کیا کہ یہ تو خاص لوگوں کا حال حدیثِ مسلم میں بیان ہوا ہے، باقی عام طور سے تو عموم حدیث الباب کے تحت گنہگار مومنوں کے تمام ہی اعضاءِ سجود محفوظ ہوں گے، لہٰذا دوزخ میں ایک مدت تک گناہوں کی پاداش اٹھانے والے مومنوں کی دو قسم ہوگئیں۔ لہٰذا دونوں قسم کی احادیث کے مورد الگ الگ ہیں۔

پھر حافظ نے قاضی عیاضؒ کے دوسرے استدلال کا جواب یہ دیا کہ آخرت کے احوال کا یہاں کے احوال پر قیاس نہ کرنا چاہئے ہوسکتا ہے کہ وہاں کمر تک جلنے والے کے بھی گھٹنے اور قدم دوزخ کی آگ سے بالکل متاثر نہ ہوں اور اتنے حصے جن پر سجدہ ہوتا ہے وہ محفوظ رہیں۔

پھر لکھا کہ دارات الوجوہ والی حدیث سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف پیشانی بلکہ چہروں کے پورے دائرے سجدہ کی برکت سے عذاب سے محفوظ رہیں گے لہٰذا اس لئے بھی صرف پیشانی کے استثناء والی بات قاضی عیاض کی محلِ نظر ہے۔ (فتح الباری ص۱۱۹\۲وص۳۶۶\۱۱)

اس پوری تفصیل سے معلوم ہوا کہ اصل اختلاف تو علامہ نووی اور قاضی عیاض کا ہے، اور حافظ نے کلام واستدلال کر کے اپنا میلان علامہ نوویؒ کی طرف ظاہر کر دیا ہے اور ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کا اشارہ بھی اسی کی تصویب کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بے نمازی کا عذاب

حافظؒ نے علامہ محدث ابن ابی جمرہ کا ایک نہایت مفید ارشاد بھی نقل کیا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازیوں کو عذاب کے بعد

حق تعالیٰ کی رحمت ومغفرت دوزخ سے نکلوالے گی، لیکن جولوگ نماز کی نعمت سے دنیا کے اندر بالکل ہی محروم رہے ہوں گے، ان کی عذاب سے خلاصی کیونکر ہوگی کہ ان کے جسم پر تو سجدہ کے آثار وعلامات بھی نہ ہوں گی، جن سے پہچان کر فرشتے نکالیں گے، لہٰذا وہ ہمیشہ ہی دوزخ کے عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

علامہ نے فرمایا البتہ ان کے لئے بھی ایک حدیث نبوی ہے کہ سب سے آخر میں کہ تمام انبیاء فرشتوں اور مومنوں کی شفاعتوں کے طفیل میں لوگ دوزخ سے نکل چکیں گے، اور جنت میں داخل ہو جائیں گے، تب حق تعالیٰ فرمائے گا کہ اب میری شفاعت رہ گئی ہے اور حق تعالیٰ مٹھی بھر کے ایک قوم کو دوزخ سے نکالیں گے، جس کے پاس بجز ایمان کے کوئی بھی نیک عمل نہ ہوگا (وہ حدیث بخاری کتاب التوحید ص ۱۱۰۷ میں آئے گی)

فتح الباری کی اغلاط

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ فتح الباری کا جونسخہ اب چھپ کر آیا ہے وہ غلطیوں سے بھرا ہوا ہے، پانچ سو تو میں صحیح کر چکا ہوں، باقی کتنی ہیں اللہ جانتا ہے۔

تجلیاتِ ربانی: قولہ فیاتیھم اللہ

حضرتؒ نے فرمایا کہ حضرت الٰہیہ کے بارے میں جو افعال لازمہ استعمال ہوئے ہیں ان سے مراد تعلق ہوتا ہے اس صفت کا محل وقوع کے ساتھ اور جو افعال متعدیہ وارد ہوئے ہیں، ان سے مراد اس محل کا پیدا کرنا ہوتا ہے جیسے **قولہ تعالیٰ خلق السموات والارض.** چنانچہ اتیان، نزول واستواء سارے افعال لازمہ ہیں اور مراد ان صفات کا تعلق ہے محل کے ساتھ اور **استوی علی العرش** کا معنی یہ ہے کہ تعلق ہوا صفتِ استواء کا عرش کے ساتھ۔ اور یہ سب تجلیاتِ باری عز اسمہ ہیں۔ دوسرے موقع پر فرمایا کہ استواء، قرب ومعیت میرے نزدیک سب ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں، ہم ان کی کیفیات کا ادراک نہیں کر سکتے، اور نہ ہم تشبیہ وتجسیم کے قائل ہیں جیسے کہ اہلِ زیغ قائل ہیں، اور ائمہ اربعہ کے نزدیک اس نوع کی تمام چیزیں بلا تاویل کے اپنے ظاہر پر محمول ہیں۔ اسی طرح میرے نزدیک نماز میں مواجہۂ خداوندی اور وصلۂ مناجات بھی ہے۔ اور تحقیق یہ ہے کہ یہ سب تجلیات ہیں حق تعالیٰ جل مجدہ کی۔

قولہ والکلالیب: فرمایا کہ یہ علائقِ نفس ہیں جو آخرت میں مجسد ہو جائیں گے۔ یعنی یہاں کے معاصی وشہواتِ نفسانیہ کانٹوں اور کنڈوں کی طرح گنہگاروں اور کافروں ومشرکوں کو پل صراط جہنم پر سے گذرنے کی حالت میں اچک اچک کر دوزخ میں گرالیں گے تاکہ اس میں اپنے برے اعمال وعقائد کی سزا پائیں۔

عبادات ومعاصی کا دخولِ جنت وجہنم

حضرتؒ نے فرمایا کہ بظاہر حدیث الباب سے معلوم ہوا کہ گنہگاروں کے ساتھ ان کی عبادتیں بھی جہنم میں ساتھ ہوں گی اگر بیکار رہیں گی، اور ایک قول علماء کا یہ بھی ہے کہ اعمال صالحہ اس زمانہ میں باہر ہی رہیں گے، اور یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ معاصی جنت میں نہ جائیں گے۔

باب یبدی ضبعیه ویجافی فی السجود

(مرد کو چاہئے کہ) سجدہ میں اپنے دونوں پہلو کھول دے اور پیٹ کو زانو سے جدا رکھے

۷۶۷: حدثنا یحیی بن بکیر قال حدثنی بکر بن مضر عن جعفر بن ربیعة عن ابن هرمز عن عبدالله بن

مالک ابن بحسینة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا صلے فرج بین یدیہ حتیٰ یبدو بیاض ابطیہ وقال اللیث حدثنی جعفر بن ربیعة نحوہ

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن مالک بن بحینہ روایت کرتے ہیں، کہ نبی کریم ﷺ جب نماز پڑھتے تھے تو اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان میں اس قدر کشادگی رکھتے تھے کہ آپ کی بغلوں کی سپیدی ظاہر ہوتی تھی، اور لیث نے کہا کہ مجھ سے جعفر بن ربیعہ نے اس کے مثل روایت کی۔

تشریح: یہ باب اور حدیث الباب اسی سند سے بخاری ص ۵۶ میں بھی گزری ہے، وہاں یہ بتلایا تھا کہ بغل اور اس سے ملے ہوئے ہاتھوں کے حصے نماز میں کھلے رہیں تو وہ عدمِ تستر میں داخل نہیں ہے، یہاں یہ بتلایا کہ سجدہ کے وقت بازو کو پہلو سے جدا رکھا جائے، تاکہ وہ بھی آزادی سے مستقلاً سجدہ کریں، پہلو سے بازوؤں کو ملالیا تو ان کا سجدہ الگ سے متصور نہ ہوگا جبکہ منشاءِ شارع یہ ہے کہ نماز کے سارے اعضاءِ سربسجود ہوں اور اسی لئے آگے آئے گا کہ سجدہ میں پاؤں کی انگلیاں بھی قبلہ رخ ہوں کہ وہ بھی سجدہ گزار ہوتی ہیں۔ مگر قیام وقوعد میں بھی ہاتھوں اور پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ ہی رکھنا چاہئے، حنفیہ کے یہاں قعدۂ تشہد میں بھی افتراش کی جو شکل ہے، اس میں بھی بہ نسبت تورک کے پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ رخ رکھنے کی حمایت زیادہ ہے۔ ان دونوں کی تشریح آگے آئے گی۔

حافظ نے لکھا کہ حدیث الباب سے بازو جدا کر کے سجدہ کرنے کا وجوب معلوم ہوتا ہے اور حدیثِ ابی داؤد سے اس کا استحباب مفہوم ہوتا ہے، جس میں ہے کہ صحابۂ کرامؓ نے طوالتِ سجدہ کی صورت میں مشقتِ سجدہ کی شکایت کی تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ گھٹنوں سے مدد لو یعنی ان پر کہنیاں ٹیک کر۔ حالانکہ یہ صورت پہلی سے الگ ہے اور بازوؤں کو بحالتِ سجدہ عام حالات میں جدا رکھنے کا حکم کیا گیا۔ اور یہ خاص صورت ہے کہ طوالتِ سجدہ کے وقت تھکن رفع کرنے کے لئے گھٹنوں سے مدد لی جائے، یہ گویا خاص صورت حالتِ عذر کی ہے۔ امام ترمذی نے استعانت بالرکب کا حکم سجدے سے قیام کے لئے اٹھنے کے وقت مراد لیا ہے، اور امام طحاویؒ نے قومہ کے بعد سجدہ کو جاتے ہوئے استعانت بالرکب کو لیا ہے۔ غرض یہ چاروں صورتیں الگ الگ ہیں۔ اور امام بخاریؒ نے یہاں سجدے کی صحیح اور مشروع ومسنون صورت عام حالت کے لئے بیان کی ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

واضح ہو کہ ص ۵۶ کی طرح یہاں بھی بُحینہ مالک کی ماں نہیں ہیں، بلکہ عبداللہ بن مالک کی والدہ ہیں۔ اور ابن بُحینہ عبداللہ کی صفت ہے مالک کی نہیں، لہٰذا صحیح بخاری ص ۵۶ میں مالک ابن بُحینہ صحیح طبع ہوا ہے، اور یہاں ص ۱۱۲ میں ابن کا الف غلطی سے رہ گیا ہے۔

باب یستقبل باطراف رجلیہ القبلة قالہ' ابوحمید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(سجدے میں اپنے پیروں کو انگلیاں قباءرُخ رکھے) اس کو ابوحمیدؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے

باب اذالم یتم سجودہٗ

(اگر کوئی شخص اپنا سجدہ پورا نہ کرے)

۷۶۸: حدثنا الصلت بن محمد قال حدثنا مهدی عن واصل عن ابی وآئل عن حذیفة انہ' رای رجلاً لایتم رکوعہ' ولاسجودہ' فلما قضیٰ صلوتہ قال لہ حذیفة ماصلیت واحسبہ' قال لومت مت علیٰ غیر سنة محمد صلے اللہ علیہ وسلم

ترجمہ۷۶۸:۔ حضرت حذیفہؓ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ اپنا رکوع پورا کرتا ہے، اور نہ اپنا سجدہ، جب وہ اپنی نماز ختم کر چکا، تو اس سے حذیفہؓ نے کہا، کہ تو نے نماز نہیں پڑھی، اور (ابووائل کہتے ہیں) کہ مجھے خیال ہے کہ حذیفہؓ نے یہ بھی کہا کہ اگر تو مر جائے گا۔ تو محمد ﷺ کے خلاف طریقے پر مرے گا۔

تشریح: پہلے ایک باب اذا لم یتم الرکوع گزرا ہے، وہی تشریح یہاں سجود کے لئے بھی ہے۔ (فتح ص۲۰۰\۲)

باب السجود علیٰ سبعة اعظم

اگر کوئی شخص اپنا سجدہ پورا نہ کرے

۷۶۹: حدثنا قبیصة قال حدثنا سفیان عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباسؓ قال امر النبی صلے الله علیه وسلم ان یسجد علیٰ سبعة اعضآء ولایکف شعراً ولاثوباً الجبهة والیدین والرکبتین والرجلین

۷۷۰: حدثنا مسلم بن ابراهیم قال حدثنا شعبة عن عمرو عن طاؤس عن ابن عباس عن النبی صلی الله علیه وسلم قال امرنا ان نسجد علیٰ سبعة اعظم ولانکف شعراً ولاثوباً

۷۷۱: حدثنا اٰدم قال حدثنا اسرآءیل عن ابی اسحٰق عن عبدالله بن یزید قال حدثنا البرآء بن عازب وهو غیر کذوب قال کنا نصلی خلف النبی صلے الله علیه وسلم فاذاقال سمع الله لمن حمده' لم یحن احد مناظهره' حتی یضع النبی صلے الله علیه وسلم جبهته' علی الارض

ترجمہ۷۶۹: طاؤس حضرت ابن عباسؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا، کہ نبی ﷺ کو سات اعضاء کے بل سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور یہ کہ بالوں کو نہ سنوارے، اور نہ کپڑے کو روکے (وہ سات اعضا یہ ہیں) پیشانی، دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے، دونوں پیر۔

ترجمہ۷۷۰: حضرت ابن عباسؓ نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم سات ہڈیوں کے بل سجدہ کریں، اور نہ بالوں کو روکیں اور نہ کپڑے کو۔

ترجمہ۷۷۱: حضرت براء بن عازبؓ نے بیان کیا، اور وہ جھوٹے آدمی نہیں تھے، وہ کہتے ہیں، کہ ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، تو جب **سمع الله لمن حمده** کہتے، تو کوئی شخص ہم میں سے پیٹھ نہ جھکاتا تھا، جب تک کہ نبی کریم ﷺ کو اپنی پیشانی زمین پر رکھتے نہ دیکھ لیتا تھا۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حاصل اس باب اور اس کی احادیث کا یہ ہے کہ سجدہ کرنے والے ساتوں اعضاء مصلی ہیں نہ یہ کہ ساجد تو نمازی ہے اور یہ اعضاء اس کے سجدہ کے لئے صرف معاون اور ذریعہ ہیں، اور خارج سے یہ بھی ثابت ہوا کہ نمازی کے بال بھی سجدہ کرتے ہیں اسی لئے بندھے ہوئے بالوں کے ساتھ نماز کی ممانعت کی گئی۔ اور آثار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازی کے کپڑے بھی سجدہ کرتے ہیں، اسی لئے ان کو بھی نماز کے اندر روکنے سنبھالنے سے منع کیا گیا ہے، جب کپڑوں اور بالوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے کہ اعضاءِ سجود کے لئے سجدے کی شان ضرور ہی مدنظر ہوگی، بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ دونوں ہاتھ سجدہ کی طرح رکوع بھی کرتے ہیں، اس وقت وہ معطل نہیں ہیں۔ پھر یہ کہ مشہور قول حنفیہ کا اگرچہ یہ ہے کہ سجدہ کے وقت صرف پیشانی اور ایک پاؤں کا زمین پر ٹکنا واجب ہے، باقی اعضاءِ سجود کا سنت ہے، مگر شیخ ابن ہمامؒ نے سب ہی کے وجوب کا قول اختیار کیا ہے شاید حنفیہ کے مشہور قول کی وجہ یہ ہو کہ پیشانی زمین پر رکھنے کو بہ نسبت دوسرے اعضاء کے حقیقتِ سجود سے زیادہ اقرب سمجھا گیا جیسا کہ بعض ان دعاؤں سے بھی مفہوم ہوتا ہے جو سجدہ کے وقت کی ماثور ہوئی ہیں، لیکن بظاہر یہ ان کا صرف فکری و نظری خیال ہوگا، باقی عمل کے لحاظ سے سارے اعضاءِ کا حکم یکساں وجوب ہی کا ہونا چاہئے واللہ تعالیٰ اعلم۔

اس مسئلہ میں اختلاف کی نوعیت تاحش کوکب سے اس طرح نقل کی گئی ہے شافعیہ کے اظہر القولین میں اور امام زفر کے نزدیک نیز امام احمد سے ایک روایت میں اعضاءِ سبعہ پر سجدہ واجب ہے، امام احمدؒ سے دوسری روایت میں اور امام مالک وحنفیہ کے نزدیک بجز پیشانی کے دوسرے اعضاء کے لئے وجوب نہیں ہے۔ (الابواب ص۲۹۶\۲)

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی نظر ہمیشہ یہ رہتی تھی کہ حنفیہ کے لئے اقرب الی الحدیث توجیہ کو ترجیح دیا کرتے تھے، اور حافظ ابن ہمامؒ کا مزاج بھی یہی تھا، اسی لئے اوپر جو توجیہ اور وجہِ ترجیح حضرتؒ نے بیان کی ہے وہ ہمارے خیال کی تائید کرتی ہے، حضرتؒ نے اپنی عمر کے چالیس سال اسی فکر وسعی میں گزارے ہیں کہ حنفی مسلک کا اقرب الی الحدیث ہونا ثابت کریں، اور فرمایا کرتے تھے کہ معدودے چند مسائل کے علاوہ مجھے اس میں کامیابی ہوگئی ہے۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ امام محمد، امام طحاوی، امام زیلعی، اور شیخ ابن الہمام کے بعد ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی اس طرف کامل ومکمل توجہ مبذول ہوئی ہے جو بڑی حد تک کامیابی سے بھی ہمدوش ہوئی، یوں تو اکابر کی بہت بڑی تعداد نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان سے انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر افسوس ہے کہ حضرتؒ کے افادات وتحقیقاتِ عالیہ کا اکثر وبیشتر حصہ ضائع ہوگیا۔ اور تعلیقاتِ آثار السنن کی صورت میں جتنا وہ موجود ہے، وہ بھی ابھی تک ناقابلِ انتفاع ہے۔ والامر بیداللہ

قولہ لم یحن احد: فرمایا کہ یہ صورت اس وقت پیش آئی کہ حضور علیہ السلام کا بدنِ مبارک بھاری ہوگیا تھا اور یہ خطرہ تھا کہ کہیں مقتدی آپ سے پہلے سجدہ میں نہ پہنچ جائیں، حالانکہ امام سے قبل کسی رکن میں جانا ممنوع ہے، لہٰذا صحابۂ کرام اس امر کا بہت خیال رکھتے تھے، اور اسی لئے یہ مسئلہ بھی ہے کہ مقتدی ایک ہو تو اسے امام سے کچھ پیچھے رہنا چاہئے، تاکہ آگے ہوجانے کا احتمال نہ رہے کیونکہ آگے ہوجانے سے مقتدی کی نماز فاسد ہوجاتی ہے۔

ضروری نوٹ: کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ ص۳۰۹\۱ مبحث تقدم الماموم میں لکھا کہ برخلاف دیگر مذاہب ائمہ کے مالکیہ کے نزدیک اقتدا کے لئے تقدمِ امام شرط نہیں ہے۔ لہٰذا اگر مقتدی امام سے آگے ہوکر بھی نماز پڑھے گا تو اس کی نماز جماعت سے درست ہو جائے گی البتہ بلاضرورت ایسا کرنا مکروہ ہے۔ کثرتِ زائرین کے وقت دیکھا گیا کہ بہت سی صفیں مسجدِ نبوی سے آگے سمتِ قبلہ میں بھی ہو جاتی ہیں لہٰذا یاد رہے کہ بجز مالکیہ کے دوسروں کی نمازیں درست نہ ہوں گی۔

باب السجود علیٰ الانف
ناک کے بل سجدہ کرنے کا بیان

۷۷۲: حدثنا معلیٰ بن اسدثنا وھیب عن عبداللہ بن طاؤس عن ابیہ عن ابن عباس قال قال النبی صلے اللہ علیہ وسلم امرت ان اسجد علیٰ سبعۃ اعظم علی الجبھۃ واشار بیدہ الیٰ انفہ والیدین والرکبتین واطراف القدمین ولانکفت الثیاب والشعر

ترجمہ: حضرت ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں کے بل سجدہ کروں، پیشانی کے بل اور آپ نے اپنے ہاتھ سے اپنی ناک اور دونوں ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں اور پیروں کی انگلیوں کی طرف اشارہ کیا، اور (یہ بھی فرمایا، کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز میں) کپڑوں اور بالوں کو نہ سمیٹیں۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام اعظمؒ سے جو روایت پیشانی کے بغیر صرف ناک پر سجدہ کرنے کے جواز کی ہے، اس سے

رجوع بھی ثابت ہوا ہے، لہٰذا صاحبین کی طرح امام صاحب کا بھی یہی مسلک ہوا کہ بغیر کسی عذر کے اس طرح کرنے سے نماز نہ ہوگی، علامہ عثمانیؒ نے لکھا کہ تینوں اکابر حنفیہ میں کوئی اختلاف نہیں کیونکہ امام اعظم بھی اقتصار علی الانف کو مکروہ تحریمی فرماتے ہیں جو کہ ترک واجب کی صورت میں ہوتا ہے اور صاحبین کا قول عدم جواز کا مطلب بھی عدم حلت ہے جو کراہتِ تحریمی کو مقتضی ہے لہٰذا پیشانی پر سجدہ کرنا بالاتفاق واجب ہوا اور وہی حدیث و آثار کا بھی مقتضیٰ ہے۔

حافظؒ نے جو ابن المنذر سے اجماع نقل کیا صرف انف پر عدمِ جوازِ سجدہ کا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ معتد بہ طریقہ پر نماز درست نہ ہوگی۔ (فتح الملہم ص ۲\۹۸)

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کا ارشاد

آپ نے لامع میں فرمایا:۔ حدیث میں آتا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کیا جائے جن میں پیشانی کی صراحت ہے لیکن حدیث الباب میں سات کے بعد پیشانی کیساتھ اشارہ ناک کی طرف بھی فرمایا، اور پیشانی پوری زمین پر رکھی جائے گی تو ناک بھی ضرور اس کے ساتھ لگے گی، نہ لگے گی تو پیشانی کا بھی کچھ حصہ لگنے سے باقی رہ جائے گا، لہٰذا اشارہ سے یہ بتلایا گیا کہ پیشانی پر سجدہ کی تکمیل جب ہی ہوگی کہ ناک بھی ساتھ رکھی جائے۔

محقق ابن دقیق العید نے فرمایا کہ حدیث الباب کے بارے میں کہا گیا کہ اس سے پیشانی اور ناک کا بمنزلہ عضو واحد ہونا ثابت ہوا، ورنہ اعضاءِ سجود آٹھ ہو جاتے، لیکن اس میں نظر ہے کیونکہ اس سے لازم آئے گا۔ کہ سجدہ میں ناک پر بھی اکتفا کرنا جائز ہو جیسا کہ پیشانی کے کچھ حصہ پر بھی جائز ہے، اور اس سے امام ابو حنیفہؒ کے لئے استدلال کیا گیا ہے، لیکن جمہور کا مسلک اگرچہ پیشانی پر جواز اکتفا کا ہے، تاہم امام احمد و اسحٰق وغیرہم پیشانی و ناک ایک ساتھ دونوں ہی پر سجدہ کو واجب کہتے ہیں، اور یہ امام شافعی کا بھی ایک قول ہے۔ (الابواب ص ۲\۲۹۶)

قوله ولا نكفت الثياب:۔ ممانعت نے بتلایا کہ کپڑے اور بال بھی سجدہ کرتے ہیں، اور آگے امام بخاری ایک باب عقد الثیاب کا بھی لائیں گے، تا کہ اس ممانعت کو عام اور مطلق نہ سمجھا جائے، کیونکہ انکشاف ستر کا اندیشہ ہوگا تو کپڑے کو روکنا بھی پڑے گا۔

باب السجود علىٰ الانف فى الطين

(ناک کے بل سجدہ کرنے کا بیان)

۷۷۳: حدثنا موسىٰ ثنا همام عن يحيىٰ عن ابى سلمة قال انطلقت الىٰ ابى سعيد الخدرى فقلت الا تخرج بنآ الى النخل نتحدث فخرج قال قلت حدثنى ماسمعت النبى صلے الله عليه وسلم فى ليلة القدر قال اعتكف رسول الله صلے الله عليه وسلم العشر الاول من رمضان واعتكفنا معه' فاتاه جبريل فقال ان الذى تطلب امامک فاعتكف العشر الاوسط واعتكفنا معه' فاتاه جبريل فقال ان الذى تطلب امامک فقام النبى صلے الله عليه خطيباً صبيحة عشرين من رمضان فقال من كان اعتكف مع النبى فليرجع فانى رايت ليلة القدر وانى نسيتها وانها فى العشر الاواخر فى وتر وانى رايت...... كانى اسجد فى طين ومآء وكان سقف المسجد جريد النخل ومانرىٰ فى السمآء شيئاً فجآءت قزعة فامطرنا فصلى بنا النبى صلے الله عليه وسلم حتىٰ رايت اثر الطين والمآء علىٰ جبهة رسول الله صلے الله عليه وسلم وارنبته تصديق رؤياه

ترجمہ ۷۷۳:۔ حضرت ابوسلمہ روایت کرتے ہیں کہ میں (ایک روز) حضرت ابوسعید خدریؓ کے پاس گیا، اور میں نے ان سے (کہا کہ آپ ہمارے ساتھ (فلاں) درخت کی طرف کیوں نہیں چلتے، تاکہ ہم ذکر و تذکرہ کریں، پس وہ نکلے، ابوسلمہ کہتے ہیں، میں نے کہا کہ مجھ سے بیان کیجئے کہ نبی کریم ﷺ سے آپ نے شب قدر کے بارے میں کیا سنا ہے وہ بولے کہ رسول خدا ﷺ نے (ایک بار) رمضان کے پہلے عشرہ میں اعتکاف کیا، اور ہم لوگوں نے بھی آپ کے ساتھ اعتکاف کیا (اس عرصہ میں) جبریل آپ کے پاس آئے اور کہا کہ جس کی آپ کو تلاش ہے (یعنی شب قدر) اس عشرہ کے آگے ہے۔ لہٰذا آپ نے درمیانی عشرہ میں اعتکاف فرمایا، اور ہم نے بھی آپ کے ساتھ اعتکاف کیا۔ پھر جبریل آپ کے پاس آئے اور کہا کہ جس کی تمہیں تلاش ہے وہ اس عشرہ کے آگے ہے، پس بیسویں رمضان کی صبح کو آپ خطبہ پڑھنے کھڑے ہوئے اور فرمایا، کہ جس نے نبی (ﷺ) کے ساتھ اعتکاف کیا ہو، وہ دوبارہ پھر کرے، کیونکہ میں نے شب قدر کو دیکھ لیا، لیکن میں اسے بھول گیا، اور اب صرف اتنا یاد ہے کہ وہ آخر عشرہ میں طاق رات میں ہے، اور میں نے (خواب میں) یہ دیکھا کہ گویا میں مٹی اور پانی میں سجدہ کر رہا ہوں، اور (اس وقت تک) مسجد کی چھت کھجور کی شاخوں سے پٹی تھی، اور (اس وقت) ہم آسمان میں کوئی چیز ابر وغیرہ نہ دیکھتے تھے، اتنے میں ایک ٹکڑا بادل کا آیا، اور ہم پر پانی برسا تو نبی کریم ﷺ نے ہمیں نماز پڑھائی، یہاں تک کہ میں نے کیچڑ کا نشان رسول خدا ﷺ کی پیشانی، اور آپ کی ناک پر دیکھا، یہ آپ کے خواب کی تصدیق تھی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کیچڑ یا دلدل ایسی ہو کہ اس میں چہرہ دھنس جائے تو سجدہ صحیح نہ ہوگا، لہٰذا نماز کو مؤخر کر دے۔

علامہ عینی اور حافظ نے لکھا کہ یہ ترجمہ پہلے ترجمہ سے اخص ہے، اور اس سے ناک پر سجدہ کے تاکد کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ باوجود عذر کے بھی اس کو حضور علیہ السلام نے ترک نہیں کیا۔ بظاہر ترجمہ کی غرض یہی معلوم ہوتی ہے۔ مگر سابق ترجمہ میں امام بخاری نے اختلاف کی طرف اشارہ کیا تھا، اس لئے ممکن ہے یہ بتلانا ہو کہ باوجود اختلاف کے بھی سجدہ علی الانف امرِ مؤکد ہے، تاکہ بلاعذر کے ترک نہ کیا جائے واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب عقدالثياب وشدها ومن ضم اليه ثوبه اذاخاف ان تنكشف عورته

۷۷۴: حدثنا محمد بن كثير انا سفيان عن ابي حازم عن سهل بن سعد قال كان الناس يصلون مع النبي صلى الله عليه وسلم وهم عاقدوا ازرهم من الصغر على رقابهم فقيل للنسآء لاترفعن رءوسكن حتىٰ يستوي الرجال جلوساً

ترجمہ: حضرت سہل بن سعد روایت کرتے ہیں کہ لوگ نبی کریم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے اور وہ اپنے تہبندوں کو چھوٹے ہونے کے سبب سے اپنی گردنوں پر باندھے ہوئے ہوتے تھے اور عورتوں سے کہہ دیا گیا تھا کہ جب تک مرد سیدھے ہو کر بیٹھ نہ جائیں، اس وقت تک تم اپنے سر (سجدے سے) نہ اٹھانا۔

تشریح: حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا:۔ امام بخاریؒ یہاں دو باب لائے ہیں، جن کا تعلق ابواب ثیاب سے تھا اور ابواب ثیاب میں دو باب صفۃِ صلوٰۃ کے لائیں گے باب اذا لم يتم السجود اور باب يبدي ضبعيه، بعض نے کہا کہ لکھنے والوں کی غلطی سے ایسا ہو گیا، مگر میرے نزدیک یہ لطائفِ بخاری میں سے ہے کہ وقتِ نظر اور ذہنوں کی تیزی و تربیت کے لئے وہ ایسا کیا کرتے ہیں، اس کے بعد

توجیہ اور مناسبت نکال لینا آسان ہے، اور یہاں عقدِ ثیاب کا جواز بتلانے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ دوسری حدیث میں کفِ ثیاب کی ممانعت وارد ہے، جو اس لئے ہے کہ وہ بھی سجدہ کرتے ہیں اور ان کے روکنے سمیٹنے میں دھیان بھی بٹتا ہے جو خشوع و خضوع صلوٰۃ کے منافی ہے اور عقدِ ثیاب کا جواز کشفِ عورت سے بچنے کے لئے ہے کہ ایسی نوبت بھی نہ آجائے۔

پھر یہ کہ امام بخاری نے کفِ شعر کو تو مطلق رکھا اور کفِ ثیاب کو نماز کے ساتھ مقید کیا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ حسب تصریح علامہ عینی داؤدی اس کے قائل ہیں کہ حدیث سے کفِ شعر و ثیاب کی ممانعت نماز کے اندر کی ہے، جس کو قاضی عیاض نے رد بھی کیا اور جمہور بھی اس کے خلاف ہیں وہ کہتے ہیں کہ دونوں باتیں مکروہ ہیں خواہ پہلے کر کے نماز پڑھے یا نماز کے اندر کرے (عمدہ ص ۳\۱۵۵) امام بخاری نے بظاہر داؤدی کی بات ثیاب کے بارے میں اختیار کر لی ہے، تاہم اس بارے میں سب متفق ہیں کہ ان دونوں کے نماز میں کرنے سے بھی نماز فاسد نہیں ہوتی۔ (الابواب ص ۲\۳۹۷)

قولہ لا ترفعن: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ ستر میں شرعاً اعتبار فی نفسہٖ تستر کا ہے، لہٰذا اگر کوئی دوسرا اس کے باوجود بھی غور و تعمق کر کے کسی کا ستر دیکھ لے تو وہ گنہگار ہوگا، یا نہ ہوگا، اور یہ مسئلہ کپڑوں کی وسعت و فراخی کے وقت کے لئے ہے، ورنہ حدیث میں جو ذکر ہے وہ تو بہت تنگی و کمی کا دور تھا جیسا کہ راویِ حدیث مسلم نے اس کی صراحت کی ہے۔

باب لایکف شعرًا

(نماز میں) بالوں کو نہ روکے

۷۷۵: حدثنا ابوالنعمان ثنا حماد بن زید عن عمرو بن دینار عن طاؤس عن ابن عباس قال امر النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان یسجد علیٰ سبعة اعظم و لایکف شعرہ' و لاثوبہ

ترجمہ: حضرت ابنِ عباسؓ نے کہا کہ نبی کریم ﷺ کو (خدا کی طرف سے) یہ حکم دیا گیا تھا، کہ سات ہڈیوں کے بل سجدہ کریں (اور نماز پڑھنے میں) نہ اپنے بالوں کو روکیں اور نہ کپڑا (سنبھالیں)۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ بالوں کو اس لئے نہ روکے کہ وہ بھی سجدہ کرتے ہیں، چونکہ اس کے لئے حدیث امام بخاری کی شرط پر نہ تھی، اس لئے سجود علی سبعۃ اعظم اور کفِ شعر کی حدیث لائے، جس سے اشارہ کیا کہ یہ ساتوں اعضاء بھی سجدہ کرتے ہیں لہٰذا یہ نہیں کہ انسان تو سجدہ کرے گا اور یہ اعضاءِ سجود صرف ذریعہ سجود ہوں گے۔ لہٰذا سر کے بال بھی سر کے ساتھ سجدہ کریں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا کہ نماز ہیئتِ معتادہ مستحسنہ کے اندر ہونی چاہئے، اور عرب کے لوگ بال چھوڑے رکھتے تھے، اس لئے بالوں کو سر پر باندھنے کی صورت ان کے یہاں بھی مستحسن نہ تھی، لہٰذا اس سے روکا گیا۔ (شرح تراجم ابواب البخاری ص ۲۵) مگر جب بالوں کو چھوڑے رکھنے کا استحسان اس لئے ہوا کہ وہ بھی سجدہ کرتے ہیں، تو اگر کسی وقت لوگ بالوں کے باندھنے کو بھی مستحسن سمجھنے لگیں تب بھی شرعی استحسان تو ارسال ہی رہے گا، لہٰذا نماز کے معاملہ کو خارجی عادات و استحسان کے ساتھ مرتبط نہ کیا جائے تو زیادہ اچھا ہے۔

باب لایکف ثوبہ' فی الصلوٰۃ

(نماز میں کپڑا نہ سمیٹے)

۷۷۶: حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل ثنا ابوعوانة عن عمرو عن طاؤس عن ابن عباس عن النبی صلے اللہ علیہ وسلم قال امرت ان اسجد علیٰ سبعة اعظم لا اکف شعرًا و لاثوباً

ترجمہ۷۷۶: حضرت ابن عباسؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا:۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں اور نہ بالوں کو سمیٹوں نہ کپڑے کو۔

تشریح: ہم پہلے بتلا چکے ہیں کہ ضرورتِ ستر وغیرہ کے لئے کپڑوں کو روکنے اور سمیٹنے میں کوئی حرج نہیں کیونکہ ستر عورت فرض ہے، اس کی رعایت مقدم ہے، یہاں بتلایا کہ دوسرے حالات میں کپڑوں کو اپنی حالت پر ہی رہنے دیا جائے، اور ان کو روکنے سمیٹنے کی طرف خیال و توجہ صرف نہ کی جائے۔

باب التسبیح والدعآء فی السجود

سجدوں میں دعا اور تسبیح کا بیان

۷۷۷: حدثنا مسدد قال لنا یحیٰ عن سفین قال حدثنی منصور عن مسلم عن مسروق عن عآئشۃؓ قالت کان النبی صلے اللہ علیہ وسلم یکثر ان یقول فی رکوعہ وسجودہ سبحانک اللھم ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی یتاول القرآن

ترجمہ۷۷۷: حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ اکثر اپنے رکوع اور اپنے سجود میں کہا کرتے تھے **سبحانک اللھم وبحمدک ربنا وبحمدک اللھم اغفرلی** آپ قرآن کے حکم کی تعمیل کرتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ حضور اکرم ﷺ سے متعدد مواضع کے اندر دعائیں ثابت ہیں، تحریمہ کے بعد قراءت سے قبل، قراءت کے بعد رکوع سے پہلے، رکوع میں، قومہ میں، سجدہ میں، دونوں سجدوں کے درمیان تشہد کے بعد سلام سے قبل، طبرانی کی روایت سے معلوم ہوا کہ فاتحہ کے بعد آمین تین بار کہی، اور ایک طرح یہ وارد ہوا کہ آمین کے بعد آپ نے **اللّٰھم اغفرلی** کہا۔ پھر یہ کہ اگر کوئی مواضع مشہورہ کے علاوہ بھی دعا کرے تو اس کی بھی شارع نے تحسین کی ہے، اور کوئی ناپسندیدگی اس پر ظاہر نہیں کی، ہمارے فقہاء میں سے محقق ابن امیر الحاج نے لکھا کہ ادعیہ واذکار سب نمازوں میں درست ہیں، اور فرائض میں بھی بشرطیکہ مقتدیوں پر گرانی نہ ہو، اور فرض نمازوں میں چونکہ تخفیف کی رعایت کی گئی ہے جیسا کہ حضرت معاذؓ کے واقعہ سے معلوم ہوا، اس لئے ادعیہ واذکار کا اجراء ان میں نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ ان کا ذکر بھی کتبِ فقہ میں ترک ہو گیا اور صرف نوافل میں ان کا ذکر رہ گیا، کیونکہ وہ متنفل کی مرضی پر ہیں، جتنا چاہے ان کو طول دے سکتا ہے، اسی سے ترقی کر کے ایسا بھی ہوا کہ بعض کتبِ فقہ میں مکتوبات و فرائض کے اندر اذکار و ادعیہ کو مکروہ یا ناجائز بھی لکھ دیا گیا۔ حالانکہ وہ صرف اس وقت ہے کہ قوم پر بار ہوں۔ ورنہ نہیں چونکہ اس سے حنفیہ کے یہاں ادعیہ واذکار کا باب بہت محدود اور تنگ ہو جاتا ہے، اور یہ حدیث کے بھی خلاف ہے، اس لئے تنبیہ کی ضرورت ہوئی۔ حضرتؒ نے اس تقریب سے یہ بھی فرمایا کہ ہمارے حضرات میں سے شیخ ابن ہمامؒ کی مطرد عادت ہے کہ وہ حنفیہ کے اقوال میں سے اس قول کو اختیار کرتے ہیں جو احادیث کے موافق ظاہر ا۔

شیخ ابن الہمام اور شاہ صاحبؒ کی مماثلت

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ کی بھی ہو بہو ایسی ہی عادت تھی، وہ بھی ہر وقت حدیثِ نبوی صحیح و قوی کا قرب ڈھونڈتے تھے، اور کسی تاویلِ بعید کو پسند نہ کرتے تھے، کاش! ہمارے زمانہ کے حضرات اساتذہ و شیوخ حدیث بھی اسی روش کو اپنائیں کہ یہی طریقہ احق و اسلم بھی ہے۔ حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا کہ میرے نزدیک منفرد کے لئے رکوع و سجود میں دعا کی بھی اجازت ہے۔

قولہ یتاول القرآن:۔ فرمایا سورۂ نصر میں جو حضور علیہ السلام کے لئے استغفار کا حکم ہوا تھا، یہ اسی کی تعمیل تھی کہ حسب روایت حضرت عائشہؓ حضور علیہ السلام نے تسبیح و استغفار کی آخر زمانہ میں رکوع و سجود میں بھی بہت کثرت کی تھی، اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے بھی اس کا وظیفہ کرتے تھے، کیونکہ اس میں حضور علیہ السلام کو قربِ وفات کی خبر دی گئی تھی، اور اب بھی کوئی آخر عمر میں اس طرح کرے تو یہ اتباع سنت ہوگا، اور کوئی اگر یہ کہے کہ ایسا حکم صرف حضور علیہ السلام کے لئے تھا، ہمارے لئے نہیں تو اس کی بھی گنجائش ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ بعض امالی میں سورۂ نصر کی جگہ سورۂ فتح لکھا گیا ہے، وہ صحیح نہیں کیونکہ سورۂ فتح ۲۶ ویں پارہ میں ہے۔

باب المکث بین السجدتین

دونوں سجدوں کے درمیانی ٹھہرنے کا بیان

۷۷۸: حدثنا ابو النعمان قال حدثنا حماد عن ایوب عن ابی قلابۃ ان مالک ابن الحویرث قال لاصحابہ الا انبئکم صلوٰۃ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم قال وذاک فی غیر حین صلوٰۃ فقام ثم رکع فکبر ثم رفع راسہ ھنیۃً فصلی صلوٰۃ عمرو بن سلمۃ شیخنا ھذا قال ایوب کان یفعل شیئاً لم ارھم یفعلونہ' کان یقعد فی الثالثۃ او الرابعۃ فاتینا النبی صلے اللہ علیہ وسلم فاقمنا عندہ' فقال لو رجعتم الیٰ اھالیکم صلوا صلوٰۃ کذا فی حین کذا صلوٰۃ کذا فی حین کذا فاذا حضرت الصلوٰۃ فلیؤذن احدکم ولیؤمکم اکبرکم

۷۷۹: حدثنا محمد بن عبدالرحیم قال حدثنا ابو احمد محمد بن عبداللہ الزبیری قال حدثنا مسعر عن الحکم عن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ عن البراء قال کان سجود النبی صلے اللہ علیہ وسلم ورکوعہ' وقعودہ' بین السجدتین قریباً من السوآء

۷۸۰: حدثنا سلیمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زید عن ثابت عن انس بن مالک قال انی لاالوان اصلی بکم کما رایت النبی صلے اللہ علیہ وسلم یصلی بنا قال ثابت کان انس بن مالک یصنع شیئاً لم ارکم تصنعونہ' کان اذا رفع راسہ' من الرکوع قام حتیٰ یقول القآئل قد نسی وبین السجدتین حتیٰ یقول القآئل قد نسی

ترجمہ ۷۷۸:۔ حضرت ابو قلابہ روایت کرتے ہیں کہ مالک بن حویرث نے اپنے دوستوں سے کہا کہ کیا میں تمہیں رسولِ خدا ﷺ کی نماز (کی کیفیت) بتلاؤں، ابو قلابہ کہتے ہیں، وہ وقت کسی فرض نماز کا نہ تھا، لہٰذا وہ کھڑے ہو گئے، پھر انہوں نے رکوع کیا اور تکبیر کہی اس کے بعد اپنا سر اٹھایا، اور تھوڑی دیر کھڑے رہے اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر کھڑے رہے اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر اپنا سر اٹھائے رکھا، اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر اپنا سر اٹھائے رکھا، اس کے بعد سجدہ کیا، پھر تھوڑی دیر اپنا سر اٹھائے رکھا، پس انہوں نے ہمارے اس شیخ یعنی عمرو بن سلمہ کی جیسی نماز پڑھی، ایوب کہتے ہیں کہ وہ ایک بات ایسی کرتے تھے کہ ہم نے اور لوگوں کو اسے کرتے ہوئے نہیں دیکھا تیسری یا چوتھی رکعت میں بیٹھتے تھے (مالک بن حویرث) کہتے ہیں کہ ہم اسلام لانے کے بعد نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور آپ کی خدمت میں قیام کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم اپنے اہل و عیال میں واپس جاؤ، تو اس طرح ان اوقات میں نماز ادا کیا کرنا، لہٰذا جب نماز کا وقت آ جائے تو تم میں سے کوئی اذان کہہ دے، اور تم میں کا بڑا تمہاری امامت کرے۔

ترجمہ ۷۷۹:۔ حضرت براءؓ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کا سجود اور آپ کا رکوع، اور آپ کا بیٹھنا دونوں سجدوں کے درمیان میں

(ٹھہرنا) تقریباً برابر ہی ہوتا تھا۔

ترجمہ ۷۸۰: حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ میں اس بات میں کمی نہ کروں گا کہ تمہیں ویسی ہی نماز پڑھاؤں جیسی کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو پڑھاتے دیکھا ہے، ثابت کہتے ہیں کہ انس بن مالک ایک بات ایسی کرتے تھے کہ میں نے تم لوگوں کو وہ عمل کرتے نہیں دیکھا وہ جب اپنا سر رکوع سے اٹھاتے اتنا کھڑا رہتے کہ کہنے والا کہتا کہ وہ (سجدہ کرنا) بھول گئے اور دونوں سجدوں کے درمیان میں (اتنی دیر تک بیٹھے رہتے تھے) کہ دیکھنے والا سمجھتا کہ وہ (دوسرا سجدہ) کرنا بھول گئے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ قال ایوب الخ سے معلوم ہوا کہ جلسۂ استراحت درجۂ خمول میں آ گیا تھا اور اس پر عمل بہت کم ہو گیا تھا، تاہم روایات میں اس کے ثبوت سے انکار بھی نہیں ہو سکتا، علامہ حلوانی نے اس کا جواز بھی تسلیم کیا ہے اور ہم نے جس نے اس کو مکروہ کہا ہے وہ طوالت پر محمول ہے کہ قدرِ معتاد سے زیادہ دیر تک کیا جائے، ورنہ کراہت یا عدمِ جواز کا قول حدیث ہوگا۔ شافعیہ سے بھی تطویلِ اعتدال کی ممانعت منقول ہے بلکہ انہوں نے اس کو مفسدِ صلوٰۃ بھی کہا ہے۔ (الابواب ص۲۹۲\۲)

حضرتؒ نے فرمایا:۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ اکثر حدیثوں میں جلسۂ استراحت نہیں ہے، حافظ نے کہا کہ بعد کو امام احمد نے اس سے رجوع کر لیا تھا، میں کہتا ہوں کہ آخر عمر میں امام احمدؒ نے ضعف کے باعث جلسۂ استراحت کیا ہوگا، جس کو حافظؒ نے رجوع بنا لیا۔ میرا وجدان کہتا ہے کہ جلسۂ استراحت سنتِ راتبہ نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات میں بوقتِ ضرورا ایسا ہوا ہے۔

باب لایفترش ذراعیه فی السجود وقال ابو حمید سجد النبی ﷺ ووضع یدیه غیر مفترش ولا قابضهما

۷۸۱: حدثنا محمد بن بشار قال حدثنا محمد بن جعفر قال حدثنا شعبة قال سمعت قتادة عن انس بن مالک عن النبی صلے الله علیه وسلم قال اعتدلوا فی السجود ولا یبسط احدکم ذراعیه انبساط الکلب

ترجمہ ۷۸۱:۔ حضرت انس بن مالکؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا، سجدوں میں اعتدال کرو، اور کوئی شخص اپنی دونوں کہنیاں (زمین پر) جس طرح کہ کتا بچھا لیتا ہے، نہ بچھائے۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ ابوداؤد میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں اور ان کے سجدہ کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ وہ اوپر سے اٹھے ہوئے ہوں اور نیچے سے پست ہوں، افتراش کی صورت میں ظاہر ہے کہ یہ صورت نہ رہے گی تو ان کا سجدہ بھی متصور نہ ہوگا، دوسرے یہ بھی ہے کہ حدیث سے نماز میں بری ہیئت اور حیوانات کے ساتھ تشبہ کو ناپسند کیا گیا اور افتراش (کہنیاں بچھا کر سجدہ کرنے) سے کتے کی مشابہت ہوتی ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص تعب و تھکن کی وجہ سے تراویح کی نماز میں ایسا کرے تو اس کیلئے گنجائش ہے۔

باب من استویٰ قاعداً فی وتر من صلوته ثم نهض

(نماز کی طاق رکعت میں سیدھے بیٹھنے' پھر کھڑے ہونے کا بیان)

۷۸۲: حدثنا محمد بن الصباح قال اخبرنا هشیم اخبرنا خالد ن الحذآء عن ابی قلابة قال اخبرنی مالک بن الحویرث اللیثی انه' رای النبی صلے الله علیه وسلم یصلی فاذا کان فی وتر من صلوته لم ینهض حتیٰ یستوی قاعداً

ترجمہ۷۸۲: حضرت لیثی بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کو نماز پڑھتے دیکھا تو (کیا دیکھا کہ) جب آپ اپنی نماز کی طاق رکعت میں ہوتے تھے تو جب تک سیدھے نہ بیٹھ جاتے تھے۔ کھڑے نہ ہوتے تھے۔

تشریح: حضرتؒ نے فرمایا: اب امام بخاریؒ نے صراحت کے ساتھ جلسۂ استراحت کا عنوان قائم کر دیا ہے، اور حافظ نے سمجھا کہ یہی امام کا مختار بھی ہے اور ان کے نزدیک سنت ہے، میرے نزدیک سنت ہونے کا حال تو اوپر ابوب کے قول سے معلوم ہو چکا ہے اور امام احمدؒ کے اس قول سے بھی کہ احادیث میں اس کے لئے بہت کم ثبوت ہے، اور خود امام احمد بھی اس پر عمل نہیں کرتے تھے، اگرچہ آخر عمر میں بوڑھاپے کے عذر کی وجہ سے کیا ہے، اور یہ امام بخاری کا بھی مختار ہونا ضروری نہیں، نہ انہوں نے اس کی صراحت کی اور نہ کوئی اور دلیل اس پر ہے، بلکہ باب من استوی کے من سے تو اشارہ اس طرف ہوا کہ دوسرے لوگوں کے مختار کی دلیل پیش کرنا چاہتے ہیں، اور جب کسی مسئلہ میں نظر دائر و سائر ہوتی ہے تو امام بخاری اسی طرح عنوان قائم کیا کرتے ہیں اور اپنے اوپر اس کی ذمہ داری نہیں لیتے۔

دوسرے ہم پہلے بھی بتلا چکے ہیں کہ جلسۂ استراحت کو اختیار کرنا اس لئے بھی محلِ تامل ہے کہ جلسہ کے بعد اگر اٹھتے ہوئے تکبیر نہ کہے گا تو خلافِ سنتِ معہودہ ہوگا کیونکہ ہر رفع وخفض میں تکبیر ہے، اگر کہے گا تو تکبیراتِ مقررہ سے تعداد بڑھ جائے گی اور اگر سجدہ سے اٹھتے ہوئے جو تکبیر کہی تھی اسی کو اتنا طویل کرے گا کہ وہ جلسہ میں بھی رہے اور اس سے اٹھنے کے وقت تک بھی چلتی رہے تو اس میں دشواری ہے، یہ سب بے اصولی کا ارتکاب محض اس لئے ہوگا کہ نماز کا جلسۂ استراحت خمول میں رہا ہے اور جو چیز خامل و نادر ہوتی ہے اس کے لئے بحث و تمحیص، اور تاصیل وتفریع نہیں ہوا کرتی، جیسے کہ قراءۃِ فاتحہ خلف الامام اور رفع یدین کے مسائل میں بھی یہی صورت پیش آئی ہے۔

تفصیل مذہب وتحقیق مزید

امام ترمذیؒ نے سجدہ سے اٹھنے کی کیفیت بتلانے کے لئے باب قائم کیا اور اس کیلئے مالک بن الحویرثؓ کی حدیث الباب بخاری پیش کی پھر لکھا کہ اسی پر بعض اہلِ علم اور ہمارے اصحاب کا عمل ہے، پھر دوسرا باب قائم کر کے حدیث ابی ہریرہؓ ذکر کی جس میں حضور علیہ السلام کے سجدہ کے بعد بغیر جلسۂ استراحت کے کھڑے ہونے کا ثبوت ہے اور لکھا کہ اس پر بھی اہلِ علم کا عمل ہے، مگر یہ حدیث ضعیف ہے۔

امام بخاری نے چونکہ عنوان باب من استوی سے قائم کیا ہے، اس لئے حضرت شاہ صاحبؒ کا رجحان ہے کہ یہ ان کے اختیار و رجحان کی دلیل نہیں، کیونکہ وہ عام طور سے اس طرح جب کرتے ہیں کہ خود اپنا مختار نہ ہو لہٰذا دوسروں کا مختار نقل کرتے ہیں۔ معارف السنن میں جوہر نقی اور تمہید ابن عبدالبر سے نقل کیا کہ امام مالک، امام ابوحنیفہ ان کے اصحاب اور اوزاعی کا مذہب یہ ہے کہ سجدہ کے بعد دوسری اور چوتھی رکعت کے لئے بغیر جلوس کے کھڑا ہو جائے اور یہی حضرت ابن مسعود، ابن عمر و ابن عباس و ابوسعید و ابن زبیر کا مختار ہے، ابوالزناد اور نعمان بن ابی عیاش نے کہا کہ میں نے بہت سے صحابۂ کرام کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔ اور یہی امام احمد و ابن راہویہ کا مذہب ہے۔ امام احمد نے فرمایا کہ اکثر احادیث سے یہی ثابت ہوتا ہے، اثرم نے کہا کہ میں نے امام احمد کو دیکھا کہ سجدہ کے بعد اپنے پیروں کے پنجوں پر اٹھ جاتے تھے، اور اٹھنے سے قبل جلوس نہیں کرتے تھے۔

ان سب حضرات کی دلیل حدیثِ ابی حمید و حدیثِ رفاعۃ بن رافع ہے اور ابن بہت نعیم کی ''نوادر الفقہاء'' میں اس پر اجماع نقل کیا اور صرف امام شافعی کا اختلاف بتلایا۔ علامہ موفق حنبلی نے المغنی ص ۱۵۷/۱ میں حضرت عمر و علی سے بھی جلسۂ استراحت کا ترک نقل کیا۔ حضرت علامہ کشمیریؒ نے اپنی تعلیقاتِ آثار السنن میں بحوالہ ''سعایہ'' مجد الدین ابن تیمیہ (جد تقی الدین ابن تیمیہؒ) سے صحابہ کا اجماع ترکِ جلسۂ استراحت پر نقل کیا۔ غرض یہی امام ابوحنیفہؒ و مالک و جمہور کا مختار ہے اور امام احمد سے بھی مشہور روایت و عمل ترک ہی کا منقول ہے اور جن

حضرات نے ان کا رجوع نقل کیا وہ بوجہ عذر آخری عمر کا فعل ہوگا جیسا کہ مالک بن الحویرث کی روایت کے لئے بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے کسی بیماری کے وقت یا اخری عمر ضعف کے وقت حضور علیہ السلام کا فعل دیکھ کر روایت کیا ہے، کیونکہ وہ صرف بیس ۲۰ دن حضور کی خدمت میں رہے تھے، اسی لئے ان کی تائید میں شواہد بھی، ترک کے شواہد سے کم ہیں۔

علامہ عینی نے عمدہ ص۳۰۷\۲ میں علامہ سفاقسی کے حوالہ سے ابوعبدالملک کا قول نقل کیا کہ امام شافعیؒ کے جلسۂ استراحت والی بات کیا اہلِ مدینہ سے مخفی رہتی جبکہ انہوں نے دس سال تک حضور علیہ السلام کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں، اور حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور دوسرے صحابہ وتابعین نے بھی ان کو نمازیں پڑھائی ہیں، ایسی بڑی بات ان سب سے چھپی رہتی، یہ بہت ہی مستبعد امر ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر امام احمد کا رجوع صحیح ہوتا تو ان کے اصحاب کیوں جلسۂ استراحت کو ترک کرتے؟ البتہ اتنی بات ممکن ہے کہ انہوں نے حدیثِ مالک بن الحویرثؓ کی وجہ سے اس کی کراہت سے رجوع کر کے اباحت کا قول اختیار کر لیا ہو، لہٰذا سنیتِ جلسہ کی طرف رجوع پھر بھی نہ ہوگا۔ (معارف ص۸۷\۳)

علامہ شوکانی کا استدلال وجواب

آپ نے لکھا کہ مالک بن الحویرث سے جلسۂ استراحت کی مشروعیت نکلتی ہے، امام شافعی کا مشہور مذہب یہی ہے اور امام احمد سے دو روایت ہیں، خلال نے کہا کہ انہوں نے جلسہ کی طرف رجوع کر لیا تھا، اور اکثر حضرات نے اس کو مستحب نہیں سمجھا، ان کی دلیل نعمان بن ابی عیاش کا قول ہے کہ میں نے بہت سے صحابہ کو دیکھا کہ وہ بغیر جلسہ کے سیدھے کھڑے ہو جایا کرتے تھے، لیکن یہ قول اس کے سنت ہونے کے خلاف نہیں ہے کیونکہ ممکن ہے حضور علیہ السلام نے اور صحابہ نے بھی بعض حالات میں ترک کیا ہوگا، جس سے صرف وجوب کی نفی ہوگی اور سنیت باقی رہے گی۔ (بستان الاحبار ص۲۴۷\۱)

اعلاء السنن ص۵۱\۳ میں علامہ شوکانی کا نیل الاوطار ص۱۶۴\۱ سے یہ قول نقل کیا:۔ ہم نے شرحِ حدیث مسیئ الصلوٰۃ میں بتلایا تھا کہ جلسۂ استراحت کا ذکر بخاری وغیرہ میں بھی ہے (اور علامہ نووی کا اس سے انکار کرنا غلط ہے، اس لئے ذکرِ روایتِ بخاری سے وجوب پر بھی ہم استدلال کر سکتے ہیں مگر چونکہ خود امام بخاری نے ہی اس کے ذکر کو وہم بھی قرار دے دیا ہے، اور ہم یہ بھی بتلا چکے ہیں کہ وجوب کا قائل کوئی بھی نہیں ہوا ہے، اس لئے وجوب کا قول نہیں کر سکتے، یعنی سنیت پھر بھی باقی رہی۔

مگر ظاہر ہے کہ ایسے معاملات میں جو زمانۂ نبوت وبعد نبوت میں رات دن بہ کثرت پیش آئے ہیں، اختلاف کے موقع پر سب سے بہتر فیصلہ تعاملِ صحابہ وتابعین وسلف سے ہی ہو سکتا ہے اور وہ جمہور کے حق میں ہے۔

صاحب عون المعبود کا استدلال وجواب

اعلاء السنن ۵۲\۳ میں صاحب عون کا کلام بابتہ حدیثِ ابن عمرؓ نقل کر کے ان کے قلتِ علم بالرجال اور متعدد غلطیوں کو ثابت کیا گیا۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی کا نقد وجواب

آپ نے شرح ترمذی شریف مذکور ص۲۳۷\۱ میں لکھا کہ امام احمد سے دو روایتیں ثابت ہیں جن کو صاحب المغنی اور صاحب شرح کبیر ابوالفرج شمس الدین مقدسی نے نقل کیا اور ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا کہ خلال نے بیان کیا کہ امام احمد نے جلسۂ استراحت کے مسئلہ میں حدیثِ مالک بن الحویرث کی طرف رجوع کر لیا تھا پھر لکھا کہ "بعض حنفیہ نے تعلیقات ترمذی میں حافظ ابن حجر وابن القیم سے امام

احمدؒ کے رجوع کی بات نقل کر کے کہا کہ میرا گمان ہے انہوں نے رجوع نہ کیا ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ ان کے گمان مذکور کا منشأ محض تقلید ہے کیونکہ جب وہ کسی کے دل میں گھر کر جایا کرتی ہے تو اس سے ایسے ہی ظنونِ فاسدہ پیدا ہوا کرتے ہیں''۔ (واضح ہو کہ یہ تعریض حضرت علامہ کشمیریؒ اور العرف الشذی کی طرف ہے) اس پر صاحب معارف السنن نے لکھا کہ علامہ مبارکپوری نے عبارت مغنی وشرح کبیری نقل میں خیانت کی کہ ان کا کچھ حصہ نقل کر دیا اور کچھ چھوڑ دیا تا کہ یہ تاثر دیا جاسکے کہ امام احمد نے اثباتِ جلسۂ استراحت کو ہی اختیار کر لیا تھا اور موفق و ابوالفرج و ماردینی سے نقل کیا کہ وہ سب حدیث مالک بن الحویرثؓ کو حالتِ عذر پر محمول کرتے تھے، جیسا کہ حدیث انی بدنت اور تربع ابن عمرؓ حالتِ عذر پر محمول ہیں۔ اور موفق نے یہ بھی لکھا کہ جمع بین الاخبار اور توسط بین القولین کے لئے یہی بہتر ہے۔ پھر لکھا کہ ابن القیم نے بھی رجوع کی بات ضرور نقل کی ہے مگر ساتھ ہی انہوں نے امام احمد کے پہلے قول کو ترجیح دی ہے اور وہ عبارت بھی صاحب تحفہ نے چھپا دی ہے، (کیا یہی اہلِ علم کا شیوہ ہے، جو اپنے آپ کو بڑے فخر کے ساتھ سلفی بھی کہتے ہیں) علامہ ابن القیم کی زاد المعاد میں پوری عبارت یہ ہے:۔

''سجدہ کے بعد حضور ﷺ سیدھے کھڑے ہو جاتے تھے، اسی طرح وائل اور ابو ہریرہؓ نے نقل کیا ہے، البتہ مالک بن الحویرث کی روایت سے جلسۂ استراحت معلوم ہوتا ہے، اس لئے فقہا میں اختلاف ہوا کہ آیا یہ نماز کی سنتوں میں سے ہے جس کو ادا کرنا چاہئے یا صرف عذر والے بوڑھوں، ضعیفوں، بیماروں کو ایسا کرنا چاہئے۔ ضرورت کی وجہ سے۔ امام احمد سے دو قول منقول ہیں۔ ایک یہی بھی ہے کہ انہوں نے مالک بن الحویرث کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، لیکن ان تمام حضرات نے جنہوں نے نماز کی پوری کیفیت وطریقہ نقل کیا ہے انہوں نے جلسۂ استراحت کو نقل نہیں کیا ہے، صرف ابوحمید و مالک بن الحویرثؓ کی حدیثوں میں اس کا ذکر آیا ہے، اور اگر حضور علیہ السلام کی عادتِ مبارکہ ہمیشہ جلسۂ استراحت کرنے کی ہوتی تو ہر شخص نماز کی صفت بیان کرنے والا اس کا ذکر بھی ضرور کرتا، باقی صرف آپ سے اس کا ثبوت یہ نہیں بتلاتا کہ وہ سنن نماز میں سے ہے الا جبکہ اس کا فعل بطورِ سنتِ مقتدیٰ بہا کے ثابت ہو۔ لہٰذا اگر یہ مان لیا جائے کہ اس کو آپ نے کسی ضرورت کے تحت کیا ہے تو اس کا سننِ صلوٰۃ میں سے ایک سنت بن جانا متحقق نہ ہوگا۔ یہی اس مسئلہ میں تحقیقِ مناط ہے''۔ (معارف السنن ص ۳/۷۶)

آگے معارف میں یہ بھی ہے کہ جلسۂ استراحت کا ثبوت حضور علیہ السلام سے بہت ہی کم ہوا ہے اور یہ کہ وہ آپ کی عادتِ مستمرہ عامہ نہ تھی جوہرنقی میں لکھا ہے کہ بخاری میں یہ بھی ہے کہ ایوب نے کہا کہ انہوں نے ایسی نماز پڑھائی کہ تم لوگ اس طرح نہیں پڑھتے وہ تو تیسری یا چوتھی رکعت پر بیٹھتے تھے (یہ حدیث بخاری ص ۱۱۳ باب المکث بین السجدتین میں گذر چکی ہے) اور طحاوی میں ہے کہ عمرو بن سلمہ ایسا کام کرتے ہیں جو تم نہیں کرتے، وہ سجدۂ اولیٰ و ثالثہ سے اٹھ کر جس رکعت میں قعدہ نہیں تھا بیٹھ کر پھر کھڑے ہوتے تھے، علامہ طحاوی نے فرمایا کہ قولِ ایوب سے معلوم ہوا کہ انہوں نے اور لوگوں کو ایسا کرتے نہیں دیکھا، حالانکہ انہوں نے اجلۂ تابعین کی ایک جماعت کو دیکھا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ یہ صورت (جلسۂ استراحت کی) سنتِ صلوٰۃ نہ تھی۔ الخ (معارف السنن ص ۳/۷۶)

علامہ مبارکپوری کا ریمارک

اوپر جو ریمارک ہم نے تحفۃ الاحوذی سے نقل کیا ہے، ایک محدث کی شان سے بہت بعید ہے، ان کو سوچنا چاہئے تھا کہ وہ کتنے بڑے حافظِ حدیث، علامۂ محقق کے بارے میں ایسی بات لکھ رہے ہیں، جس نے ہر مسئلہ میں نہایت انصاف سے اور صرف محدثانہ تحقیق پیش کی ہے، مقلدانہ نہیں۔ اور اگر تقلیدِ ائمہ ایسی ہی بری چیز ہے کہ اس کو اختیار کر کے ایک بڑے سے بڑا عالم بھی صرف ظنونِ فاسدہ کا مورد بن جاتا ہے، تو یہ ہزاروں ہزار بلکہ لاکھوں اکابرِ علماءِ امت محدثین وفقہا پر طعن ہے، جنہوں نے ائمہ اربعہ کی تقلید کی ہے اور رجال وحدیث کی کتابیں بھری پڑی ہیں، جن میں کسی کو حنفی کسی کو مالک، کسی کو حنبلی وشافعی بتایا گیا ہے، اور اس وقت جو سعودی حکومت کے اکابر واعیان ہیں۔ وہ بھی سب امام

احمدؒ کے مقلد ہیں، کیا وہ اس طعن و تشنیع سے بچ جائیں گے، جن کی مالی امداد سے تحفۃ الاحوذی وغیرہ عربی ٹائپ سے مزین ہو کر چھپ رہی ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ آئندہ ان سلفی حضرات کی کتابوں کی اشاعت کے لئے امداد کو ایسی مضر عبارتیں کتابوں میں سے نکال دینے کی شرط کرنی چاہئے، پھر صاحب تحفہ نے یہ بھی نہ سوچا کہ جن اکابر حنابلہ نے امام احمدؒ کے پہلے ہی قول و عمل کو ترجیح دی ہے، اور اسی کو اختیار بھی کیا ہے، اور خود ابن القیم نے بھی (جن کی ناقص عبارت نقل کر کے صاحب تحفہ نے اپنے ظن کی تائید دکھلائی ہے پوری تفصیل کر کے جلسۂ استراحت کو صرف ضرورت و عذر پر ہی محمول کر دیا ہے، کیا یہ سب حضرات بھی ظنونِ فاسدہ میں ہی مبتلا ہو گئے تھے؟! **بینوا توجروا.**

ہمارا جہاں تک علم ہے موجودہ علماء و اعیانِ سعودیہ بھی امام احمدؒ کے قولِ اول پر ہی عمل کرتے ہیں، سلفی حضرات کو چاہئے کہ ان کے بھی ظنونِ فاسدہ کی اصلاح کریں اور امام احمدؒ کے رجوع شدہ مسلک پر عمل کرائیں۔

صاحب مرعاۃ کا غیر معمولی تعصب اور درازلسانی

صاحبِ مرعاۃ کے استاذ محترم علامہ مبارک پوریؒ تو پھر بھی غنیمت تھے، ان کے تلمیذ نے اور بھی آگے قدم بڑھا دیا، شاید یہ سمجھا ہو کہ اسی ذریعہ سے حقیقت کو غیر مقبول بنانے کی مہم کامیاب ہو سکتی ہے۔ اور حکومتِ سعودیہ کی مزید سرپرستی اور امدادیں مل سکتی ہیں۔

آپ نے مرعاۃ شرح مشکوۃ ص ۱\۳۶۷ میں ابن عبدالبر کے حوالہ سے امام اعظمؒ کو سیئی الحفظ لکھا، حالانکہ یہ حوالہ قطعاً غلط ہے، ابن عبدالبر نے تو اس بات کو اہلِ حدیث کی طرف منسوب کیا ہے اور یہ بھی ساتھ ہی لکھ دیا ہے کہ اہلِ حدیث تو گویا اعداءِ امام ابوحنیفہ ہیں، (افسوس کہ اب وہ گویا کا پردہ بھی ختم ہو گیا ہے اور کھلی عداوت ہے)۔

ص ۱\۵۸۷ میں العرف الشذی ص ۱۴۵ کے حوالہ سے حضرت علامہ کشمیریؒ پر اعتراض کیا، مگر اس کے جواب کو نظر انداز کر دیا جو ص ۱۴۶ میں موجود ہے۔ ص ۱\۶۲۰ میں لکھا کہ "علامہ کشمیریؒ کی فصل الخطاب کا رد شیخ عبداللہ امرت سری کا ضرور پڑھنا چاہئے تاکہ حنفیہ کی تشغیبات اور ان کے مراوغاتِ جدلیہ وسائسِ خبیثہ واہیہ، اور تمویہاتِ باطلہ مزخرفہ منکشف ہوں"۔

ہم نے ابھی چند ورق پہلے مسئلہ فاتحہ خلف الامام کے لئے حضرتؒ اور دیگر اکابرِ امت کی تحقیقات ذکر کی ہیں، ان کو پڑھ کر انصاف کیا جائے کہ مذکورہ بالا درازلسانی اور دریدہ دہنی کا کیا جواز ہے؟!

مرعاۃ ص ۲\۳۹۹ میں "توسلِ نبوی" کے مجوزین کو "قبوریین" کے لقب سے نوازا۔ اور بار بار اسی لقب سے ان کو مطعون کر کے تنابز بالالقاب کا ارتکاب کیا ہے۔ جوازِ زیارت و توسل کی پوری بحث ہم نے انوار الباری جلد یازدہم میں ذکر کر دی ہے، اور سلفی حضرات کی تنبیہ کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ مسئلۂ توسل و زیارۃِ نبویہ میں ان کے مقتدا علامہ شوکانی بھی ان کے خلاف ہیں۔ (انوار ص ۱۱\۵۷) اور مسئلۂ زیارتِ نبویہ میں ان کے مقتدا ابنِ حزم ظاہری ہمارے ہمنوا ہیں وہ کہتے ہیں کہ "سفر کسی مسجد کی طرف تو علاوہ مساجد ثلاثہ کے حرام ہے، لیکن آثارِ انبیاء علیہم السلام کی طرف سفر مستحب ہے"۔ (الرد علی الاخنائی لابن تیمیہ۔ بحوالۂ ذب الذبابات ص ۲\۱۵۹) اس لئے اگر ہم سب مجوزینِ زیارت و توسل قبوری ہیں تو علامہ شوکانی اور ابن حزم ظاہری بھی قبوری ہیں۔ وللہ الحمد۔

بڑوں کا ادب واحترام

صاحب تحفہ و مؤلفِ مرعاۃ کی عبارتیں اس لئے بھی نقل کی گئی کہ ان کا ردیا اکابرِ امت کی تنقیص کا دکھلا کر اس سے اجتناب کی طرف توجہ دلائی جائے، ہمارے بڑے خواہ کسی بھی مسلک سے متعلق ہوں، ہمارے لئے ان سب کا ہی احترام ضروری ہے، کیونکہ انہوں نے دینِ قیم کی

گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہؒ تو تمام محدثینِ صحاح وغیرہم کے استاذ الاساتذہ کے درجہ میں ہیں، ہم نے مقدمہ انوار الباری میں اس کو ثابت کیا ہے اور علامہ ذہبی شافعی نے بھی لکھا کہ امام ابوحنیفہؒ سے محدثین وفقہاء کو اتنی بڑی تعداد نے حدیث کی روایت کی ہے کہ جن کا شمار نہیں ہوسکتا (مناقب ابی حنیفہ از ذہبی ص ۱۱ طبع مصر) اور حافظ جمال الدین مزیؒ نے تہذیب الکمال میں امام اعظم کے ترجمہ میں سے روایتِ حدیث کرنے والے پچانوے محدثینِ کبار کو نام بنام ذکر کیا ہے۔ احقر کے پاس ان کی نقل موجود ہے۔

محدثِ شہیر علامہ سیوطی شافعیؒ نے لکھا:۔ ''امام ابوحنیفہؒ کے ان خصوصی مناقب میں سے کہ جن میں وہ منفرد ہیں ایک یہ بھی ہے کہ وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے علمِ شریعت کو مدون کیا اور اس کی ابواب پر ترتیب کی پھر امام مالک بن انسؒ نے موطا کی ترتیب میں ان ہی کی پیروی کی، اور اس بارے میں امام ابوحنیفہ پر کسی کو سبقت حاصل نہیں'' (تبییض الصحیفہ فی مناقب الامام ابی حنیفہ ص ۳۶ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)۔

کتبِ تاریخ معتبرہ میں یہ بھی صراحت ہے کہ امام مالکؒ، امام ابوحنیفہ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے اور ان سے نفع اندوز ہوتے تھے، اور اس کے برعکس جو تذکرۃ الحفاظ ذہبی میں نقل ہوا (جس کی وجہ سے علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کو بھی مغالطہ ہوا) وہ غلط ہے۔ پوری تفصیل مولانا عبدالرشید نعمانی نے دے دی ہے (امام ابن ماجہ اور علم حدیث اردو ص ۱۶۱)۔

بہرحال! مقصدِ گزارش یہ ہے کہ اکابرِ امت کے واجب احترام کے خلاف کوئی بات چلانے کی مہم دین وعلم کے لئے سخت مضر ہے اور اس سے احتراز لازم ہے، واللہ الموفق۔

باب کیف یعتمد علی الارض اذاقام من الرکعة

۷۸۳: حدثنا معلی بن اسد قال حدثنا وهیب عن ایوب عن ابی قلابة قال جآء نامالک بن الحویرث فصلی بنافی مسجدنا هذا فقال انی لاصلی بکم وما ارید الصلوٰة لکنی ارید ان اریکم کیف رایت رسول الله صلی الله علیه وسلم یصلی قال ایوب فقلت لابی قلابة و کیف کانت صلوٰته قال مثل صلوٰة شیخنا هذا یعنی عمر بن سلمة قال ایوب و کان ذٰلک الشیخ یتم التکبیر فاذا رفع راسه' عن السجدة الثانیة جلس و اعتمد علی الارض ثم قام

ترجمہ: ابوقلابہ بیان کرتے ہیں کہ مالک بن حویرث ہمارے پاس آئے، اور ہماری مسجد میں ہمیں نماز پڑھائی، اور انہوں نے یہ کہہ دیا کہ میں تمہیں نماز پڑھاتا ہوں، لیکن میں نماز پڑھنا نہیں چاہتا، بلکہ میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کس طرح نماز پڑھتے دیکھا، ایوب کہتے ہیں کہ میں نے ابوقلابہ سے کہا، کہ مالک بن حویرث کی نماز کیسی تھی، وہ بولے، کہ ہمارے ان شیخ یعنی عمرو بن سلمہ کی نماز کی طرح ایوب کہتے ہیں، کہ وہ شیخ پوری تکبیر کہتے تھے، اور جب اپنا سر اپنے سجدے سے اٹھاتے تھے تو بیٹھ جاتے تھے، اور زمین پر ٹک جاتے تھے، اس کے بعد کھڑے ہوتے تھے۔

تشریح: حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس باب پر لکھا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک زمین پر ٹیک لگا کر اٹھنا سنت ہے، حنفیہ کے نزدیک یہ سنت نہیں ہے، معارف السنن ص ۲۷/۳۶ میں یہ تفصیل ہے کہ اعتماد کی دو قسم ہیں، ایک تو سجدہ کے اندر کہنیوں کو گھٹنوں یا رانوں پر رکھنا، جو امام ترمذی نے باب الاعتماد فی السجود میں مراد لیا ہے، دوسری یہ ہے کہ دوسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے کو دونوں ہاتھ زمین پر رکھ کر اٹھے، جو شافعیہ کے یہاں سنت ہے، علامہ نووی نے شرح المہذب ص ۳/۴۴۲ میں لکھا کہ ہمارے اصحاب کے نزدیک سجدہ یا جلسہ اور تشہد اولی سے اٹھنے کے وقت مسنون یہ ہے کہ دونوں ہاتھ زمین پر ٹیک کر کھڑا ہو۔ اس میں قوی وضعیف اور مرد وعورت برابر ہیں۔ پھر ص ۳/۴۴۴ میں لکھا کہ ''یہی مذہب امام مالک واحمد کا بھی ہے''۔

علامہ بنوریؒ نے لکھا کہ یہ صرف امام شافعی و مالک کا مذہب ہے، اور امام احمدؒ کا مذہب وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کا ہے، (کمانی المغنی ص ۱\۵۷۲ والشرح الکبیر ص ۱\۵۷۱) بلکہ حافظ ابن عبد البر مالکی نے "التمہید" میں امام مالک کا مذہب بھی امام صاحب کی طرح نقل کیا ہے، جبکہ وہ اس کے زیادہ جاننے والے ہیں، (عمدہ ص ۳\۱۶۳) اور ایسا ہی قواعد ابن رشد میں بھی ہے۔

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ مجھے شافعیہ کے قولِ سنیت کے لئے کوئی دلیل نہیں ملی۔ البتہ امام بخاری بیہقی و نووی نے مالک بن الحویرثؓ کی حدیث پیش کی ہے، جس کا جواب ابن قدامہ حنبلی اور علامہ عینی حنفی وغیرہ نے یہ دیا کہ یہ حضور علیہ السلام کی کبر سنی اور مشقتِ قیام کے سبب سے ہوا ہے، کیونکہ حضور علیہ السلام نے خود بھی فرمایا تھا کہ اب میرا بدن بھاری ہو گیا ہے لہٰذا رکوع و سجود کے وقت مجھ سے سبقت نہ کرو۔ اور امام صاحب و امام احمد کے لئے نسائی شریف وغیرہ کی حدیث وائل حجت ہے، جس میں گھٹنوں سے پہلے دونوں ہاتھ اٹھانے کا ذکر ہے، اور ایک ہی گھٹنوں کے بل پر اٹھنے کا ذکر ہے، اور ابوداؤد میں حدیثِ ابن عمرؓ بھی ہے، جس میں رسولِ اکرم ﷺ نے نماز میں اٹھنے کے وقت ہاتھوں پر ٹیک لگا کر اٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے، اور ترمذی میں ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے کہ حضور علیہ السلام پاؤں کے سروں پر زور دے کر اٹھتے تھے، لہٰذا ہمارے نزدیک گھٹنوں پر ہی اعتماد کر کے اٹھنا مسنون ہے، اور یہی مذہب امام احمد، امام مالک، اوزاعی ثوری و اسحق بن راہویہ (شیخ البخاری) کا بھی ہے، اور حضرت ابن مسعود، ابن عمر و ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے، نعمان بن ابی عیاش نے یہ بھی بتلایا کہ میں نے بہت سے اصحابِ رسول اکرم ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔ ابوداؤد نے بھی مختار حنفیہ ہی کی تائید کی ہے، کیونکہ انہوں نے نماز کے اندر ہاتھوں پر ٹیک لگانے کی کراہت پر مستقل باب قائم کیا ہے، جس کے تحت مذکورہ بالا حدیثِ حضرت ابن عمرؓ کو مرفوعاً و موقوفاً روایت کیا ہے واللہ اعلم۔

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے لکھا: علامہ موفق نے امام احمد سے جلسۂ استراحت کے بارے میں دو قول ذکر کر کے لکھا کہ دونوں روایت پر کھڑے ہونے کی صورت پاؤں کے سروں پر ہی اور گھٹنوں پر اعتماد کر کے اٹھنا متعین ہے، قاضی نے کہا کہ امام احمد سے اس کے بارے میں دوسرا قول نہیں کہ زمین پر اعتماد (ٹیک) نہ کرے گا، خواہ جلسۂ استراحت کے لئے بیٹھے یا نہ بیٹھے۔ (الابواب والتراجم ص ۲\۲۹۹)

حافظ نے علامہ ابن رشید سے اعتماد علی الارض کا مطلب تمکن کے ساتھ بیٹھنا لیا ہے، جو یکدم کھڑے ہونے کے مقابل ہے، لہٰذا ان کے نزدیک بخاری نے بابِ سابق کے ترجمہ میں مشروعیت کے لئے اشارہ کیا تھا۔ جلسۂ استراحت کی، اور یہاں اس کا طریقہ بتلایا کہ تمکن کے ساتھ ہو، اس کو ذکر کر کے حافظ نے پھر بھی ہاتھوں کو ٹیک کر ہی اٹھنے کی بات اپنے مذہب کی نکالنے کی سعی کی ہے اور حضرت ابن عمرؓ کا فعل بھی عبد الرزاق کی روایت سے پیش کیا ہے۔ (فتح ص ۲\۲۰۵)

ہم بتلا چکے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے بھی یہ صورت اپنے بدن کے بھاری ہونے اور عذر کی وجہ سے اختیار کی تھی، اس لئے اسی کو بار بار پیش کرنا بے سود ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

اجتہادِ حضرت ابنِ عمرؓ اور افادۂ انور

آپ نے فرمایا: ابوداؤد باب کراهة الاعتماد على اليد في الصلوة میں جو حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے وہ ہماری مؤید ہے، کہ ہم حالتِ قعود و نہوض میں ہاتھوں کو گھٹنوں پر ٹیکتے ہیں اور شافعیہ ان کو زمین پر ٹیکتے ہیں، وہ حضرت ابن عمرؓ کے فعل سے تائید لیتے ہیں، میرے نزدیک وہ ان کا اپنا اجتہاد تھا، جس کے مطابق وہ عمل کرتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ سجدے کو جاتے ہوئے یہی ہونا چاہئے کہ ہاتھوں کو سجدے میں سیدھے لے جائیں اور گھٹنوں پر ٹیک کر لے جانے کو تجویدین کا انقطاع و نقص خیال کرتے تھے، اور پھر اسی طرح سجدے سے اٹھتے ہوئے بھی بغیر گھٹنوں پر ٹیکنے کے سیدھے اوپر لانے کو بہتر خیال کرتے تھے تا کہ دونوں صورتیں ایک طرح سے ادا ہوں۔ لیکن جب بوڑھے ہو گئے اور بدن

بھی بھاری ہوگیا تو بغیر گھٹنوں پر ہاتھ ٹیکنے کے مشقت ودشواری پیش آئی، اس لئے ہاتھوں کو زمین پر رکھنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اور ایسا پیش آجایا کرتا ہے کہ جب ایک جانب کو بطور اصل کے مان لیا جاتا ہے تو فروع میں بھی اس کو چلانے کی سعی کی جاتی ہے، اور میرے نزدیک یہی معنی ہیں اجتہاد کے، کبھی ایک جزئی پر بہت کلیات صادق ہوسکتی ہیں اور اسی طرح ایک جزئی بہت سے قواعد وضوابط میں داخل ہوسکتی ہے، لہٰذا اس میں نظر کرنا ہی اجتہاد ہے کہ کون سی جزئی کس قاعدہ سے اقرب ہے تاکہ اس پر اس کا حکم جاری کردیں۔ یہ وظیفہ صرف مجتہد کا ہے، دوسرا جس میں شرائطِ اجتہاد پوری نہ ہوں، اس میں غلطی کرتا ہے۔ اگرچہ غلطی مجتہد سے بھی ہو جاتی ہے، معصوم وہ بھی نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا میرے نزدیک اعتماد والی صورت میں بھی ایسی ہی شکل ہوئی ہے۔ اور میرے نزدیک وہ سنتِ نبویہ سے ثابت نہیں ہے واللہ تعالیٰ اعلم۔

قوله واعتمد على الارض

حضرتؒ نے فرمایا یہ عمرو بن سلمہ کا فعل ذکر ہوا اور مجھے پورے ذخیرۂ حدیث میں یہ نہیں ملا، بلکہ اس میں صرف **استعينوا بالركب** یا **امسوا بالركب** ہے، اور امام ترمذی نے اس پر الاعتماد فی السجود کا باب باندھا ہے، اور اس میں لفظ سجود کا اپنی طرف سے بڑھادیا ہے اور حافظ علاؤالدین مغلطائے کی ''تلویح'' میں ترمذی کے نسخہ سے باب **ما جاء في الاعتماد اذا قام من السجود** نقل ہوا ہے۔

غرض یہ کہ ترمذی کے باب مذکور کے تحت حدیث **استعينوا بالركب** مروی ہے، جو عام ہے، اس میں صفتِ رکوع اور صفتِ قیام **الى الركعة من السجود** سب ہی شامل ہیں اور سب ہی حالتوں کے لئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھنے کا حکم وارد ہے، لہٰذا اس کو صرف حالتِ سجود کے لئے خاص کیوں کر کر سکتے ہیں؟ البتہ یہ بات نکل سکتی ہے کہ جو کسی عذر سے گھٹنوں کی استعانت سے کام نہ چلا سکے، وہ مجبوری میں ہاتھوں کو ٹیک کر بھی اٹھ سکتا ہے لہٰذا اس کو مسنون ومستحب قرار دینے کے لئے ذخیرۂ حدیث میں کوئی صراحت نہیں ملتی واللہ تعالیٰ اعلم۔

علامہ عینیؒ نے علامہ کرمانی شافعی شارحِ بخاری کا قول نقل کیا کہ فقہاء (شافعیہ) نے کہا کہ جس طرح خمیر کے لئے آٹا گوندھنے والا بیٹھتا ہے، اس طرح بیٹھے، یا ہاتھوں پر ٹیک لگا کر سجدہ سے اٹھے، جس طرح حضرت ابن عمرؓ کرتے تھے، (عمدہ ص۱۶۳\۳) معلوم نہیں فقہاءِ شافعیہ نے یہ ہیئت مذکورہ عاجن والی کہاں سے استنباط کی؟ حاشیۂ بخاری ص۱۱۴ میں عاجن غلط چھپ گیا ہے۔

باب يكبر وهو ينهض من السجدتين

وكان ابن الزبير يكبر فى نهضته

۷۸۴: حدثنا يحيى بن صالح قال حدثنا فليح بن سليمان عن سعيد ابن الحارث قال صلے لنا ابوسعيد فجهر بالتكبير حين رفع راسه' من السجود وحين سجدوحين رفع و حين قام من الركعتين وقال هكذارايت النبى صلے الله عليه وسلم

۷۸۵: حدثنا سليمان بن حرب قال حدثنا حماد بن زيد قال حدثنا غيلان بن جرير عن مطرف قال صليت انا عمران بن الحصين صلوٰة خلف عليٰ بن ابى طالب فكان اذا سجد كبرواذا رفع كبرواذا نهض من الركعتين كبرفلما سلم اخذعمران بيدى فقال لقد صلى بناهٰذا صلوٰة محمد صلے الله عليه وسلم اوقال لقدذكرنى هٰذا صلوٰة محمد صلے الله عليه وسلم

ترجمہ۷۸۴: سعید بن حارث کہتے ہیں کہ ہمیں ابوسعید نے نماز پڑھائی تو جس وقت انہوں نے اپنا سر (پہلے) سجدہ سے اٹھایا اور جب

سجدہ کیا۔ اور جب انہوں نے (دوسرے سجدے سے) سر اٹھایا، اور جب دو رکعتوں سے (فراغت کر کے) اٹھے تو بلند آواز سے تکبیر کہی اور کہا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

ترجمہ ۷۸۵: مطرف روایت کرتے ہیں کہ میں نے اور عمران بن حصین نے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے پیچھے ایک مرتبہ نماز پڑھی، تو (ہم نے ان کو دیکھا کہ) جب وہ سجدہ کرتے تھے، تکبیر کہتے تھے، اور جب دو رکعتوں سے اٹھتے تھے، تکبیر کہتے تھے، سلام پھیرنے کے بعد عمران نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ اس شخص نے ہمیں سیدنا محمد ﷺ کی سی نماز پڑھائی یا یہ کہا، کہ اس شخص نے سیدنا محمد ﷺ کی نماز یاد دلا دی۔

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ۔ شارع علیہ السلام کا منشا یہ ہے کہ جب نماز میں ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہو تو اس پوری انتقالی حالت کو ذکرِ خداوندی سے معمور و مبروک کرے، لہٰذا امام بخاری نے اس باب میں ثابت کیا کہ سجدوں سے اٹھنے کے ساتھ ہی تکبیر شروع کر دے، اور راوی کے تکبیر جہر سے کہنے کا بھی ذکر ہوا، تا کہ بنی امیہ کے دور میں جو تکبیرات کم کر دی گئی تھیں، ان کی طرف بھی تعریض ہو جائے۔ اور امام بخاری نے شاید مالکیہ پر بھی تعریض کی ہے جو کہتے ہیں کہ سجدوں سے اٹھنے کے وقت ساتھ ہی تکبیر نہیں ہے بلکہ جب سیدھا کھڑا ہو جائے گا جب تکبیر کہے، تا کہ پہلی رکعت کی تکبیر کی طرح ہو جائے کہ اس میں بھی پہلی تکبیر کھڑے ہو کر کہی تھی، حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس سے دونوں رکعتوں کا باہم تناسب و تشاکل تو ضرور پایا جائے گا، مگر امور شرعیہ کے اندر فقط تناسب و تشاکل پر مدار مناسب نہیں، بلکہ اس کے لئے سلف کا تعامل و اختیار رکھنا چاہئے۔

باب سنة الجلوس فی التشهد و كانت ام الدردآء تجلس فی صلٰوتها جلسة الرجل و كانت فقيهةً

(تشہد کے لئے بیٹھنے کا طریقہ' ام درداء اپنی نماز میں مرد کی طرح بیٹھتی تھیں' اور فقیہہ تھیں)

۷۸۶: حدثنا عبدالله بن مسلمة عن مالک عن عبدالرحمٰن ابن القاسم عن عبدالله بن عبدالله انه' اخبره' انه' كان يرٰى عبدالله بن عمر يتربع فی الصلوٰة اذا جلس نفعلته' وانا يومئذ حديث السن فنهانی عبدالله بن عمرو قال انما سنة الصلوٰة ان تنصب رجلک اليمنىٰ وتثنی اليسرٰى فقلت انک تفعل ذٰلک فقال ان رجلای لاتحملانی

۷۸۷: حدثنا يحيی بن بكير قال حدثنا الليث عن خالدعن سعيد عن محمد بن عمرو بن حلحلة عن محمد بن عمرو بن عطآء ح قال وحدثنی الليث عن يزيد بن ابی حبيب ويزيد بن محمد عن محمد بن عمرو بن حلحلة عن محمد بن عمرو بن عطآء انه' كان جالساً مع نفر من اصحاب النبی صلے الله عليه وسلم فذكرنا صلوٰة النبی صلے الله عليه وسلم فقال ابوحميد ن الساعدی انا كنت احفظكم لصلوٰة رسول الله صلے الله عليه وسلم رايته' اذا كبر جعل يديه حذو منكبيه واذا ركع امكن يديه من ركبتيه ثم هصر ظهره' فاذا رفع راسه استوٰى حتىٰ يعود كل فقار مكانه' واذا سجد وضع يديه غير مفترش ولا قابضهما واستقبل باطراف اصابع رجليه القبلة فاذا جلس فی الركعتين جلس علىٰ رجله اليسرٰى و نصب اليمنىٰ فاذا جلس فی الركعة الأخرة قدم رجله اليسرىٰ و نصب الاخرٰى وقعد علىٰ مقعدته وسمع الليث يزيد بن ابی حبيب ويزيد من محمد بن حلحلة وابن حلحلة من ابن عطآء وقال ابوصالح

عن اللیث کل فقار مکانہ' وقال ابن المبارک عن یحییٰ بن ایوب قال حدثنی یزید بن ابی حبیب ان محمد بن عمرو بن حلحلۃ حدثہ' کل فقارۃ

ترجمہ۷۸۶: حضرت عبداللہ بن عمر کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں کہ وہ عبداللہ بن عمر کو دیکھتے تھے کہ جب وہ نماز میں بیٹھتے تھے، تو چارزانو بیٹھتے تھے، لہٰذا میں نے بھی ایسا ہی کیا، اور میں اس زمانے میں کم سن تھا، تو مجھے عبداللہ بن عمر نے منع کیا اور کہا کہ نماز کا طریقہ تو یہی ہے، کہ تم اپنا داہنا پیر کھڑا کرو، اور بایاں دوہرا کرلو، میں نے کہا آپ جو ایسا کرتے ہیں، بولے، کہ میرے پیر (کمزور ہوگئے ہیں) میرا بار برداشت نہیں کرسکتے۔

ترجمہ۷۸۷: محمد بن عمرو بن عطاء روایت کرتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے چند اصحاب کے پاس بیٹھا ہوا تھا، تو ہم لوگوں نے نبی کریم ﷺ کی نماز کا ذکر کیا، ابوحمید ساعدی بولے کہ مجھے تو سب سے زیادہ رسول خدا ﷺ کی نماز یاد ہے، میں نے آپ کو دیکھا کہ جب آپ نے تکبیر (تحریمہ) پڑھی تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں شانوں کے مقابل تک اٹھائے، اور جب آپ نے رکوع کیا، تو اپنے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر جمائے، اپنی پیٹھ کو جھکا دیا جس وقت آپ نے اپنا سر (رکوع سے) اٹھایا، تو اس حد تک سیدھے ہوگئے کہ ہر ایک عضو (کا جوڑ) اپنے اپنے مقام پر پہنچ گیا اور جب آپ نے سجدہ کیا تو دونوں ہاتھ اپنے زمین پر رکھ دیے، نہ ان کو بچھائے ہوئے تھے، اور نہ سمیٹے ہوئے تھے اور پیر کی انگلیاں آپ نے قبلہ رخ کرلی تھیں، پھر جس وقت آپ دو رکعتوں میں بیٹھے تو اپنے بائیں پیر پر بیٹھے، اور داہنے پیر کو آپ نے کھڑا کرلیا۔ جب آخری رکعت میں بیٹھے تو آپ نے اپنے بائیں پیر کو آگے کر دیا اور دوسرے پیر کو کھڑا کرلیا، اور اپنی نشست گاہ کے بل بیٹھ گئے۔ اور لیث نے یزید بن ابی حبیب سے، اور یزید نے محمد بن حلحلہ سے، اور ابن حلحلہ نے عطاء سے سنا ہے۔ اور ابوصالح نے لیث سے کل فقار مکانہ' نقل کیا ہے اور ابن مبارک نے یحییٰ بن ایوب سے روایت کیا، کہ مجھ سے یزید بن ابی حبیب نے بیان کیا، ان سے محمد بن عمرو بن حلحلہ نے کل فقارۃ کے لفظ کے ساتھ روایت کیا۔

تشریح: اس باب میں امام بخاریؒ نماز میں بیٹھنے کا مسنون طریقہ بتلانا چاہتے ہیں، اور عنوان میں ام الدرداء کا اثر بھی ذکر کیا جس سے ثابت کیا کہ عورتیں بھی مردوں کی طرح بیٹھیں گی، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ امام بخاری اسی کو صحیح سمجھتے ہوں گے، مگر اس دعوے کے لئے کوئی حدیث نہیں پیش کرسکے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ ہمارے نزدیک ان دونوں میں فرق ہے، مرد کے لئے افتراش ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا کر کے بائیں کو بچھائے گا اور اس پر بیٹھے گا، عورت کے لئے تورک ہے کہ اپنے دونوں پاؤں دائیں طرف نکال کر بائیں ران و سرین زمین پر رکھ کر بیٹھے گی، اور یہی اس کے لئے زیادہ ستر والی صورت بھی ہے، اس کے لئے ہمارے پاس مراسیل ابی داؤد میں ایک مرسل حدیث بھی ہے، امام احمدؒ نے فرمایا کہ عورت رکوع و سجدے کے وقت اپنے دونوں ہاتھ نہ اٹھائے، اس سے بھی معلوم ہوا کہ مرد اور عورت کی نمازوں میں طرق ادا کا فرق ہے، ہم نے انوارالباری میں پہلے اس فرق کی طرف اشارہ کیا ہے۔

امام بخاری اور آثارِ صحابہ کی حجیت

اول تو ام الدرداء دو ہیں، ایک صحابیہ ہیں، دوسری تابعیہ، اور یہاں اختلاف ہوا کہ کونسی مراد ہیں۔ اگر صحابیہ بھی ہوں تو امام بخاری کے نزدیک آثار صحابہ حجت نہیں ہیں، پھر ان کے اثر سے استدلال کیوں کیا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اپنا مختار و پسندیدہ مسلک ثابت کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کسی صحابی یا تابعی کے اثر سے بھی حجت پکڑ لی جائے، اور وہ خلاف ہوں تو نظر انداز کر دیے جائیں۔

یاد ہوگا کہ کتاب العلم میں امام بخاری نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے مکتوب گرامی کا ذکر کر کے اپنی طرف سے یہ عبارت بڑھا دی تھی کہ

حدیثِ نبوی کے سوا اور کچھ قبول نہ کیا جائے، اس پر ہم نے متنبہ بھی کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ امام مالکؒ نے فرمایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے قاضی ابوبکر بن حزم کو یہ بھی لکھا تھا کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن اور قاسم بن محمد کے پاس جو علم موجود ہے، اس کو لکھ کر ان کے لئے بھیج دیں۔ (تہذیب ترجمہ ابوبکر حزمی)

علامہ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء میں امام زہری سے نقل کیا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سالم بن عبداللہ کو لکھا تھا کہ صدقات کے بارے میں حضرت عمرؓ کا جو معمول رہا ہے وہ ان کو لکھ کر بھیجیں، اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ گذشتہ سنت اور طریقوں کا زہری سے بڑھ کر کوئی عالم باقی نہیں رہا، (تذکرۃ الحفاظ ترجمہ امام زہری) حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الانصاف اور حجۃ اللہ میں لکھا کہ دور اول کے علماء کا طرز عمل ایک دوسرے سے ملتا جلتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی حدیث سے خواہ وہ مرسل ہو یا مسند دونوں سے استدلال کیا جائے۔ نیز صحابہ و تابعین کے اقوال سے بھی استدلال کیا جائے کیونکہ ان کے علم میں یہ اقوال یا تو خود آں حضرت ﷺ کی ہی احادیثِ منقولہ تھیں جن کو انہوں نے مختصر کر کے موقوف بنا لیا تھا، اور بہت سے حضرات مثلاً ابراہیم نخعی اور شعبی وغیرہ تو احادیثِ مرفوعہ کو بھی بطور موقوفہ ہی نقل کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم کو یہ زیادہ محبوب ہے کہ پیغمبر ﷺ کے بعد کے کسی شخص سے ان کو نقل کریں تا کہ روایت میں کچھ کمی بیشی ہو تو وہ بعد کے شخص پر ہی رہے، اور جب کسی مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کی احادیث مختلف ہوتیں، تب بھی اقوالِ صحابہ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اور جب صحابہ و تابعین کے مذاہب بھی کسی مسئلہ میں مختلف ہوتے تو ہر عالم کے نزدیک اپنے شہر کے عمائد اور اپنے اساتذہ کا مذہب پسندیدہ ہوتا تھا۔ (مزید بحث و تفصیل علامہ نعمانی دام فضلہم کی تالیفِ قیم "امام ابن ماجہ اور علم حدیث" اردو میں دیکھی جائے)۔

غرض یہ کہ متقدمین میں سے امام بخاری نے اس بارے میں بھی اپنی راہ الگ ہی بنائی تھی کہ وہ آثار صحابہ و تابعین کو حجت نہ سمجھتے تھے، اور اسی لئے مجرد صحیح کا مجموعہ صحیح بخاری کو قرار دیا۔ لیکن جیسا کہ اس باب زیر بحث میں ہے خود امام بخاریؒ نے حدیثِ مرسل ابی داؤد کے مقابلہ میں ایک صحابیہ یا تابعیہ کے اثر سے استدلال کر لیا ہے، اور دوسرے مواضع میں بھی جب اپنے مسلک کی تائید کے لئے ضرورت سمجھتے ہیں تو ترجمۃ الباب کے اندر اقوال و آثار صحابہ کو لاتے ہیں اور رسالہ رفع یدین و قراءۃ خلف الامام میں تو بڑا حصہ آثار ہی کا ہے۔

برخلاف اس کے امام اعظمؒ کی کتاب الآثار میں جو حسب اعتراف علامہ سیوطیؒ سب سے پہلی اثری تالیف ہے اور ان کے مسانید میں بھی احادیثِ مرفوعہ کے ساتھ آثار صحابہ بھی مذکور ہیں اور ان ہی کا اتباع امام مالک نے بھی کیا کہ موطأ میں احادیث کے ساتھ اقوال صحابہ و فتاوی تابعین و تبع تابعین بھی موجود ہیں۔

عورت کا جلوس وغیرہ مرد کی طرح نہیں ہے

ابن جریج کا بیان ہے کہ میں نے عطا سے پوچھا کیا عورت بھی مرد کی طرح تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھائیگی؟ کہا نہیں وہ مرد کی طرح ہاتھ نہ اٹھائے گی، پھر اپنے دونوں ہاتھ بہت پست کر کے اور اپنے بدن سے خوب ملا کر اشارہ سے بتلایا کہ اس طرح کرے گی، اور فرمایا کہ عورت کی نماز کا طریقہ مرد کی طرح نہیں ہے۔ (باب الی این ترفع یدیہا مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱/۲۳۹)

دوسری روایت میں عطاء نے فرمایا کہ عورت صرف اپنے سینہ تک ہاتھ اٹھائے گی۔ حضرت حماد سے بھی ایسا ہی منقول ہے، حضرت حفصہ بنت سیرین سے نقل ہوا کہ عورت تکبیر کے وقت اپنی چھاتی تک ہاتھ اٹھائے، البتہ ام الدرداء سے نقل ہوا کہ نماز شروع کرتے وقت وہ اپنے مونڈھوں تک ہاتھ اٹھاتی تھیں۔ (مصنف =) پھر محدث ابن ابی شیبہ نے ایک باب فی المرأۃ کیف تکون فی سجودہا باندھا اور حضرت علیؓ سے نقل کیا کہ عورت جب سجدہ کرے تو سمٹ جائے اور اپنی رانوں کو پیٹ سے ملا لے)۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ عورت اکٹھی ہو کر اور سمٹ کر نماز پڑھے، حضرت مجاہد مرد کے لئے عورت کی طرح پیٹ سے رانوں کو

ملا کر سجدہ کو مکروہ سمجھتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ عورت سجدے کے وقت اپنے پیٹ کو رانوں سے ملالے اور سرین نہ اٹھائے، اور نہ مرد کی طرح اعضاء جسم کو الگ الگ کرے۔ (مصنف ص۱\۲۶۹) پھر باب المراۃ کیف تجلس فی الصلوٰۃ قائم کیا جس میں حضرت خالد سے نقل کیا کہ نماز میں عورتوں کو چارزانو بیٹھنے کا حکم ہوا تھا اور یہ بھی کہ وہ مردوں کی طرح سرینوں پر نہ بیٹھیں۔ حضرت نافع سے نقل ہوا کہ حضرت ابن عمرؓ کے گھر کی عورتیں نماز میں چارزانو بیٹھتی تھیں۔ ابراہیم نے کہا کہ عورت نماز میں ایک جانب پر بیٹھے، بعض حضرات نے کہا کہ جس طرح چاہے بیٹھے مگر سمٹ کر اکٹھی ہو کر بیٹھے۔ (= ص۱\۲۷۰)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ عورت کی نماز میں کئی طریقوں پر فرق ہے، اور بیٹھنا بھی مرد کی طرح نہیں ہے اور مراسیلِ ابی داؤد کی تو مرسل حدیث بھی یہی بتلا رہی ہے، پھر اس سب کے خلاف ام الدرداء کے فعل سے استدلال کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟! مگر امام بخاری کی عادت ہے کہ اپنے مختار کے خلاف احادیث و آثار کو نہ ذکر کرتے ہیں نہ ان کا اثر لیتے ہیں۔

اس کے بعد امام بخاری نے جو دو حدیث روایت کی ہیں، ان میں سے ایک سے تو حضرت ابن عمرؓ کا فعل تربع فی الصلوٰۃ کا ثابت ہوا جس کو خود انہوں نے ہی عذر پر محمول کر دیا، پھر جو سنتِ صلوٰۃ بتلائی وہ افتراش اور تورک دونوں پر محمول ہو سکتی ہے کیونکہ بائیں پاؤں کا موڑنا پھیرنا یا بچھانا دونوں میں ہوتا ہے، فرق یہ ہے کہ افتراش کی صورت میں اسی پاؤں پر بیٹھتے ہیں اور تورک میں زمین پر بیٹھتے ہیں، اور حضرت ابن عمرؓ سے ہی نسائی شریف میں یہ تفصیل ہے کہ سنتِ صلوٰۃ یہ ہے کہ داہنا پاؤں کھڑا کر کے اس کی انگلیوں کو قبلہ رخ کیا جائے اور بائیں پاؤں پر بیٹھا جائے۔ اور دوسری حدیثِ بخاری میں پہلا تشہد تو اسی طرح ہے، البتہ دوسرا تورک والا ہے۔ حدیثِ مرفوع قولی یہ بھی نہیں ہے، صرف ابوحمید ساعدی کا بیان ہے کہ حضور علیہ السلام کی نماز اسی طرح تھی۔ امام شافعیؒ کا یہی مسلک ہے اور بظاہر امام بخاری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔

تفصیل مذاہب: اوجز ص۱\۲۵۴ میں اس طرح ہے:۔ حنفیہ کے یہاں افتراش مسنون ہے، امام ترمذی نے لکھا کہ یہی قول ثوری ابن مبارک اور اہلِ کوفہ کا ہے اور اسی پر اکثر اہلِ علم کا عمل ہے۔ حنفیہ کے نزدیک یہ افتراش مردوں کے لئے ہے اور ہر جلسہ کے لئے ہے خواہ وہ سجدوں کے درمیان کا ہو یا تشہدِ اول یا ثانی کے لئے ہو، اور عورتوں کے لئے ہر جلسہ میں تورک مسنون ہے، مالکیہ کے نزدیک ہر جلسہ کے لئے تورک ہے اور مرد و عورت کا بھی کوئی فرق اس بارے میں نہیں ہے۔ البتہ بعض مالکیہ نے دونوں تشہد کے جلسوں میں حنفیہ کی طرح مردوں کے لئے افتراش کو اختیار کیا ہے۔ حنابلہ کے یہاں تورک صرف دوسرے تشہد میں ہے، باقی میں حنفیہ کی طرح افتراش ہے۔ شافعیہ کے نزدیک تمام جلسوں میں حنفیہ کی طرح افتراش ہے، صرف آخری تشہد میں تورک ہے، یعنی نمازِ صبح و جمعہ کے جلسۂ تشہد میں مثلاً ان کے یہاں تورک ہو گا کیونکہ وہ آخری ہے اور حنابلہ کے یہاں چونکہ وہ دوسرا نہیں ہے، اس لئے وہ افتراش کے قائل ہیں۔

حنفیہ کے دلائل: (۱) مسلم شریف کی روایتِ حضرت عائشہؓ کہ حضور علیہ السلام داہنا پاؤں کھڑا کر کے بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھتے تھے (۲) طحاوی سنن سعید بن منصور، ابوداؤد، نسائی، ترمذی و ابن ماجہ میں وائل بن حجر سے بھی ایسی روایت ہے، (۳) نسائی میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ سنتِ صلوٰۃ داہنا پاؤں کھڑا کر کے اس کی انگلیاں قبلہ رخ کرنا اور بائیں پاؤں پر بیٹھنا ہے (۴) ابوداؤد و مسندِ احمد میں حدیثِ رفاعہ سے بھی یہی طریقہ حضور علیہ السلام سے روایت کیا گیا، اور اس پر علامہ شوکانی نے لکھا کہ "اس حدیث کی سند میں کوئی کلام نہیں ہے، اور اس کو محدث ابن ابی شیبہ و ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے، پھر لکھا کہ ان روایات سے استدلال اس طرح ہے کہ ان میں ایک ہی طریقہ تشہد میں بیٹھنے کا ذکر ہوا ہے اور کسی نے اس کو تشہد اول کے ساتھ خاص نہیں بتلایا، اس سے معلوم ہوا کہ یہی صورت دونوں تشہد کے لئے مسنون ہے، اگر وہ صرف اول کے لئے ہوتی اور دوسرے کے لئے نہ ہوتی تو اس کے ذکر و تفصیل کو وہ ترک نہ کرتے، کیونکہ وہ تو حضور علیہ السلام کی نماز کی پوری ہیئت و صورت بیان کر رہے تھے، لہٰذا یہی ثابت ہوتا ہے کہ تشہد میں بیٹھنے کا بیان کردہ طریقہ صرف اول کے لئے نہیں

بلکہ دونوں ہی کے لئے تھا"۔ (کذا فی النیل)

اعلاء السنن ص۳\۱۰۳ میں نیل الاوطار شوکانی سے یہ بھی نقل ہوا کہ انہوں نے لکھا: خاص طور سے حضرت عائشہؓ والی حدیث سامنے رکھی جائے کہ اس میں ہر دو رکعت کے جلوس اور اس کے تحیہ کا بیان ہوا ہے اور اس کے بعد جلوس کی ہیئت ذکر کی ہے، لہٰذا یہ مستبعد ہے کہ جو طریقہ آخر میں بیان ہوا ہے وہ صرف ایک جلسہ تشہد کے لئے مانا جائے اور یہ خیال کیا جائے کہ انہوں نے دوسرے کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ (نیل ص۲\۱۲۸)

صاحب اعلاء السنن نے دوسروں کی مستدل احادیث پر بھی سند و متن کے لحاظ سے سیر حاصل کلام کیا ہے وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے۔

(۵) اعلاء السنن ص۳\۱۰۲ میں مستدرک حاکم اور سنن بیہقی کی یہ حدیث بھی استدلال میں ذکر کی گئی ہے کہ حضور علیہ السلام نے نماز کے اندر اقعاء اور تورک سے منع فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوا کہ مردوں کے لئے تورک فی الصلوٰۃ مکروہ ہے اور دونوں تشہد کے جلسوں میں کوئی فرق اس بارے میں نہیں ہے۔ کیونکہ نماز کا لفظ عام ہے۔ لہٰذا جس طرح اقعاء (کتے کی طرح بیٹھنا) نماز میں سب کے نزدیک مکروہ ہے، اسی طرح تورک بھی مردوں کے لئے مکروہ ہونا چاہئے اور جس حدیث سے تورک ثابت ہوا اس کو عذر پر محمول کرنا چاہئے، کیونکہ جب ممانعت و اباحت دونوں ایک ہی چیز کے لئے وارد ہوں تو ممانعت کو ترجیح ہوا کرتی ہے، اور اباحت کو کسی ضرورت یا عذر کی حالت پر محمول کرنا بہتر ہوتا ہے۔

بدایۃ المجتہد کا ذکر

علامہ ابن رشدؒ نے ہیئت جلوس فی الصلوٰۃ کے بارے میں اختلاف مذاہب و دلائل کا ذکر کر کے لکھا کہ یہ ساری ہیئات نماز میں جائز ہیں، اور نماز سب سے ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کو جواز و عدمِ جواز کا اختلاف نہ سمجھا جائے۔ (ص۱\۱۱۵)

مسئلہ تعدیلِ ارکان اور علامہ ابن رشد کی غلطی

علامہ کی یہ منقبت خاص طور سے لائق ذکر ہے کہ اختصار کے ساتھ سب کے دلائل انصاف کے ساتھ ذکر کر دیا کرتے ہیں، اور بیانِ مذاہب میں بھی ان کا قلم محتاط ہے، مگر بعض مواقع میں ان سے غلطی ہوتی ہے، مثلاً اسی (ص۱\۱۱۵ میں اعتدال کی بحث میں یہ لکھ گئے کہ امام ابوحنیفہؒ رکوع وغیرہ میں اعتدال کو واجب نہیں کہتے، حالانکہ یہ غلط ہے اور ہم نے اسی جلد کے ص۴\۱۴۵ میں حضرت شاہ صاحبؒ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب اور امام محمد صرف فرضیت کے قائل نہیں ہیں کیونکہ اس کے لئے دلیلِ قطعی چاہئے، لیکن وہ اس کے وجوب سے منکر نہیں ہیں، اور حضرتؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ تقریباً پچاس احادیث تعدیل و اعتدالِ ارکان کے مؤکد ہونے کی مروی ہیں، اس لئے نماز میں اس کی ضرورت و وجوب سے کون منکر ہو سکتا ہے؟ البتہ فرض کے درجہ میں اس کو پہنچا دینا مشکل ہے۔ اور ہدایۃ المجتہد ہی کی طرح کتاب الفقہ علی المذاہب الخمسہ (محمد جواد مغنیہ) ص۱۲۸ میں بھی غلطی ہوئی ہے، اس میں لکھا کہ حنفیہ کے نزدیک رکوع میں صرف جھکنا کافی ہے اور طمانیت واجب نہیں ہے، اور بقیہ مذاہب میں طمانیت و استقرار واجب ہے، پھر ص۱۲۹ میں لکھا کہ حنفیہ کے یہاں دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا واجب نہیں ہے، اور باقی سب مذاہب میں واجب ہے۔

البتہ کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ (شائع کردہ وزارۃ الاوقاف مصر) ص۱\۱۲۸ میں واجباتِ صلوٰۃ کے بیان میں جو نقل ہوا ہے وہ صحیح ہے۔ اس میں حنفیہ کے نزدیک ۱۹ واجباتِ صلوٰۃ ذکر کئے ہیں، جن میں نمبر ۴ پر اطمینان کا ارکانِ اصلیہ رکوع و سجود وغیرہ میں واجب کہا ہے، اور آخر میں رفع من الرکوع اور تعدیلِ ارکان کو بھی واجب بتلایا ہے۔ اور لکھا کہ یہ سب حنفیہ کے یہاں واجب ہیں کیونکہ حضور علیہ السلام سے ان سب پر مواظبت ثابت ہے، لہٰذا جو کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی بھول کر ترک کرے گا تو اس پر سجدۂ سہو واجب ہوگا۔ اور عمداً ترک کرے گا تو اس پر نماز کا اعادہ واجب ہوگا۔

اعلاء السنن ص۳\۱۹ میں لکھا کہ حنفیہ کے نزدیک طمانیت واعتدال رکوع، سجود، قومہ وجلسہ چاروں میں واجب ہے، اور یہی راجح فی المذہب ہے جیسا کہ ردالمحتار ص۱\۴۸۳ میں ہے، بحر میں بھی ہے کہ دلیل کا مقتضیٰ ان چاروں میں وجوب ہے اور قول بالوجوب ہی محقق ابن الہمام اور ان کے تلمیذ ابن امیر الحاج کا بھی مختار ہے، قاضی صدر شہید نے اپنی شرح میں تعدیلِ ارکان کے بارے میں پوری شدت اختیار کی ہے اور لکھا کہ ہر رکن کو کامل کرنا امام صاحب اور امام محمد کے نزدیک واجب ہے، اگر ترک کرے گا تو شدید کراہت کا مرتکب ہوگا، اور اس نماز کا اعادہ لازم ہوگا۔ (ص۱\۴۸۴) امام محمد سے یہ بھی نقل ہوا ہے کہ ان سے اس بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا:۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کی نماز جائز نہ ہوگی، علامہ سرخسی نے بھی لکھا کہ ترکِ اعتدال کی وجہ سے نماز لوٹانا لازم ہوگا۔ (فتح القدیر ص۱\۳۶۲)

غرض یہ بڑا مغالطہ ہے کہ حنفیہ کی طرف تعدیلِ ارکان کے عدمِ وجوب کا قول منسوب کر دیا گیا، یا کسی نے اس کو صرف مسنون ومستحب لکھ دیا، اور علامہ ابن رشد ایسے محقق سے بھی اس بارے میں غلطی ہوگئی ہے۔ فلیتنبہ لہ واللہ تعالیٰ اعلم۔

باب من لم یر التشہد الاول واجباً لان النبی صلے اللہ علیہ وسلم قام من الرکعتین ولم یرجع

۷۸۸: حدثنا ابو الیمان قال اخبرنا شعیب عن الزہری قال حدثنی عبدالرحمٰن بن ہرمز مولیٰ بنی عبدالمطلب وقال مرۃ مولیٰ ربیعۃ ابن الحارث ان عبداللہ بن بحینۃ قال وہو من ازدشنوءۃ وہو حلیف لبنی عبدمناف وکان من اصحاب النبی صلے اللہ علیہ وسلم ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم صلے بہم الظہر فقام فی الرکعتین الاولیین لم یجلس فقام الناس معہٗ حتیٰ اذا قضی الصلوٰۃ وانتظر الناس تسلیمہٗ کبر وہو جالس فسجد سجدتین قبل ان یسلم ثم سلم

ترجمہ: نبی اکرم ﷺ نے (ایک دن) لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھائی، تو (بھولے سے) پہلی دو رکعتوں (کے ختم) پر کھڑے ہوگئے۔ اور قعدہ نہیں کیا تو لوگ بھی آپ کے ساتھ کھڑے ہوگئے، یہاں تک کہ جب آپ نماز تمام کر چکے، اور لوگ آپ کے سلام پھیرنے کے منتظر ہوئے تو آپ نے بیٹھے ہی بیٹھے تکبیر کہی، اور سلام پھیرنے سے پہلے دو سجدے کیے، اور کے بعد سلام پھیرا۔

تشریح: حافظؒ نے اس باب پر بسیط کلام کیا ہے اور امام بخاریؒ پر علامہ زین بن المنیر کے اعتراض کا بھی ذکر کیا ہے فتح الباری ص۲\۲۰۹ میں دیکھا جائے۔ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ اس باب سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ تشہد رکنِ صلوٰۃ یا فرض نہیں ہے، جس کے ترک سے نماز باطل ہو جائے، البتہ ترک واجب ہوا جس سے سجدۂ سہو لازم ہوا۔

امام بخاری نے قولہ ولم یرجع سے یہ بھی بتلایا کہ اگر تشہد فرض ورکن ہوتا تو حضور علیہ السلام کھڑے ہونے کے بعد بھی اس کی طرف لوٹ جاتے۔ جیسا کہ قعدۂ اخیرہ کے ترک سہوا پر لوٹنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ وہ فرض ہے، دوسری حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صحابۂ کرام نے حضور علیہ السلام کو بلا تشہد کے کھڑے ہونے پر توجہ بھی دلائی، مگر آپ نہ لوٹے، لہٰذا یہ ترکِ واجب ہی کی متعین صورت تھی۔ نیز معلوم ہوا کہ متعدد واجب بھی ترک ہو جائیں تب بھی سجدۂ سہو ایک ہی کافی ہوگا، کیونکہ یہاں قعدۂ اولیٰ بھی واجب تھا اور تشہد بھی، دو واجب حضور علیہ السلام سے سہوا ترک ہوگئے تھے، مگر آپ نے ایک ہی سجدۂ سہو کیا۔

علامہ موفقؒ نے لکھا کہ اگر دو سہو یا زیادہ ایک جنس کے ہوں تو سب کے نزدیک ایک ہی سجدۂ سہو کافی ہوگا، لیکن اگر وہ مختلف جنس کے

ہوں تو ابن المنذر نے ایک قول امام احمد سے ایک ہی سجدۂ سہو کافی ہونے کا نقل کیا اور یہی قول اکثر اہل علم کا بھی ہے، جن میں امام مالک، ثوری، شافعی اور اصحاب الرائے ہیں۔

بعض حضرات نے ہر سہو کے لئے الگ سجدہ قرار دیا ہے، لیکن ان کی دلیل حدیث ابی داؤد و ابن ماجہ "لکل سہو سجدتان" کی سند میں کلام ہے، دوسرے اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر نماز کے لئے سجدہ ہے خواہ وہ ایک نماز میں متعدد بھی ہوں۔ الخ (لامع ص ۳۳۴\۱)۔

افادۂ انور: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ امام بخاریؒ کے یہاں واجب کا مرتبہ نہیں ہے، اس لئے واجب بدل کر فرض مراد لیا ہے، امام بخاری نے دیکھا کہ ترک تشہد کی تلافی حضور علیہ السلام کے سجدۂ سہو سے کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ فرض نہ تھا، ورنہ اس کے ترک سے نماز باطل اور کالعدم ہو جاتی، اور بعینہٖ یہی شان حنفیہ کے یہاں واجب کی ہے، کہ وہ سنت سے اوپر اور فرض سے کم درجہ ہے، اگر بھول سے کوئی سنت نماز میں رہ جائے تو اس کی وجہ سے سجدۂ سہو نہیں ہوتا۔ چونکہ یہ مرتبہ دوسروں کے یہاں نہیں ہے اس لئے ان کے مسائل کی نوعیت عجیب ہو جاتی ہے، چنانچہ حنابلہ نے تو فرض کی دو قسم کر دیں ایک وہ جو شرط صحت بھی ہو، دوسرا جو ایسا نہ ہو، حالانکہ یہ دوسرا ہی بعینہٖ حنفیہ کا وجوب ہے، مالکیہ نے وجوب سنت اور وجوب افتراض دو قسم بنائیں۔ اور وجوب سنت میں وہ سجدۂ سہو کے قائل ہوئے ہیں، جبکہ وہ بھی حنفیہ کے وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ شافعیہ کو باب الحج میں وجوب کا درجہ ماننا پڑا، کیونکہ انہوں نے جنایات کی تلافی مان کر حج کو مکمل مان لیا ہے، ہمارے نزدیک جس ضروری و اہم رکن غیر فرض کی تلافی ممکن ہو خواہ جزاء سے جیسے حج میں یا سجدۂ سہو سے جیسے نماز میں، اسی کو ہم واجب کا درجہ دیتے ہیں، جو فرض و سنت کے درمیان ہے۔ پھر حضرتؒ نے شئی واجب اور واجب الشئی کا فرق واضح کیا، جو حضرتؒ کی مشہور تحقیق ہے۔

باب التشهد فی الاولیٰ

(پہلے قعدہ میں تشہد پڑھنے کا بیان)

۷۸۹: حدثنا قتيبة قال حدثنا بكر عن جعفر بن ربيعة عن الاعرج عن عبدالله بن مالك ابن بحينة قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم الظهر فقام و عليه جلوس فلما كان في اٰخر صلوته سجد سجدتين وهو جالس

ترجمہ: عبداللہ بن مالک ابن بحینہ روایت کرتے ہیں کہ (ایک دن) ہمیں رسول خدا ﷺ نے ظہر کی نماز پڑھائی، تو (دوسری رکعت کے سجدوں کے بعد) کھڑے ہوگئے، حالانکہ آپ کو بیٹھنا ضروری تھا، لیکن جب آپ نے نماز کا آخری قعدہ کیا، تو دو سجدے (سہو کے) کئے۔

تشریح: پہلے باب میں امام بخاریؒ نے یہ بتلایا تھا کہ تشہد فرض نہیں ہے، یہاں یہ بتلایا کہ اگر وہ سہواً ترک ہو جائے تو سجدۂ سہو کرنا چاہئے، لہٰذا اس کو ترک کرنا جائز نہیں اور اس کی تلافی نہ کرے گا تو نماز قابل اعادہ ہوگی۔

باب التشهد فی الاخرة

(آخری قعدہ میں تشہد پڑھنے کا بیان)

۷۹۰: حدثنا ابو نعيم قال حدثنا الاعمش عن شقيق بن سلمة قال قال عبدالله كنا اذا صلينا خلف النبي صلى الله عليه وسلم قلنا السلام علىٰ جبريل وميكائيل السلام علىٰ فلان وفلان فالتفت الينا رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان الله هو السلام فاذا صلى احدكم فليقل التحيات لله

والصلوات والطیبات السلام علیک ایھاالنبی و رحمة الله و برکاته' السلام علینا و علیٰ عبادالله الصالحین فانکم اذاقلتموھا اصابت کل عبدالله صالح فی السمآء والارض اشهد ان لاالٰه الا الله واشهد ان محمداً عبدالله و رسوله'

ترجمہ۷۹۰: حضرت عبداللہ (بن مسعود) روایت کرتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم ﷺ کے پیچھے (نماز کے (قعدہ میں) یہ پڑھا کرتے تھے، کہ السلام علی جبریل ومیکائیل السلام علیٰ فلان و فلان تو (ایک مرتبہ) رسول خدا ﷺ نے ہماری طرف دیکھا اور فرمایا، کہ اللہ تو خود ہی سلام ہے (اس پر سلام بھیجنے کی کیا ضرورت) لہٰذا جب کوئی تم میں سے نماز پڑھے تو کہے التحیات للہ والصلوات والطیبات السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللّٰه وبرکاته السلام علینا وعلیٰ عباد اللّٰه الصالحین ﴿ کیونکہ جس وقت تم کہہ دو گے، تو (یہ دعا) اللہ کے ہر نیک بندے کو پہنچ جائے گی، خواہ وہ آسمان میں ہو یا زمین میں ﴾ اشھد ان لا الٰه الا اللّٰه واشھد ان محمدًا عبدهٗ ورسولهٗ.

تشریح: اوپر کے باب میں درمیانی تشہد کا حکم بیان ہوا تھا، یہاں آخری تشہد کا بیان ہے، جو پہلے سے زیادہ اہم و ضروری ہے۔ اس طرح امام بخاری نے تینوں باب میں درجہ بدرجہ احکام کی نوعیت دکھلائی ہے۔

قوله ان اللّٰه هو الاسلام اس کا تعلق دوسری مفصل حدیث سے ہے جو آگے آرہی ہے اس میں ہے کہ صحابۂ کرام السلام علی اللّٰہ بھی کہتے تھے۔

قوله علی جبریل پر حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا جبر کے معنی وقت کے ہیں اور ایل اللہ ہے لہٰذا جبریل کے معنی خدا کا قوی بندہ۔ ایسے ہی میکا کے معنی دوست کے ہیں۔ لہٰذا میکائیل معنی خدا کا دوست۔ اسراف کے معنی مصطفیٰ کے ہیں میکائیل خدا کا برگزیدہ بندہ۔ عزرا کے معنی ناصر کے ہیں، عزرائیل خدا کا ناصر و مددگار بندہ۔

قوله التحیات پر فرمایا کہ تحیات سے عبادات قولیہ مراد ہیں، صلوٰت سے مراد عبادات فعلیہ اور طیبات سے مالی عبادات مراد ہیں۔ یہ کلمات تو حضور علیہ السلام کی طرف سے شب معراج ہی میں جناب باری میں بطور تحیہ پیش کئے گئے تھے جس کے جواب میں حضرت باری جل ذکرہ کی جانب سے السلام علیک ایھا النبی ورحمة اللّٰه وبرکاته ارشاد ہوا اور نبی اکرم ﷺ نے السلام علینا الخ سے اس کی تکمیل فرمائی ہے۔

شاہ اسماعیل رحمہ اللہ کی تحقیق

حضرتؒ نے فرمایا کہ شاہ صاحبؒ نے ''الایضاح'' میں اس سے استدلال کیا کہ جمع معرف باللام مفید استغراق ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ ادعیہ، نذور ایمان کے بارے میں تو یہ قاعدہ مسلم ہے، کیونکہ ان سب کا مبنی فقط الفاظ پر ہوتا ہے، لیکن ان کے سوا دوسری چیزوں میں قطعیت عموم واستغراق کی بات تسلیم نہیں ہے۔

اختلاف مذاہب

حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم نے اوجز ص۲۶۲؍۱ میں لکھا: اہل نقل نے حکم تشہد میں علماء کا کافی اختلاف ذکر کیا ہے، اس لئے تفصیل ضروری ہے امام مالکؒ سے اس کی سنیت مطلقاً منقول ہے، جیسا کہ زرقانی وغیرہ نے کہا اور اصحاب متون بھی اس کو سنن صلوٰۃ ہی سے قرار دیتے ہیں، جیسا کہ مختصر الخلیل اور مختصر عبدالرحمٰن وغیرہ میں ہے، لیکن ابن عربی نے کہا کہ وہ رکن صلوٰۃ ہے مگر واجب نہیں نہ اس کا محل واجب ہے۔

امام احمدؒ سے زرقانی، حافظ اور نووی نے دونوں تشہد کا وجوب نقل کیا، اور صاحب نیل المآرب حنبلی نے اول کو واجب دوسرے کو رکن

قرار دیا ایسے ہی صاحب المغنی نے بھی دوسرے تشہد کو ارکان میں بتلایا اور اول کو واجبات میں۔

امام شافعیؒ سے زرقانی نے دوسرے میں وجوب نقل کیا، اول میں نہیں اور نووی نے بھی اول کو سنت کہا۔ حنفیہ سے بھی ان حضرات نے امام مالک کے موافق نقل کیا، مگر ہماری کتابوں میں دوسرے تشہد کو واجب لکھا ہے، حافظ نے لکھا کہ معروف عند الحنفیہ وجوب ہے، فرض نہیں۔ بخلاف اس کے کہ جو ان کے مخالفین کی کتابوں میں ہے۔

علامہ عینی نے لکھا کہ شرح ہدایہ میں امام صاحب کے نزدیک قعدۂ اولیٰ کا تشہد واجب لکھا ہے اور یہی مختار صحیح ہے، بعض نے سنت کہا جو قیاس کا مقتضیٰ ہے لیکن وہ ظاہر روایت کے خلاف ہے۔ اوپر کی تفصیل سے اتنی بات بقدر مشترک نکلی کہ جمہور کے نزدیک دوسرا تشہد زیادہ مؤکد ہے اول سے۔ الخ۔

باب الدعآء قبل السلام

(سلام پھیرنے سے پہلے دعا کرنے کا بیان)

۷۹۱: حدثنا ابوالیمان قال اخبرنا شعیب عن الزهری اخبرنا عروة ابن الزبیر عن عآئشة زوج النبی صلی الله علیه وسلم اخبرته' ان رسول الله صلی الله علیه وسلم کان یا عو فی الصلوٰة اللهم انی اعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من فتنة المسیح الدجال واعوذبک من فتنة المحیا وفتنة الممات اللهم انی اعوذبک من المأثم والمغرم فقال له' قآئل ماا کثر ماتستعیذ من المغرم فقال ان الرجل اذا غرم حدث فکذب واذاوعداخلف وعن الزهری قال اخبرنی عروة بن الزبیر ان عآئشة قالت سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم یستعیذ فی صلوته من فتنة الدجال

۷۹۲: حدثنا قتیبة بن سعید قال حدثنا اللیث عن یزید بن ابی حبیب عن ابی الخیر عن عبدالله بن عمرو عن ابی بکر ن الصدیق رضی الله عنه' انه' قال لرسول الله صلی الله علیه وسلم علمنی دعآءً ادعوبه' فی صلوتی قال قل اللهم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الاانت فاغفرلی مغفرة من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم

ترجمہ ۷۹۱: حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے **اللّٰهم انی اعوذبک من عذاب القبر واعوذبک من فتنة المسیح الدجال واعوذبک من فتنة المحیا والممات اللّٰهم انی اعوذبک من المأثم والمغرم** تو آپ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ قرض سے بہت پناہ مانگتے ہیں (اس کی کیا وجہ ہے؟) آپ نے فرمایا کہ جب آدمی قرضدار ہو جاتا ہے، تو جب وہ بات کہتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، اور جب وعدہ کرتا ہے تو وعدہ خلافی کرتا ہے، اور زہری نے بیان کیا کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو نماز میں فتنۂ دجال سے پناہ مانگتے ہوئے سنا۔

ترجمہ ۷۹۲: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول خدا ﷺ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی دعا تعلیم فرمایئے جو میں اپنی نماز میں پڑھ لیا کروں، آپ نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو، **اللّٰهم انی ظلمت نفسی ظلماً کثیراً ولا یغفر الذنوب الا انت فاغفرلی مغفرةً من عندک وارحمنی انک انت الغفور الرحیم۔**

تشریح: حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا: ۔ جو دعائیں حضور اکرم ﷺ سے مروی و ثابت ہیں وہ تو نماز کے اندر سب جائز ہیں جیسا کہ بحر میں

اس کی تصریح ہے، اور جو نمازی خود سے دوسری کرے اس میں تفصیل ہے کہ قرآن مجید و ادعیۂ ماثورہ حدیث کی طرح کی دعائیں جائز ہیں، اور جن امور کا سوال عام طور سے لوگوں سے بھی کیا جاتا ہے۔ ایسی دعا نماز میں نہ کرنی چاہئے کہ ان سے فسادِ صلوٰۃ کا اندیشہ ہے۔ تاہم ابن بطال اور دوسرے لوگوں نے جو امام ابوحنیفہؒ کی طرف یہ بات منسوب کردی ہے کہ ان کے نزدیک صرف قرآن مجید کی ذکر کردہ دعائیں نماز میں جائز ہیں، یہ نقل صحیح نہیں ہے، کیونکہ کتب حنفیہ میں قرآنی ادعیہ کے ساتھ ادعیۂ حدیث اور دوسری ماثور ادعیہ کا جواز موجود ہے، اور یہی حنابلہ کا بھی مذہب مغنی میں ہے کہ اگر تشہد میں ایسی دعائیں کرے جو احادیث میں ثابت ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ الخ اوجز ص ۲۴۷ میں مزید اچھی تفصیل و تحقیق ہے۔

تشہد کے بعد درود شریف اور امام بخاری

حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا:۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ امام بخاریؒ نے تشہد کے بعد دعاؤں کے ابواب شروع کردیئے اور درود شریف کو ترک کردیا، نہ اس پر باب قائم کیا نہ اس کا کچھ حکم بتلایا، حالانکہ ان کے پاس اس کے لئے صحیح حدیث بھی ان کی شرط پر موجود تھی، جس کو وہ کتاب الدعوات میں لائیں گے اور باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ قائم کریں گے (یہ حدیث بخاری ص ۹۴۰ پارہ نمبر ۲۶ میں آئے گی)۔

حضرتؒ نے فرمایا کہ نماز کے اندر آخری تشہد کے بعد درود شریف کا پڑھنا امام شافعیؒ کے نزدیک تو فرض ہے مگر جمہور کے نزدیک سنت ہے، اس لئے اس سے کم درجہ تو کسی طرح بھی نہیں ہے، اگر یہ کہا جائے کہ امام شافعیؒ کے رد کے واسطے امام بخاری نے ایسا کیا ہے، تب بھی اس کا بالکل ترک کردینا مناسب نہیں تھا، اور میں اب تک نہیں سمجھ سکا کہ امام بخاری کے لئے اس کے ترک کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے؟ اگر امام بخاری نے درود کو صرف دعا کے طور پر خیال کیا اور نماز کے اندر اس کو داخل نہ سمجھا تو اس کے مقابلہ میں وہ حدیثِ ابن مسعودؓ ہے جس میں نماز کے اندر درود پڑھنے کا سوال اور حضور علیہ السلام کا جواب بھی اسی کے لئے ہے، پھر حدیث کو اس زیادۃ کے ساتھ محدث بیہقی، حاکم، ابن حبان، ابن خزیمہ اور دار قطنی نے روایت کیا ہے اور سب نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔ لہٰذا درود کا محلِ صلوٰۃ ہونا متعین ہوگیا۔ (اعلاء السنن ص ۳/۱۵۲)

حضرت شیخ الحدیث دامت فیوضہم السامیہ نے لکھا:۔ شاید امام بخاری نے یہاں اس لئے ذکر نہیں کیا کہ اس سے وجوب کا توہم ہوتا اور اس کا وجوب ان کے نزدیک صحیح نہ ہوگا، اسی لئے مطلق دعاء کے ضمن میں لائے، تاکہ اس میں یہ بھی شامل ہوجائے (لامع ص ۱/۳۳۷)

لیکن یہ توجیہ اس لئے بے سود ہے کہ امام بخاری نماز کے سنن و مستحبات، واجبات و فرائض سب ہی بتلا رہے ہیں، اگر ان کے نزدیک یہ سنت کے درجے میں ہوتا تو اس کی اہمیت متقاضی تھی کہ جو بھی اس کی حیثیت ان کے نزدیک تھی اسی کے مطابق باب قائم کر کے اس کو بتلاتے، دوسرے یہ کہ یہاں بھی تشہد کے بعد دعا کا باب قائم کیا ہے، جبکہ دعا کو کوئی بھی واجب نہیں کہتا، اگر باب قائم کرنے سے وجوب کا توہم ہوتا ہے تو کیا دعاء کے لئے یہ توہم نہ ہوگا؟ اور کیا وہ باب من لم یر التشہد واجبا کی طرح ہی باب من لم یر الصلوٰۃ علی النبی ﷺ واجبا نہیں لا سکتے تھے؟! بہرحال! جیسا کہ ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ نے فرمایا امام بخاری کے اس فعل کی کوئی بہتر اور مناسب توجیہ سمجھ میں نہیں آتی، اور نہ اکابرِ امت میں سے کسی کی مناسب توجیہ ہماری نظر سے گذری واللہ تعالیٰ اعلم۔

امام مسلم وغیرہ اکابر محدثین کا طریقہ

امام بخاری کے بعد امام ترمذی کے طریقہ سے ہمیں تعجب در تعجب ہے کہ انہوں نے بھی ارکان و سننِ صلوٰۃ کے ضمن میں تشہد کے بعد درود شریف کا باب چھوڑ دیا ہے، اور آخر میں ابوابِ وتر کے بعد ابواب الجمعہ سے قبل اس کو لائے ہیں، حالانکہ ان کو امام شافعیؒ کی رعایت سے بھی اس کا باب تشہد کے ساتھ لانا چاہئے تھا، شاید انہوں نے ابرادِ ظہر وغیرہ چند مسائل کی طرح اس مسئلہ میں بھی امام شافعی کا مسلک کمزور اور مرجوح قرار دیا ہوگا، تاہم سنیت یا استحباب کے قائل تو وہ بھی ضرور ہوں گے، اس لئے کوئی معقول وجہ ان کے ترک کی بھی ہم نہیں سمجھ سکے۔ اس کے بعد ہم نے امام

مسلم کی طرف رجوع کیا تو دیکھا کہ انہوں نے باب التشہد فی الصلوٰۃ کے بعد باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ بعد التشہد بھی قائم کیا ہے، اور وہی حدیث کعب بن عجرہ پیش کی ہے جس کو امام بخاری آخر میں باب الدعوات ص۹۴۰ میں لائیں گے۔ اور ابوحمید الساعدی کی حدیث بھی لائے ہیں، اور امام بخاری وہاں حدیثِ ابی سعید خدری بھی لائے ہیں، اور ان سب ہی میں درود شریف پڑھنے کی کیفیت اور طریقہ تعلیم کیا گیا ہے۔

پھر امام نسائیؒ کی طرف رجوع کیا تو انہوں نے باب التشہد کے بعد باب التسلیم قائم کیا پھر **باب التمجید والصلوۃ علی النبی** ﷺ **فی الصلوٰۃ** کے بعد دوسرا **باب الامر بالصلوٰۃ علی النبی** ﷺ بھی ذکر کیا۔ پھر **باب الفضل فی الصلوٰۃ علی النبی** ﷺ، لائے اور بہت سی احادیثِ صحیحہ ان ابواب میں ذکر کیں۔ ان کے بعد باب تخییر الدعاء صلوٰۃ علی النبی ﷺ ذکر کیا (نسائی ص۱۸۹\۱) جبکہ امام بخاری وترمذی نے تشہد کے بعد کے سارے ابواب صلوٰۃ علی النبی والے حذف کر کے نماز کی آخری دعاؤں کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اسی طرح ہم نے دیکھا کہ امام ابوداؤد نے بھی باب التشہد کے بعد باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ قائم کیا ہے اور امام ابن ماجہ نے بھی باب التشہد کے بعد باب الصلوٰۃ علی النبی ﷺ قائم کیا ہے، (ص۶۴) اس کی حدیث الباب کے قول قد عرفناہ پر حاشیہ بھی قابلِ ذکر ہے، جس میں امام بیہقی کی سنن سے نقل ہوا کہ اس میں اشارہ سلام فی التشہد کی طرف ہے، لہٰذا فکیف الصلوٰۃ میں بھی مراد تشہدِ صلوٰۃ کے ہی درود کی طرف ہونا چاہئے، (قالہ السیوطی فی الزجاجہ)

درودِ نماز کے بارے میں اقوالِ اکابرؒ

ہم یہاں نوعیتِ مسئلہ کی مزید وضاحت اکابرِ امت کے ارشادات کی روشنی میں پیش کرتے ہیں، واللہ الموفق:۔ واجز ص۱۶۳\۲ میں اس طرح ہے:۔ نماز کے اندر درود شریف کے بارے میں علامہ ابن عبدالبر نے نقل کیا کہ امام مالک، ثوری واوزاعی کے نزدیک تشہدِ اخیر کے بعد مستحب ہے اور تارک خطا کار ہے، باوجود اس کے نماز درست ہے، امام شافعی نے کہا کہ اگر تشہدِ آخر کے بعد اور، سلام سے پہلے درود شریف نہ پڑھے گا تو نماز لوٹائے گا، ابن قدامہ نے المغنی میں لکھا کہ صحیح مذہب کی رو سے وہ واجب ہے اور یہی قول امام شافعی واسحٰق کا ہے امام احمد کے نزدیک وہ غیر واجب ہے۔

مروزی نے نقل کیا کہ ابوعبداللہ سے کہا گیا کہ ابن راہویہ تارک صلوٰۃ فی التشہد کی نماز کو باطل کہتے ہیں تو کہا کہ انہوں نے کتنی جرأت کی؟! اور ایک موقع پر اس کو شذوذ بتلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اس کو واجب نہیں سمجھتے تھے، اور یہی قول امام مالک، شافعی واصحاب الرائے واکثر اہلِ علم کا ہے۔

ابن المنذر نے کہا کہ یہ قول امام شافعی کے سوا سب اہلِ علم کا ہے۔ امام احمدؒ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ پہلے قول سے رجوع کر کے آخر میں وہ وجوب کے قائل ہو گئے تھے، اور نیل المآرب میں قول اللہم صلی علی محمد کو ارکان میں شمار کیا ہے۔

اصحابِ امام شافعیؒ سے یہ بھی نقل ہوا کہ درود شریف کی فرضیت نماز میں منحصر ہے، اور نماز سے باہر وہ بھی اس کو واجب نہیں کہتے۔ علامہ ابوعمر ابن عبدالبرؒ نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ فرائض صرف ایسی دلیل سے ثابت ہو سکتے ہیں جس کا کوئی معارض نہ ہو یا ایسے اجماع سے جس کا کوئی مخالف نہ ہو، اور یہ بات اس مسئلہ میں معدوم ہے، اسی لئے امام شافعی کی دلیل کو ضعیف سمجھتا ہوں اور درود کو ہر نماز میں واجب وفرض نہیں سمجھتا، اور اس کے ترک کو بھی کسی کے لئے پسند نہیں کرتا۔

درمختار میں ہے کہ امام شافعی نے لفظ "**اللّٰھم صلی علی محمد**" کو فرض کہا، جس پر ان کو شذوذ اور مخالفۃِ اجماع کا الزام دیا گیا، ابن عابدین نے کہا کہ ان الزام دینے والوں میں امام طحاوی، رازی، ابن المنذر، خطابی، بغوی اور طبری بھی ہیں، حالانکہ یہ بات جو امام شافعی نے کہی وہ بعض صحابہ اور تابعین سے بھی نقل کی گئی ہے۔ (کذا قال الحلبی فی الکبیری) اور امام احمد سے بھی وہ قول نقل ہوا جو امام شافعی کا ہے۔

امام شافعیؒ کا استدلال حدیث ابن ماجہ "لا صلوٰۃ لمن لم یصل علی فی صلاتہ" سے ہے، جس کو سارے اہلِ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے، اور آیتِ قرآنی یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ سے ہے کہ مطلق امر فرضیت کے لئے ہوتا ہے، دوسرے حضرات نے اس امر کو استحباب کے لئے کہا ہے کیونکہ حضرت عمرو ابن مسعودؓ سے درود شریف کا نماز میں مسنون ہونا مروی ہے۔ الخ۔

نماز کے علاوہ درود شریف کا حکم

امام طحاوی حنفی اور ایک جماعتِ حنفیہ نے اور علامہ حلیمی اور ایک جماعتِ شافعیہ نے نیز قاضی ابوبکر مالکیؒ نے کہا کہ جب بھی حضورِ اکرم ﷺ کا نامِ نامی اسمِ گرامی بولا جائے یا سنا جائے تو آپ پر درود شریف پڑھنا ضروری ہے خواہ وہ مختصر الفاظ میں ہی ہو، یہی قول احوط ہے، وکذا قال الزمخشری اور محدث ابن العربی نے شرح ترمذی میں لکھا کہ اس بارے میں امت میں سے کسی کا بھی اختلاف نہیں کہ عمر میں ایک بار تو حضور علیہ السلام پر درود بھیجنا فرض کے درجہ میں ہے، اور یہی درمختار کا بھی مختار ہے، لہٰذا جس کسی نے یہ کہا کہ اس کے استحباب پر اجماع ہے، اس نے خلافِ اجماع بات کہی، اس کے بعد علامہ کرخی اور امام طحاوی کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک جب بھی حضورِ اکرم ﷺ کے اسمِ گرامی کا ذکرِ مبارک آئے گا تو درود پڑھنا واجب ہوگا، خواہ ایک مجلس میں کتنی ہی بار مکرر ہو۔ اصح یہی ہے کیونکہ امر مقتضی تکرار ہے، اور جب بھی سبب مکرر ہوگا، وجوب بھی مکرر ہوگا، اور ترک سے دین رہے گا، کہ اس کی قضا ضروری ہوگی، کیونکہ یہ حقِ عبد ہے، جیسے کہ تشمیتِ عاطس بخلاف ذکر باری عزاسمہ کے اور مذہب استحباب تکرار کا ہے، جس پر فتویٰ ہے اور معتمد قول امام طحاوی کا ہے، کذا ذکرہ الباقلانی متبعالما صححہ الحلبی وغیرہ ورجحہ فی البحر باحادیث الوعید کرغم والبعاد وشقاء وبخل وجفاء۔ حافظؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ جن حضرات نے آپ کے سرِ ذکرِ مبارک پر درود کو واجب قرار دیا ہے اس لئے کہ درود نہ پڑھنے پر رغم، ابعاد وشقاء وغیرہ کی وعید میں وارد ہیں، اس کے جواب میں دوسرے حضرات (کرخی وغیرہ) نے جوابات دیئے ہیں مثلاً یہ کہ صحابہ وتابعین کے عمل سے اس کی توثیق نہ ہو سکی کیوں کہ اذان واقامت اور دوسرے مواقع میں کسی سے ثابت نہ ہوا کہ وہ کلمۂ شہادت کے ساتھ درود بھی پڑھتے ہوں، یا صحابہ نے حضور علیہ السلام سے خطاب کے وقت یا رسول اللہ کے ساتھ صلی اللہ علیک کہا ہو وغیرہ، دوسرے اس میں بڑی مشقت بھی ہے، جبکہ نصِ قرآن کے ذریعہ امتِ مرحومہ سے حرج ومشقت کی نفی آچکی ہے، تیسرے یہ کہ ایسا ہوتا تو دوسرے کاموں اور عبادتوں کے لئے وقت فارغ نہ ہو سکتا، اور احادیثِ وعید کا جواب یہ دیا ہے کہ وہ تاکید وترغیب کے لئے ہیں۔ ایجاب وفرضیت کے لئے نہیں ہیں، یا ان لوگوں کے لئے ہیں جو ترکِ درود شریف کے عادی ہیں، بہر حال ایک ہی مجلس میں تکرار اسم مبارک کی صورت میں بوجوہِ مذکورہ بالا تکرار وجوب کی بات مرجوح قرار دی گئی ہے۔

علامہ طبری نے باوجود صیغۂ امر کے بھی عدمِ وجوب پر بطور اصلِ شرعی کے اس امر سے استدلال کیا کہ علماءِ امت کے سارے متقدمین ومتاخرین نے بالاتفاق یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ ہر بار ذکرِ اسم مبارک کے وقت درود پڑھنا ایسا لازم وفرض کے درجہ میں قطعاً نہیں ہے کہ اس کا تارک عاصی ونافرمان قرار پائے، لہٰذا اس سے یہی ثابت ہوا کہ امر استحباب ہی کے لئے ہے۔ یہ ساری تفصیل اوجز ص ۲\۱۶۲ سے نقل کی گئی ہے۔

ذکر باری پر تقدیس کا حکم

معارف السنن ص ۴\۲۹۳ میں یہ اضافہ ہے کہ ایسا ہی اختلاف ذکرِ معظم اسمِ باری جل مجدہ کے بارے میں بھی ہے کہ جب بھی حق تعالیٰ جل ذکرہ کا اسم معظم لیا جائے یا سنا جائے تو کیا ایک ہی مجلس میں ہر بار جل ذکرہ، عزاسمہ، تعالیٰ جدہ وغیرہ کہہ کر تقدیس کرنا واجب وضروری ہے یا نہیں ہے؟

علامہ زاہدی نے لکھا کہ ایک مجلس میں یا کئی مجالس میں حق تعالیٰ کا نام سن کر ہر مجلس کے لئے الگ الگ ثنا کا کلمہ کہنا چاہئے لیکن اگر نہ

کہہ سکا تو وہ دین قابلِ ادائیگی نہ ہوگا کیونکہ باری تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش ہر لحہ ہوتی رہتی ہے (اور اس کے ساتھ اس کا اسم گرامی اور یاد بھی متجدد ہوتی رہتی ہے) لہٰذا ہر لحہ اور ہر آن اس کی ثناء تقدیس بھی ہونی چاہئے، جس کے لئے بندہ فارغ نہیں ہوسکتا اور اس لئے رحمت باری سے عفوو درگزر کی توقع پر ہر وقت ثنا و تقدیس لازم نہ ہوئی اور نہ دین کے طور پر اس کی قضا ضروری ہوئی! بخلاف اس کے کہ حضور علیہ السلام کے ذکرِ مبارک پر مختصر کلمۂ درود دشوار نہیں ہے، لہٰذا ﷺ یا علیہ السلام کہنا ہی چاہئے، اگر کسی مجلس میں نہ کہہ سکا تو وہ دین رہے گا، جس کی قضا ضروری ہوگی۔ (شرح المنیہ نمبر ۳۳۴)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اس موقع پر حلبی کبیر (شرح المنیہ) کی طرف مراجعت کی گئی تو فرق پایا کچھ لفظ طباعت میں رہ گئے ہیں اور باقی اضافہ ضروری سمجھا گیا۔

صلعم کی ممانعت: یہاں یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس زمانہ میں متساہل طبع عوام یا طلبہ یا بعض علماءِ زمانہ بھی جو حضور اکرم ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ صرف ؐ یا صلعم لکھ دیتے ہیں، یہ سخت ممنوع اور غیر پسندیدہ فعل ہے، معارف السنن ص ۲۹۳ میں التدریب ص ۱۵۴ سے نقل کیا گیا کہ لکھنے میں حضور علیہ السلام کے لئے ؐ یا صلعم سے اشارہ کرنا مکروہ ہے اس لئے پورا درود ﷺ یا علیہ السلام وغیرہ لکھنا چاہئے۔ اور نقل ہوا کہ جس شخص نے پہلے ایسا کیا تھا، اس کا ہاتھ شل ہوگیا تھا یا کٹ گیا تھا۔

علامہ عراقی نے اپنے الفیہ میں لکھا کہ رمز و حذف سے اجتناب کرو، خواہ مختصر ہی لفظوں سے ہو صلوٰۃ و سلام واضح طور پر بھیجو علامہ سخاوی نے بھی ابناءِ عجم اور عوامِ طلب کے اس فعل پر تشنیع کی ہے، اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے امام احمدؒ سے بھی اس پر تشنیع نقل فرمائی ہے۔ لیکن بعض ناواقف آپ یا جناب پر بھی ؐ لگا دیتے ہیں یہ بے محل ہے۔ اسی طرح جہاں عبارت و حکایت میں یا قرأتِ حدیث کے وقت لفظ یا رسول اللہ آئے تو وہاں بھی صلی اللہ علیہ وسلم یا علیہ السلام لکھنا یا کہنا بے محل ہے، نہ صحابہؓ سے ایسا منقول ہے کہ وہ یا رسول اللہ! کے ساتھ صلی اللہ علیک کہتے ہوں۔ اسی لئے ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ درس بخاری میں قرأۃ کرنے والا طالب علم اگر یا رسول اللہ آنے پر صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہتا تو آپ ﷺ اس کو روک دیتے تھے کہ تم سے زیادہ علم و ادب والے صحابہؓ سے بھی ایسا ماثور نہیں ہے۔ غرض ان امور کو سمجھنے اور برتنے کے لئے علم و ادب، فہم و دانش سب ہی کی ضرورت ہے۔

اکثارِ استغفار یا درود شریف

ہمارے حضرت شاہ صاحبؒ اکثر فرماتے تھے اور معارف السنن ص ۴/۲۹۹ میں بھی نقل ہوا کہ عفوِ معاصی کے لئے تہلیل و استغفار کی کثرت کرنی چاہئے، اور حضور علیہ السلام کی شفاعت کے لئے درود شریف کی کثرت کی جائے۔

درود میں لفظ سیدنا کا استعمال

بعض علماءِ نجد درود شریف میں لفظ ''سیدنا'' کے اضافہ کو بدعت بتلاتے ہیں، اس کی تردید مختصراً ہم سے انوار الباری ص ۱۱/۹۲ میں بھی کی تھی، بغرض علمی افادہ اوجز وغیرہ سے یہاں اس کی مزید وضاحت کی جاتی ہے: اسمِ گرامی محمد کے اول میں لفظ سیادۃ کے اضافہ پر اختلاف ہوا ہے، ابن رسلان نے کہا کہ ادبِ نبوی کے لحاظ سے تو یہ بہتر ہی ہے، درمختار میں ہے کہ سیادۃ کا اضافہ مندوب ہے کیونکہ واقعی امور کا اضافہ تقاضائے عینِ ادب ہے، لہٰذا وہ ترک سے افضل ہے، رملی شافعی وغیرہ نے بھی یہی کہا، اور حضور علیہ السلام سے **لا تسودونی فی الصلوٰۃ** کی نقل جھوٹ ہے، اور بفرض صحت احتمال ہے کہ آپ نے ایسا تو اضعاً فرما دیا ہو، یا اس لئے کہ مشافۂ تعریف کو ناپسند کیا ہو یا اس لئے کہ وہ جاہلیت کا تحیہ تھا، قربِ عہد جاہلیت کے باعث ناپسند فرمایا ہو، اور اس کے مقابلہ میں یہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمام اولادِ آدم کا سید ہوں، اور آپ نے حضرت حسنؓ کے بارے میں فرمایا کہ میرا یہ بیٹا سید ہے۔ اور حضرت سعدؓ کے لئے صحابہ کو ارشاد فرمایا کہ اپنے سید

کے لئے کھڑے ہو جاؤ، اور حدیثِ نسائی میں ہے کہ سہل بن حنیفؓ نے حضور کو یا سید کہہ کر خطاب کیا، اور حضرت ابن مسعود کے درود میں **اللّٰهم صل علی سید المرسلین** وارد ہے۔ اور علامہ سیوطی نے درمنثور میں بواسطہ عبدالرزق، عبد بن حمید، ابن ماجہ وابن مردویہ حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا کہ آپ نے لوگوں کو یہ درود تلقین کیا: ۔ **اللّٰهم اجعل صلواتک ورحمتک** حضرات کے امتثالِ امرِ نبوی سے تادباً باز رہنے کو گوارہ فرمایا، اس سے ان کے فعل کی اولویت ثابت ہوتی ہے۔ (اعلاء السنن ص۳\۱۷)

سلطان عبدالعزیز اور حضرت مولانا خلیل احمدؒ کا واقعہ

حضرت مولاناؒ نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی تھی، اور وہ سعودی حکومت کا ابتدائی دور تھا، آپ نے نجدی علماء پر بہت سے مسائل میں اتمامِ حجت کی تھی، جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے جس کو ہم تذکرۃ الخلیل سے نقل کرتے ہیں۔ آپ روضۂ نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن البیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر، اس زمانہ میں جو شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ لفظ سیدنا استعمال کرتا، نجدی لوگ اس کو مشرک کہتے تھے، اور چار طرف حرمِ نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی، حضرتؒ نے موقع پا کر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے کچھ سکوت کے بعد کہا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث میں تو آیا ہے۔ قاضی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا حدیثِ صحیح میں ''انا سید ولد آدم ولا فخر'' وارد ہے قاضی صاحب نے کہا ہاں! اس طرح تو آیا ہے مگر نامِ مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں، وہ بھی کہیں قرآن مجید میں آیا ہے، قاضی صاحب نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا کہ کون کہا کرتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا استعمال کرو۔ ایک جگہ حدیث میں آ گیا وہ کافی ہے۔ سلطانِ حجاز ونجد اس مکالمہ کو غور سے سن رہے تھے، اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ممانعت تو نہیں آئی۔ سلطان نے کہا کہ ایک جگہ آ گیا اور ممانعت کہیں آئی نہیں۔ تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟! اس کے بعد لوگوں میں اس مکالمے کا بڑا چرچا ہوا، اور پھر مشرک مشرک کی صدا کبھی کان میں نہیں آئی۔ (تذکرۃ الخلیل ص۲۰۴)

اس قسم کے واقعات اور بھی منقول ہیں کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے علماءِ نجد سے تبادلۂ خیال کر کے ان کو متاثر کیا، اور ہم لوگ جب ۱۹۳۷ء میں حجاز حاضر ہوئے تھے، اور وہاں کے طویل قیام میں شیخ سلیمان الصنیع رئیس ہیئۃ الامر، المعروف والنہی عن المنکر سے بہ کثرت ملاقاتوں میں اختلافی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا تو وہ بھی اکثر مسائل میں تشدد کی راہ چھوڑ کر اعتدال کو پسند کرتے تھے، اس کے بعد رفیق محترم مولانا السید محمد یوسف البنوریؒ بھی اپنی ملاقاتوں میں اور معارف السنن کے ذریعہ بھی علماءِ نجد وحجاز کے سامنے جرأت مندانہ احقاقِ حق کرتے رہے اور اس کے بہتر اثرات بھی رونما ہوئے، مگر افسوس ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آتا ہے اور عام طور سے مصلحت بینی اور مداہنت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے واللہ المستعان۔

حافظ ابن تیمیہ وابن القیم اور درود شریف کے ماثور الفاظ کی بحث

ہم نے اس کے بارے میں انوارالباری ص۱۱\۹۰ میں بھی لکھا تھا اور یہ بھی واضح کیا تھا کہ نہ صرف ابن القیم بلکہ ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہ نے بھی ایسا ہی غلط دعویٰ کیا ہے اب دوسرے افادات پیش ہیں۔ اوجز ۲\۱۵۷ میں ہے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ حافظ ابن القیم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''درود شریف والی اکثر احادیث میں **محمد و آل محمد** کا ذکر ہے، اور ان کے ساتھ صرف **ابراهیم** یا صرف **آل ابراهیم** کا ذکر ہے (علیہم السلام) اور کسی حدیث صحیح میں لفظ **ابراهیم و آل ابراهم** ایک جگہ ساتھ وارد نہیں ہوا ہے، البتہ بیہقی نے بہ طریق یحییٰ عن رجل روایت کی ہے، جبکہ یحییٰ مجہول ہے اور اس کا شیخ مبہم ہے، لہٰذا اس کی سند ضعیف ہے۔ اور ابن ماجہ میں ضرور سندِ قوی سے

روایت ہے۔ مگر وہ موقوف ہے، حافظ نے اس پر لکھا کہ ابن القیم صحیح تو یہ بھی غافل ہو گئے جو کتاب الانبیاء ترجمہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں ہے، کہ اس میں **کما صلیت علی ابراھم وعلیٰ آل ابراھیم** اور ایسے ہی کما بارکت میں بھی **ابراھیم و آل ابراھیم** ایک جگہ ساتھ ہیں، اور ایسے ہی طبری کی روایت میں بھی ہے۔ پھر حافظ نے دوسری روایات صحیحہ بھی ذکر کیں، جن میں دونوں لفظ ساتھ جمع ہیں۔

فتح الملہم ص ۲\۴۸ میں بھی ''تنبیہ'' کے عنوان سے یہی بات لکھی گئی ہے، اور غالباً حافظ کی طرح صاحب اوجز اور صاحب فتح الملہم بھی اس امر پر مطلع نہیں ہو سکے کہ بعینہ یہی دعویٰ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں کیا ہے، ملاحظہ ہو فتاویٰ ص ۱\۱۹۰ از زیرِ تحقیق مسئلہ نمبر ۱۵۳ (انوارالباری ص ۱۱\۱۸۹ تا ص ۱۱\۱۹۱ میں پوری تفصیل آ چکی ہے) معارف السنن ص ۴\۲۹۷ میں دونوں حضرات کے غلط دعاوی کا حوالہ دے کر رد وافر کیا گیا ہے۔ **واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل.** اس تفصیل کے ساتھ حسبِ تجویز واصطلاح حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری ''تیمیین'' کے اس مشہور ومعروف دعوے کو بھی حافظہ میں تازہ رکھئے کہ جس حدیث کو حافظ ابن تیمیہ صحیح قرار دیں وہ صحیح ہے اور جس کو وہ کہیں کہ صحیح نہیں ہے تو وہ واقع میں بھی صحیح نہیں ہے۔'' اور اب تو دونوں حضرات نے دعویٰ فرما دیا کہ **لفظ ابراھم و آل ابراھیم** ایک جگہ ساتھ ہو کر کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا ہے، تو پھر خواہ صحیح بخاری میں بھی کئی جگہ موجود ہوا کرے، سمجھنا یہی چاہئے کہ وہ واقع میں موجود یا صحیح نہیں ہے! والی اللہ المشتکی۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ. امین.

وبرکاتک علی سید المرسلین وامام المتقین الحدیث، یہ سب دلائل اختیارِ لفظ سید کے لئے کافی ووافی ہیں اور علامہ شوکانی نے بھی نیل الاوطار میں اس کی اولویت کی طرف میلان ظاہر کیا ہے، علامہ ابی نے بھی شرح مسلم شریف میں لکھا کہ لفظ سید اور مولیٰ کا استعمال بہتر ہے، اگرچہ وہ خاص طور سے درود کے الفاظ میں حضور علیہ السلام سے روایت بھی نہیں ہوا، کیونکہ اس بارے میں مستند حدیث صحیح **''انا سید ولد آدم''** وارد ہے۔ (اوجز ص ۲\۱۵۷) اعلاء السنن میں ہے کہ ابن عبدالسلام نے سید کے اضافہ کو باب سلوکِ ادب سے قرار دیا۔ اور یہ اس قاعدہ پر مبنی ہے کہ طریق ادب کی رعایت امتثالِ امر سے بھی زیادہ محبوب اور راجح ہو جاتی ہے، جس کی تائید حضرت ابو بکرؓ کی حدیث سے ہوتی ہے کہ حضور علیہ السلام نے ان کو اپنی جگہ قائم رہنے کا حکم دیا مگر انہوں نے نہ مانا اور عرض کیا کہ ابن ابی قحافہ کی کیا مجال کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے ہو کر کھڑا ہو، اور ایسا ہی واقعہ حضرت علیؓ کا بھی ہے کہ صلح حدیبیہ کے صحیفہ میں حضور علیہ السلام نے کاتب صحیفہ حضرت علیؓ کو حکم فرمایا کہ اس کو کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھ دو، حضرت علیؓ نے عرض کیا واللہ! میں آپ کا اسمِ گرامی ہرگز نہیں کاٹوں گا، اس پر حضور علیہ السلام نے اس کو خود کاٹ کر محمد بن عبداللہ لکھوایا (بخاری ص ۶۱۰) دونوں حدیثیں صحیح بخاری میں ہیں، اور حضور علیہ السلام نے جو ان دونوں حضرات کے امتثالِ امر نبوی سے تادباً باز رہنے کو گوارہ فرمایا، اس سے ان کے فعل کی اولویت ثابت ہوتی ہے۔ اعلاء السنن ص ۳\۱۷۔

سلطان عبدالعزیز اور حضرت مولانا خلیل احمدؒ کا واقعہ

حضرت مولاناؒ نے مدینہ طیبہ کو ہجرت فرمائی تھی، اور وہ سعودی حکومت کا ابتدائی دور تھا، آپ نے نجدی علماء پر بہت سے مسائل میں اتمامِ حجت کی تھی، جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے جس کو ہم تذکرۃ الخلیل سے نقل کرتے ہیں۔ آپ روضۂ نبوی میں حجاز کے قاضی القضاۃ امیر ابن البلیہد کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اور سلطان عبدالعزیز ان کے برابر۔ اس زمانہ میں جو شخص آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ گرامی کے ساتھ لفظ سیدنا استعمال کرتا، نجدی لوگ اس کو مشرک کہتے تھے، اور چار طرف حرمِ نبوی میں یہی صدا کان میں پڑتی تھی، حضرتؒ نے موقع پا کر قاضی صاحب سے سوال فرمایا کہ آپ لفظ سیدنا کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ قاضی صاحب نے کچھ سکوت کے بعد کہا کہ حدیث میں کہیں نہیں آیا، حضرتؒ نے فرمایا کہ حدیث میں تو آیا ہے۔ قاضی صاحب نے حیرت سے پوچھا کہاں آیا ہے؟ آپ نے فرمایا حدیث صحیح میں ''انا سید ولد آدم ولا فخر'' وارد ہے قاضی صاحب نے کہا ہاں! اس طرح تو آیا ہے مگر نامِ مبارک کے ساتھ کہیں نہیں آیا، حضرت نے فرمایا کہ اللہ

تعالیٰ کے نام مبارک کے ساتھ جو تعالیٰ لگاتے ہیں، وہ بھی کہیں قرآن مجید میں آیا ہے، قاضی صاحب نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا کہ کون کہتا ہے کہ ہمارے نام کے ساتھ تعظیمی الفاظ کا استعمال کرو۔ ایک جگہ حدیث میں آ گیا وہ کافی ہے۔ سلطان حجاز ونجد اس مکالمہ کو غور سے سن رہے تھے، اب انہوں نے قاضی صاحب سے سوال کیا کہ کہیں اس لفظ کی ممانعت آئی ہے؟ قاضی صاحب نے جواب دیا کہ ممانعت تو نہیں آئی۔ سلطان نے کہا کہ ایک جگہ آ گیا اور ممانعت کہیں آئی نہیں۔ تو اس پر تشدد کیوں کیا جاتا ہے؟! اس کے بعد لوگوں میں اس مکالمے کا بڑا چرچا ہوا، اور پھر مشرک کی صدا کبھی کان میں نہیں آئی۔ (تذکرۃ الخلیل ص۲۰۴)

اس قسم کے واقعات اور بھی منقول ہیں کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ نے علماءِ نجد سے تبادلۂ خیال کر کے ان کو متاثر کیا، اور ہم لوگ جب ۱۹۳۷ء میں حجاز حاضر ہوئے تھے، اور وہاں کے طویل قیام میں شیخ سلیمان الصنیع رئیس ہیئۃ الامر، المعروف والنہی عن المنکر سے بہ کثرت ملاقاتوں میں اختلافی مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوتا تھا تو وہ بھی اکثر مسائل میں تشدد کی راہ چھوڑ کر اعتدال کو پسند کرتے تھے، اس کے بعد رفیق محترم مولانا السید محمد یوسف البنوریؒ بھی اپنی ملاقاتوں میں اور معارف السنن کے ذریعہ بھی علماءِ نجد وحجاز کے سامنے جرأت مندانہ احقاقِ حق کرتے رہے اور اس کے بہتر اثرات بھی رونما ہوئے، مگر افسوس ہے کہ اب یہ سلسلہ ختم ہوتا نظر آتا ہے اور عام طور سے مصلحت بینی اور مداہنت کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے واللہ المستعان۔

حافظ ابن تیمیہ وابن القیم اور درود شریف کے ماثور الفاظ کی بحث

ہم نے اس کے بارے میں انوار الباری ص۱۹۰\۱۱ میں بھی لکھا تھا اور یہ بھی واضح کیا تھا کہ نہ صرف ابن القیم بلکہ ان کے شیخ حافظ ابن تیمیہ نے بھی ایسا ہی غلط دعویٰ کیا ہے اب دوسرے افادات پیش ہیں۔ اوجز ۱۵۷\۲ میں ہے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں لکھا کہ حافظ ابن القیم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ''درود شریف والی اکثر احادیث میں محمد وآل محمد کا ذکر ہے، اور ان کے ساتھ صرف ابراہیم یا صرف آل ابراہیم کا ذکر ہے (علیہم السلام) اور کسی حدیث صحیح میں لفظِ ابراہیم وآل ابراہم ایک جگہ ساتھ وارد نہیں ہوا ہے، البتہ بیہقی نے بہ طریق یحییٰ عن رجل روایت کی ہے، جبکہ یحییٰ مجہول ہے اور اس کا شیخ مبہم ہے، لہٰذا اس کی سند ضعیف ہے۔ اور ابن ماجہ میں ضرور سندِ قوی سے روایت ہے۔ مگر وہ موقوف ہے، حافظ نے اس پر لکھا کہ ابن القیم صحیح بخاری کی روایت صحیح تو یہ بھی غافل ہو گئے جو کتاب الانبیاء، ترجمہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میں ہے، کہ اس میں **کما صلیت علی ابراھم وعلیٰ آل ابراھیم** اور ایسے ہی کما بارکت میں بھی ابراہیم وآل ابراہیم ایک جگہ ساتھ ہیں، اور ایسے ہی طبری کی روایت میں بھی ہے۔ پھر حافظ نے دوسری روایات صحیح بھی ذکر کیں، جن میں دونوں لفظ ساتھ جمع ہیں۔

فتح الملہم ص۴۸\۲ میں بھی ''تنبیہ'' کے عنوان سے یہی بات لکھی گئی ہے، اور غالباً حافظ کی طرح صاحب اوجز اور صاحب فتح الملہم بھی اس امر پر مطلع نہیں ہو سکے کہ بعینہ یہی دعویٰ علامہ ابن تیمیہ نے بھی اپنے فتاویٰ میں کیا ہے، ملاحظہ ہو فتاویٰ ص۱۹۰\۱ زیر تحقیق مسئلہ نمبر ۱۵۳ (انوار الباری ص۱۸۹\۱۱ تا ص۱۹۱\۱۱ میں پوری تفصیل آ چکی ہے) معارف السنن ص۲۹۷\۴ میں دونوں حضرات کے غلط دعاوی کا حوالہ دے کر رد وافر کیا گیا ہے۔ **واللّٰہ یقول الحق وھو یھدی السبیل.** اس تفصیل کے ساتھ حسب تجویز واصطلاح حافظ ابن حجر عسقلانی صاحب فتح الباری ''تیمیین'' کے اس مشہور ومعروف دعوے کو بھی حافظہ میں تازہ رکھئے کہ جس حدیث کو حافظ ابن تمیہ صحیح قرار دیں وہ صحیح ہے اور جس کو وہ کہیں کہ صحیح نہیں ہے تو وہ واقع میں بھی صحیح نہیں ہے۔'' اور اب تو دونوں حضرات نے دعویٰ فرما دیا کہ لفظ ابراہم وآل ابراہیم ایک جگہ ساتھ ہو کر کسی صحیح حدیث میں وارد نہیں ہوا ہے، تو پھر خواہ صحیح بخاری میں بھی کئی جگہ موجود ہوا کرے، سمجھنا یہی چاہئے کہ وہ واقع میں موجود یا صحیح نہیں ہے! والی اللہ المشتکی۔

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ. امین.

تمت